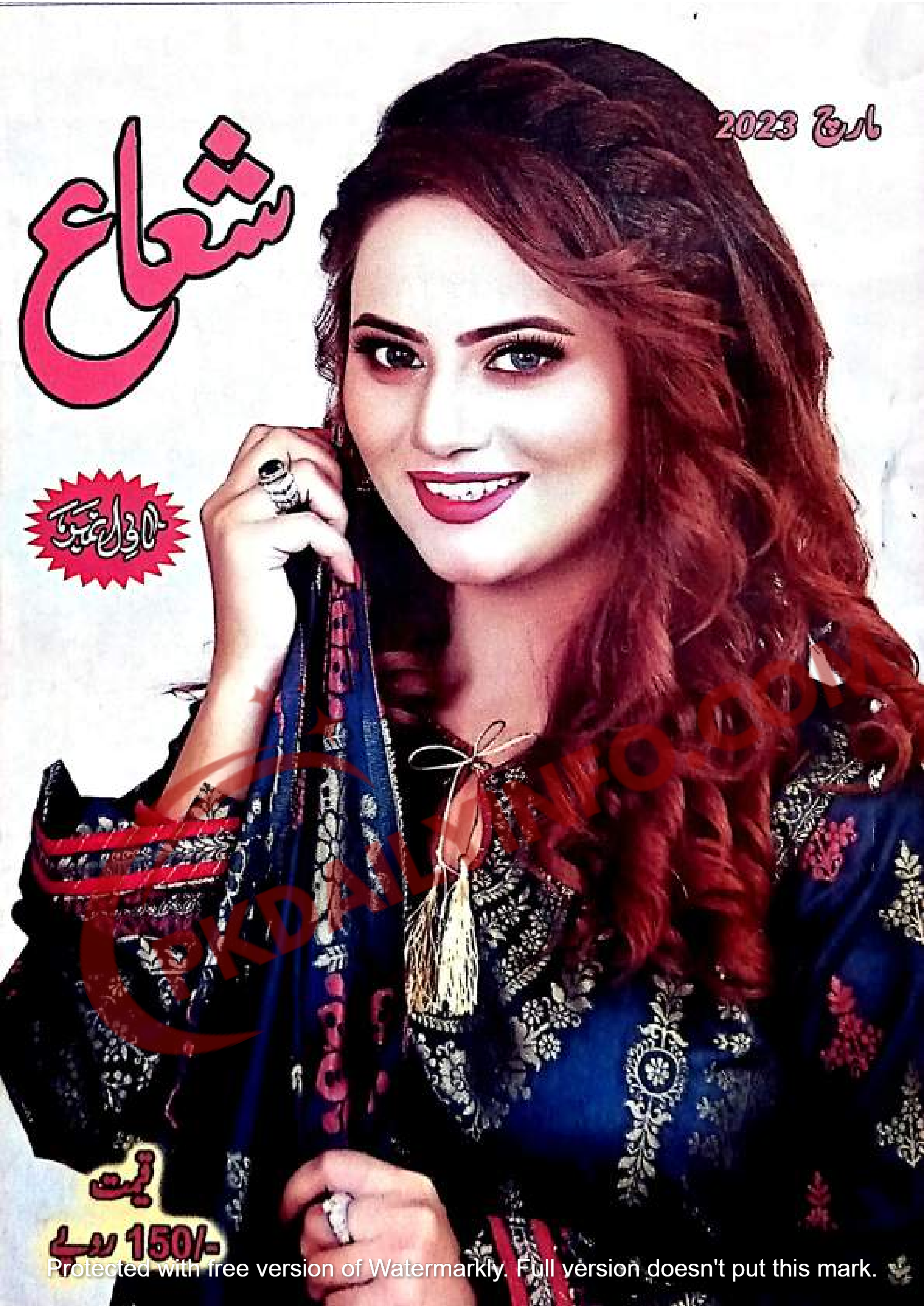

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

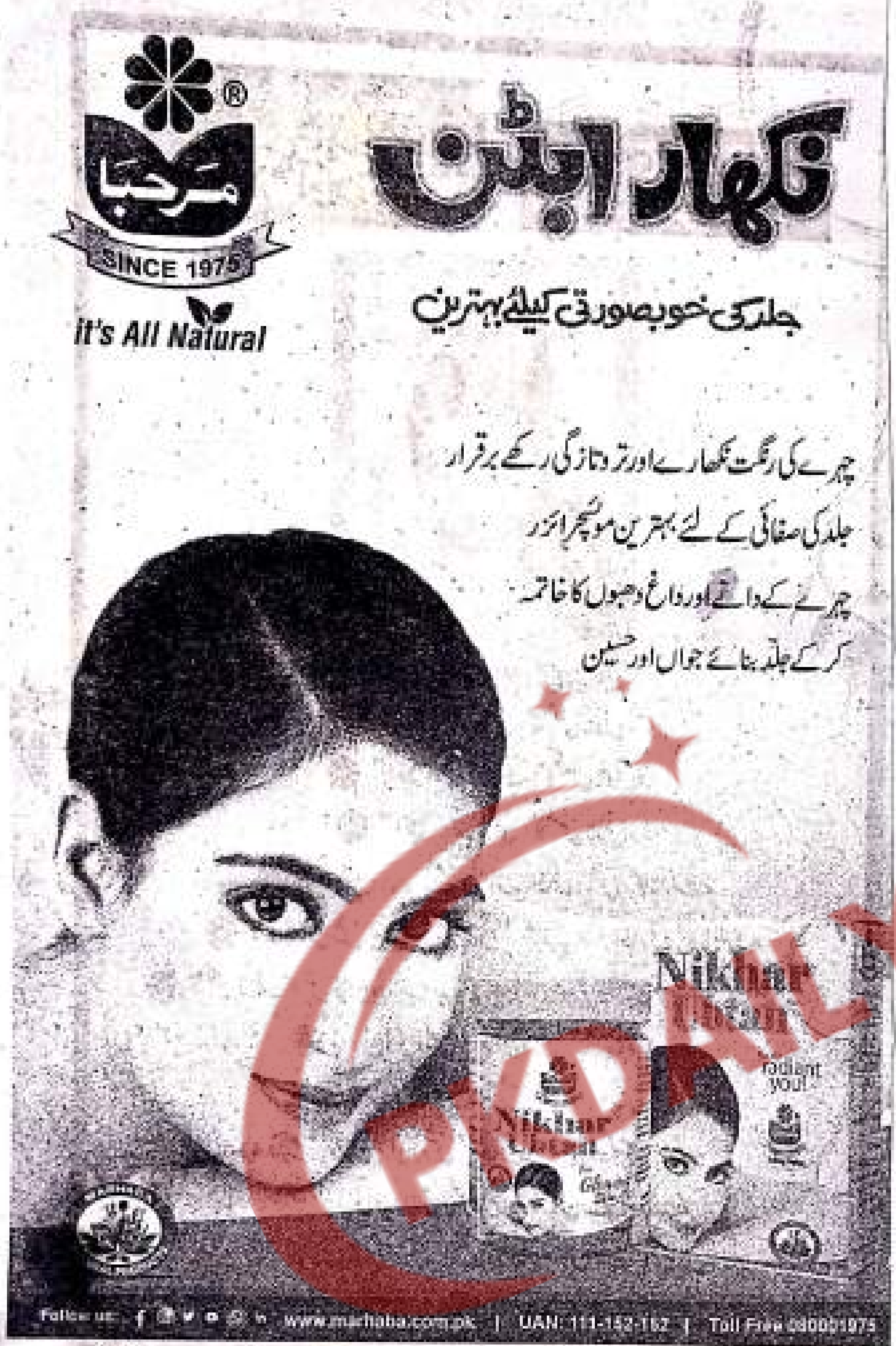

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

خواتین اور دوشیزاؤں کے لیے ایک منفرد ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2023
کے شمارے کی ایک جھلک

- "مالا" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "احد" صوفیہ بٹ کا مکمل ناول،
- "اچھا" صبا زین کا مکمل ناول،
- "منزلوں سے آگے" شازیہ الطاف ہاشمی کا ناولٹ،
- "آنکھوں میں تیرے درد آشنائی" شازیہ جمال طارق کا ناولٹ،
- نظیرہ فاطمہ، سحرش خان، راحیلہ سید، عنبرین اعجاز اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- خاتون ڈی ایس پی لبنیٰ نوانہ سے ملاقات،
- معروف فنکار "اختر حسین" سے باتیں،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور ان کے مشورے،
- ہمارے نام، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2023 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رخسانہ جلیل

مدیرہ منتظمہ — آمنہ ریاض

مدیرہ انچارج — امت الصبور

پبلشر — شاہین رشید

ایڈیٹر — سجاد جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
(ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کنسلٹنٹس)

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 8
حمد، خواجہ عابد نظامی 9
نعت، احمد فراز 9
نبیؐ کی باتیں، ادارہ 10

بندھن، شاہین رشید 18
جب تجھ سے ناتا، ت۔ر 15
دستک، شاہدہ رشید 22
شعاع کے ساتھ، سونیا لطیف 220

افسانے

بھرم، حنا بشریٰ 183
فیصلہ، قرۃ العین سکندر 187
ناشتا، شازیہ الطاف ہاشمی 193
باپ سراں دے تاج، مہتاب زہرا 199
آشیانے کا دکھ، فرحت اشتیاق 196

جھیلیں آئینے اور سائے، نگہت سیما 68
شہر شام ہجر، فرح بخاری 120
ودیعت مژگان، شرو بخاری 154
اسطورہ، آسیہ رئیس خان 90
عشق عاقبت اندیش، میمونہ صدف 34

غزل، امجد اسلام امجد 204
غزل، جون ایلیا 203
نظم، خالد معین 203
غزل، فرحت عباس شاہ 204

مارچ 2023
جلد 38 شمارہ 07
قیمت 150 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ [illegible]

واٹس ایپ
03172266944

خط آپ کے، رضیہ جمیل 29
باتوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 205
کھلا کسی پہ، حریم خان 214
تاریخ کے جھروکے، امت الصبور 223
آئینہ خانے میں، واصفہ سہیل 216
مسکراہٹیں، ادارہ 208
موسم کے پکوان، واصفہ سہیل 218
خوبصورت بنیے، ادارہ 226

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ شعاع، 37۔ اردو بازار، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رضیہ جمال

شعاع مارچ کا شمارہ ناول نمبر لیے حاضر ہیں۔

ابھی موسم سرما قدم جمانے نہ پایا تھا کہ بہار نے دستک دے دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گرمی کی آہٹ بھی سنائی دے رہی ہے۔

دھوپ پھیلاتا سورج، فرحت بخش تازہ ہوا کے جھونکے، تازہ ہرے پتوں کا پیراہن پہنے درختوں کی ٹہنیاں، خوش رنگ پھولوں اور پھلوں سے لدے درخت، سبزے کی چادر اوڑھے زمین اور چھلکتے ... جیسے بہار کے سارے رنگ اسی ایک موسم میں سمٹ آئے ہوں۔

فطرت کے ان مظاہر کا مشاہدہ کریں تو زندگی کا راز سمجھ میں آتا ہے۔ یہ بدلتے موسم فطرت کے حسن ترتیب اور نظم و ضبط کے مظہر ہیں۔ یہ توازن اور ترتیب ذرا سی ادھر ادھر ہو جائے تو زندگی کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ زمین کی ایک معمولی سی جنبش، دریاؤں کا اپنی گزرگاہوں سے انحراف زمین کے باسیوں کی زندگیوں میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔

یہ مظاہر قدرت ہمیں سبق دیتے ہیں کہ زندگی کو نظم و ضبط اور حسن ترتیب کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ خالق سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ اس کی مخلوق کے لیے کون سا راستہ بہتر ہے۔ زمین پر امن اور سکون اسی وقت ہو سکتا ہے جب معبود کے بتائے راستوں پر چلا جائے۔

ہمیں اپنی قارئین بہت عزیز ہیں۔ ہم کسی صورت ان پر اضافی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے لیکن پچھلے چار پانچ سال سے ملک کی معیشت کی جو سنگین صورت حال ہے، اس کی وجہ سے ہر شے کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ کاغذ، پرنٹنگ، آرٹ پیپر، ڈسپیچ سمیت ہر چیز کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ قارئین ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔

اس شمارے میں،

- نگہت سیما کا مکمل ناول - جھلمل آئینے اور سائے،
- نمرہ بخاری کا مکمل ناول - ودیعت جاں،
- فرح بخاری کا مکمل ناول - شام شہر ہجر،
- آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول - اطوار،
- سمیرہ صدف کا مکمل ناول - عشق عاقبت اندیش،
- حنا بشریٰ، قرۃ العین سکندر، شازیہ الطاف ہاشمی، عندلیب زہرا اور فرح اشتیاق کے افسانے،
- شادی مبارک - قانتہ رابعہ کے قلم سے،
- آپ کے پسندیدہ اداکار عاصم محمود کا بندھن، ، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- شعاع کے ساتھ ساتھ - قارئین سے بروئے
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

یارب! غضب کی راہ سے ہر دم بچا مجھے
اپنے کرم سے راستہ سیدھا دکھا مجھے

مجھ کو تو مار ڈالتے شاید یہ حادثات
رحمت نے تیری بڑھ کے دیا حوصلہ مجھے

تو نے تفکرات کی کاٹی ہیں بیڑیاں
تو نے ہی بند غم سے کیا ہے رہا مجھے

میں اس کرم کا شکر کروں کس طرح ادا
تو نے بنایا امتی مصطفیٰ مجھے

دل کا گداز، اشک سحر، عشق مصطفیٰ
جو کچھ ملا ترے ہی کرم سے ملا مجھے

ہوتا رہا کرم ترا مجھ پہ بار بار
بطحا دکھا دیا، کبھی طیبہ دکھا مجھے

ہر کام ہے خدائے دو عالم کے ہاتھ میں
عابد نہیں جہاں میں کسی سے گلہ مجھے

خواجہ عابد نظامی

نعت رسول مقبول

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شب ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور مرے یہاں
دل و دماغ ہیں پر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہم کلام رہا ہے زمین والوں سے

احمد فراز

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ادارہ

نیکی کی باتیں

زیادہ اجر

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک لونڈی آزاد کر دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کی) اجازت نہیں لی۔ چنانچہ جب وہ دن ہوا جو ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کا دن تھا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے) تو انہوں نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ نے محسوس کیا کہ میں نے اپنی لونڈی آزاد کر دی ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”کیا (واقعی) تو نے ایسا کیا ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر تو وہ اپنے ماموؤں کو دے دیتی تو تیرے لیے زیادہ اجر کا باعث ہوتا۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ عورت کو اپنی مملوکہ چیز میں خاوند کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حق حاصل ہے جب کہ خاوند کی زیر ملکیت چیزوں میں اسے یہ حق نہیں۔

2۔ ضرورت مند رشتے دار پر صدقہ کرنا، غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ فضیلت والا عمل ہے کیونکہ آزادی صرف صدقہ ہے جب کہ قرابت دار کو صدقہ دینے میں صدقے کے ثواب کے ساتھ صلح رحمی کا ثواب بھی ملے گا۔

مشرک رشتہ دار

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میری ماں جب کہ وہ ابھی مشرکہ تھیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان ہونے والے معاہدہ حدیبیہ کے دوران) میرے پاس آ گئیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

”میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور مجھ سے حسن سلوک کی خواہش مند ہیں۔ کیا میں (ان کی خواہش کے مطابق) اپنی والدہ سے صلہ رحمی کروں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں، تم اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

یہ مکے سے مدینہ آئی تھیں۔ ان کا نام بعض نے قتیلہ بنت عبدالعزیٰ اور بعض نے قیلہ بیان کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ والدین مشرک و کافر ہوں، تب بھی ان کی خدمت اور ان سے حسن سلوک کرنا ضروری ہے، جیسے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے۔ ”دنیا کے کاموں میں اچھی طرح ان کا ساتھ دینا۔“

دوگنا اجر

حضرت عبداللہ بن مسعود کی اہلیہ سیدہ زینب ثقفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (عورتوں کو) وعظ فرمایا اور (اس میں) فرمایا۔

”اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ کیا کرو، چاہے تمہیں اپنے زیورات ہی میں سے کرنا پڑے۔“

حضرت زینب بیان کرتی ہیں کہ میں (اپنے خاوند) عبداللہ بن مسعود کے پاس لوٹ کر آئی اور ان سے کہا کہ ”تم تھوڑی کمائی کرنے والے آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کی ترغیب دی ہے، تو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ وہ صدقہ (اگر میں تمہیں دے دوں تو) کیا وہ مجھ سے کفایت کر جائے گا، ورنہ پھر میں وہ تمہارے علاوہ کسی اور کو دے دوں۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا۔ ”بلکہ تو خود ہی جا۔“

چنانچہ میں گئی تو وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ایک اور انصاری عورت بھی (کھڑی) تھی۔ میری ضرورت بھی وہی تھی جو اس کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے رعب و دبدبہ عطا کیا گیا تھا (جس کی وجہ سے ہم میں سے کسی کو اندر جانے کی جرات نہ ہوئی) اتنے میں بلال رضی اللہ عنہ باہر نکلے۔ ہم نے ان سے کہا۔

”تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر بتلاؤ کہ دروازے پر دو عورتیں (کھڑی) ہیں اور یہ مسئلہ پوچھتی ہیں کہ اگر وہ اپنے خاوندوں پر اور ان کی گودوں میں زیر پرورش یتیموں پر صدقہ کریں تو کیا وہ (شرعاً) کافی ہو جائے گا؟ (لیکن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مت بتلانا کہ ہم کون ہیں۔“

چنانچہ حضرت بلالؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے گئے اور جا کر آپ سے مسئلہ پوچھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہ دو عورتیں کون (کون) ہیں؟“

حضرت بلال نے کہا۔ ”ایک انصاری عورت ہے اور دوسری زینب۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ”کون سی زینب؟“

انہوں نے کہا۔ ”عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”(انہیں جا کر بتلا دو کہ) ان کے لیے دوگنا اجر ہے، ایک رشتے داری کا اجر اور دوسرا صدقے کا اجر۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ معلوم ہوا کہ عورت اپنے خاوند کو صدقہ اور زکوٰۃ کی رقم بھی دے سکتی ہے، اگر وہ غریب ہو، البتہ خاوند اپنی عورت کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ عورت کے نان و نفقہ کا وہ خود ذمہ دار ہے جب کہ عورت خاوند کی کفیل نہیں۔ گویا اصول یہ ہوا کہ زکوٰۃ دینے والے پر، جس کا نان نفقہ واجب ہے، ان کو وہ زکوٰۃ کی رقم نہیں دے سکتا، جیسے انسان کی بیوی ہے، بچے ہیں اور والدین ہیں۔

2۔ بوقت ضرورت عورت، ستر و حجاب کی پابندی کے ساتھ گھر سے باہر جا سکتی ہے۔

3۔ دینی مسائل و معاملات میں عورتوں کو بھی مردوں کی طرح دلچسپی لینی چاہیے اور اس میں شرم و حجاب مانع نہیں ہونا چاہیے۔

ذمہ اور رشتہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم عنقریب ایسا علاقہ فتح کرو گے جس میں قیراط کا ذکر ہوتا ہے۔“

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اور ایک روایت میں ہے "تم عنقریب مصر فتح کرو گے اور یہ ایسی سرزمین ہے جس میں قیراط کا لفظ عام بولا جاتا ہے۔ چنانچہ تم اس کے باشندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، اس لیے کہ ان کا (ہمارے ساتھ) ذمہ اور رشتہ ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے "جب تم اسے فتح کرلو تو اس کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اس لیے کہ ان کے لیے ذمہ اور رشتہ ہے۔" یا فرمایا "ذمہ اور سسرالی تعلق ہے۔" (مسلم)

علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ ان کا وہ رشتہ جس کا حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، وہ حضرت اسماعیل کی والدہ ہاجرہ علیہ السلام کا ان میں سے ہونا ہے اور سسرالی تعلق کا مطلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کا ان میں سے ہونا ہے۔

فوائد:

1۔ قیراط، دینار و درہم کی طرح ایک سکہ اور ان کا ایک جز تھا۔ دانق، درہم کے چھٹے حصے کو کہا جاتا ہے۔ قیراط، دانق کا نصف ہے۔ مصر میں اس کا استعمال عام اور بول چال میں بھی اس کا چلن تھا۔

2۔ ذمہ، یہاں ذمام (حق و حرمت) کے معنی میں ہے۔ اس میں رحم اور سسرالی تعلق کی بنا پر اہل مصر سے حسن سلوک کی تاکید ہے، اس لیے اسے صلہ رحمی کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

3۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ نے جس طرح پیش گوئی فرمائی، اسی طرح ہی ہوا اور آپ کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد ہی مصر پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

قرابت داری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت (ترجمہ)

"اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرا یئے۔"

نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بلایا۔ چنانچہ ان کے عام و خاص سب جمع ہوگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے بنو عبد شمس! اے بنو کعب بن لوی! اپنے نفسوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب! اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف! اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم! اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے نفس کو آگ سے بچا، اس لیے کہ میں تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے ساتھ (میری) رشتے داری ہے جسے میں (دنیا کی حد تک) ضرور ملحوظ رکھوں گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ معلوم ہوا کہ قیامت والے دن حسب نسب کام نہیں آئے گا حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری بھی نفع نہیں دے گی۔ وہاں صرف ایمان اور عمل صالح کی بنیاد ہی پر نجات ہو گی۔ جن کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صالحین جن کے لیے شفاعت کریں گے، وہ بھی گناہ گار اہل ایمان ہی ہوں گے نہ کہ ایمان و عمل صالح سے محروم کافر و مشرک۔ ان کے لیے نجات ہو گی نہ شفاعت۔

2۔ دعوت و تبلیغ کے اولین مستحق اپنے قریبی رشتے دار ہیں۔ پہلے انہیں اللہ کے احکام پہنچائے جائیں۔

3۔ رشتے دار کافر و مشرک ہوں، تب بھی رشتے داری کے حقوق اور صلہ رحمی کے تقاضے پورے کیے جائیں اور اس کا اولین حق اور اہم تر تقاضہ یہ ہے کہ انہیں ایمانی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی جائے تاکہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار

حضرت ابوعبداللہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانیہ فرماتے ہوئے سنا خفیہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

"بے شک بنی فلاں کی اولاد، میرے دوست نہیں ہیں، میرے دوست تو اللہ اور نیک مومن ہیں، البتہ ان سے میری رشتہ داری ہے جسے میں ضرور ملحوظ رکھتا ہوں۔" (بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں)

فوائد و مسائل:

حدیث میں بنی فلاں کی آل (اولاد) سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ قریبی رشتے دار ہیں جو ایمان نہیں لائے تھے۔ آپ نے وضاحت فرما دی کہ گو ان سے میری قرابت قریبہ ہے لیکن ان سے میری محبت و ولایت (دوستی) نہیں ہے کیونکہ کافر اور مومن کے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی۔ ولایت (دوستی اور محبت) کا یہ تعلق تو صرف اللہ اور اس کے بعد اللہ پر ایمان لانے والے اہل ایمان کے مابین ہی ہو سکتا ہے، البتہ قرابت دار سے (بشرطیکہ وہ محارب نہ ہوں) صلہ رحمی ہو سکتی ہے۔

بہترین عمل

حضرت ابوایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں داخل اور جہنم سے دور کر دے۔" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور صلہ رحمی کرو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حصول جنت اور جہنم سے بچنے کی حرص کا پتا چلتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے خود ساختہ چلوں اور وظائف کا سہارا لینے کے بجائے اہل علم سے حصول جنت کا راستہ پوچھنا چاہیے اور مسلمان کو ہر عمل علی وجہ البصیرت کرنا چاہیے۔

2۔ اس حدیث میں حج اور روزوں کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ارکان اسلام میں سے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ارکان اسلام بیان کرنا مقصود نہیں تھا کیونکہ وہ شخص مسلمان تھا، نیز حج کیونکہ زندگی میں استطاعت کے بعد ایک بار فرض ہے اور روزے بھی سال بعد آتے ہیں، اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا تاکہ سائل کو بات مختصر ہونے کی بنا پر یاد رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ سائل کے حالات و ظروف کے مطابق جواب دیتے تھے جیسا کہ آپ سے ثابت ہے کہ یہی سوال کرنے والے کئی دوسرے افراد کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مختلف جوابات دیے۔

3۔ اس میں ان اعمال کی نشان دہی کر دی گئی ہے جو جنت میں جانے اور جہنم سے نجات پانے کا سبب ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جنت محض آرزوؤں اور تمناؤں سے یا ایمان و عمل کے بغیر کسی سفارش سے نہیں ملے گی۔

والدین کی اطاعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ (لیکن میرے والد) عمر رضی اللہ اسے ناپسند کرتے تھے چنانچہ انہوں نے مجھ سے کہا "اسے طلاق دے دے۔" میں نے انکار کیا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور ان سے اس بات کا ذکر کیا تو

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔
"اسے طلاق دے دے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ اگر والدین کا حکم طلاق، دینی و اخلاقی بنیادوں پر ہو تو اس کی اطاعت ضروری ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ اگر اس کے اسباب کچھ اور ہوں تو پھر والدین کو ادب و احترام سے سمجھایا جائے تاکہ وہ بھی راضی ہو جائیں اور خواہ مخواہ عورت پر بھی ظلم نہ ہو۔

2۔ اولاد اگر نافرمانی کرے تو والدین حاکم وقت سے شکایت کر سکتے ہیں اور حاکم وقت کی بھی ذمہ داری ہے کہ اگر والدین کی شکایت حقیقت پر مبنی ہو تو حکماً اس پر عمل کروائے۔

3۔ اس روایت کے بعض طرق میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر والدین ظلم کریں تو ان کی شکایت بھی حاکم سے کی جا سکتی ہے اور یہ ادب کے منافی یا نافرمانی کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

ماں کا احترام

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور ان سے عرض کیا کہ میری ایک بیوی ہے، میری ماں مجھے اسے طلاق دینے کا حکم دیتی ہے (میں کیا کروں؟)

حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "والدین جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہیں۔ چنانچہ اگر تو چاہے تو اس دروازے کو ضائع کر دے یا اس کی حفاظت کر۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ والد کے لغوی معنی ہیں، جننے والا، اس اعتبار سے اس کا اطلاق ماں اور باپ دونوں پر ہوتا ہے اور جس طرح والدین سے مراد ماں باپ دونوں ہوتے ہیں، والد کا اطلاق بھی دونوں پر ہو جاتا ہے۔

2۔ اس میں بھی بیوی کی محبت پر والدین کی اطاعت و رضامندی کو ترجیح دینے کی تاکید ہے۔

3۔ گھریلو معاملات اگر پیچیدہ ہو جائیں تو کسی صاحب علم اور دانا آدمی سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

4۔ سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اسے طلاق دینے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ معاملہ اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس سے والدہ کو اذیت ہوگی اور وہ ناراض ہو جائے گی تو پھر طلاق دے دے یا پھر کسی اور طریقے سے والدہ کو راضی کر لے۔

بہترین افراد

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ فرما رہے تھے۔
"کیا میں تمہیں بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟"
صحابہؓ نے عرض کیا۔
"کیوں نہیں اللہ کے رسول!"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمہارے بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔"

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ت......ر...... کراچی

س: شادی کب ہوئی؟
ج: میری شادی اگست 2007 میں ہوئی۔
س: شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟
ج: مطالعے کی رسیا تھی، اسلامیات میں ماسٹرز کر رہی تھی تو اسی حساب سے مشاغل اور مصروفیات بھی تھیں۔ چھوٹے موٹے آرٹیکلز اور کالم بھی لکھا کرتی تھی۔ ہر قسم کی کتابیں ہر وقت مطالعہ میں رہا کرتی تھیں۔ باقی مصروفیات گھریلو تھیں۔ مطلب سب امور میں طاق تھی۔
س: اس فیصلے میں مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟
ج: حق ہاہا...... ہماری مرضی تو کیا شامل ہوتی تھی؟ ہم سے تو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ جب ان کا رشتہ آیا تو میں نئی نئی یونی گئی تھی، ماسٹرز کی ڈگری میرا خواب تھی۔ میں کسی صورت اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے سوچا جب مجھ سے ذکر کریں گے والدین تو کم از کم ایک سال کا کہوں گی تاکہ سکون سے تعلیم مکمل کرنے کا موقع مل جائے۔ مگر ہم سے تو کسی نے پوچھا ہی نہیں، صرف اطلاع دی گئی کہ تمہارا رشتہ طے کر دیا گیا۔ الحمدللہ خیر صلا۔ اس کے بعد ہم تھے اور ہماری دعائیں...... کیونکہ سسرال والوں کو شادی کی جلدی تھی۔
س: ذہن میں جیون ساتھی کے حساب سے کوئی تصور؟
ج: ہاں جی تصور تھا اور بڑا خوف ناک تھا...... ہاہاہا۔ اصل میں، میں نے اپنے گھر میں مرد کی شخصیت کے اتنے خوف ناک پہلو دیکھے تھے کہ شادی کے نام سے دل لرزتا تھا۔ جب جیون ساتھی کو سوچتی تو بہت دعائیں مانگتی کہ نیک، رحم دل اور باقی نیچر بہت اچھا ہو، صورت خواہ کیسی ہی ہو میں کمپرومائز کرلوں گی۔ لیکن فطرت و مزاج کا اچھا ہو، میری زندگی برباد نہ ہو اور اللہ کا شکر کہ میری دعائیں قبول ہوئیں، بلکہ میری ماں کی دعائیں۔
س: منگنی کتنا عرصہ رہی؟ فون یا ملاقات؟
ج: منگنی فقط ڈھائی ماہ رہی اور فون یا ملاقات تو کجا میں نے تو ان کو دیکھا ہی شادی کے دن تھا۔ رشتہ ڈالتے ہوئے بھی تصویر نہیں آئی تھی۔ گھر کے بڑے جا کر دیکھ آئے تھے اور بس۔
س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟
ج: خیالات نیک تھے۔ مثلاً میں سوچا کرتی تھی کہ میرا سسرال بہت اچھا ہو، ایسا نہیں جیسے میری ماں کو ملا، پیار محبت کرنے والے، خیال کرنے والے لوگ ہوں، جن کا میں اپنی خدمت اور اخلاق سے دل جیت لوں...... اور الحمدللہ مجھے بہت اچھا سسرال ملا، سوائے چند معاملات کے...... اور میں کہوں گی کہ ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے...... اگر گھر جیسا ماحول ملنے لگے تو سسرال، سسرال کیوں کہلائے۔
س: شادی کے لیے کوئی قربانی دی؟
ج: رخصتی تک تو میں اپنی دانست میں بہت بڑی قربانی دے رہی تھی، آخر کو اپنا خواب ادھورا چھوڑ رہی تھی ایم اے کا، جب والدین کی رضا پہ سر جھکایا اور اپنی خواہش اپنے اندر ہی دفن کر لی تو یہ بہت بڑی قربانی تھی میرے نزدیک۔ لیکن اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے اور اس کے بعد میرے میاں کا، شکریہ کہ انہوں نے میرا خواب پورا کروایا۔ میری خواہش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تم اپنی تعلیم مکمل کرو مجھ سے جو ہو سکا مدد کروں گا۔ میری ساس بھی راضی ہو گئیں۔ بس جس طرح بھی ایم اے کلیئر ہوا اللہ ہی نے کروایا۔ آپ یقین کریں جب میرے پیپرز ہوتے تو میرے میاں میرے ساتھ جاگا کرتے کہ کہیں مجھے نیند نہ آ جائے تیاری کے دوران، ان کے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پاس بائیک ہے لیکن میرے لیے گاڑی ارینج کی تاکہ سہولت سے یونی جاتی رہوں...... تو میری قربانی، قربانی نہ رہی جتنی انہوں نے میرے لیے قربانی دی۔

س: شادی بخیر و خوبی انجام پاگئی تھی؟

ج: الحمد للہ بخیر و خوبی انجام پاگئی۔ بس ہماری طرف کا کھانا کم پڑ گیا تھا (ہی ہی ہی ہی) لیکن میرے سسرال میں مجھے کبھی اس کا طعنہ نہیں دیا گیا۔

س: شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کے کیا کہا؟

ج: مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے بھی مجھے شادی والے دن ہی دیکھا، پہلی بار...... ہے نا حیرت انگیز......؟ بس تو پھر سب کچھ ہی کہنا تھا...... کیا چھوڑنا تھا؟

س: شادی کے بعد کیا کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج: شادی سے پہلے میں کتابی کیڑا تھی، مطالعے کی رسیا، کتابوں کی عاشق! شادی کے فوراً بعد بھی پڑھائی جاری رکھی تو کیسے؟ یہ میں ہی جانتی ہوں...... ہماری ساس اصولوں کی بہت پابند ہیں۔ جو کہہ دیا سو کرنا ہے۔ جس کے ذمہ جو کام ہے وہ وہی کرے گا چاہے مرتا مرجائے۔ شادی کے چوتھے ماہ مجھے اللہ کا حکم ہوا۔ دن بھر بارہ، چودہ الٹیاں بھی کرتی، یونی بھی جاتی، گھر کے وہ سب کام جو میرے ذمے تھے وہ بھی کرتی، پھر یہ بھی فخر کہ تعلیمی ریکارڈ (سابقہ) برقرار رکھتا ہے۔ پیچھے نہیں رہتا۔ یہ سب کچھ کیسے ممکن کیا؟ اللہ ہی جانتا ہے...... شادی کے بعد میں آدم بیزار ہوگئی، چڑچڑی، منہ سڑی (بقول میری بہنوں کے) کلاس میں سوئی رہتی، ٹیچرز پوچھتے رہتے کہ فلاں کی آواز کہاں غائب ہوگئی؟ حاضر بھی ہے یا نہیں؟ ٹیچرز کو میری حالت کا اندازہ تو تھا...... ان کو بھی ترس آجاتا...... (ہائے مظلومہ!!)

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: ولیمے کے بعد جب امی کی طرف رہ کر واپس آئی تو خود ہی بڑھ بڑھ کر کام کرنے لگی، لیکن اتنی سیدھی اور بدھو کہ سب کام کرواتی اور جیٹھانی صاحبہ کمرے سے ہی برآمد نہ ہوتیں۔ تب تشریف لاتیں جب کچن، گھر سب ستھرا ہو چکتا۔ ایک ماہ یہ سب چلا، آخر میری ساس نے تاڑ لیا۔ بتایا ناں بہت اصول پسند ہیں! انہوں نے کام بانٹ دیے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ کچھ سکون ہو گیا۔ پھر میری طبیعت خراب ہو گئی۔ ساتھ ساتھ پڑھائی۔ میری تو جان شکنجے میں آگئی۔ لیکن کرتی پھر بھی میں ہی تھی جو کام بھی اپنے ذمے ہوتے تھے۔ خواہ گھنٹے گھنٹے رات کے دو بجیں یا چار......

س: کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز میں فرق محسوس ہوا؟

ج: فرق ہی فرق تھا۔ ہمارے میکے میں کھانا بہت اہتمام سے بنتا تھا۔ کچھ کمی بیشی ہوتی تو والد صاحب پلیٹ کھینچ مارنے سے بھی نہ چوکتے اور یہاں نہ بھونتا نہ کچھ، ایک ساتھ سب چیزیں پتیلی میں ڈالیں اور چڑھا دیا۔ آخر میں جب ادھ گلی سبزی، ادھ کچا گوشت اور کچے ٹماٹروں کا ذائقہ رہ گیا، ساتھ لبا پانی بھی...... تو بس کھانا تیار!! وہ کھانا کیسے حلق سے اترتا تھا اللہ ہی جانتا ہے۔ میری طبیعت بھی ایسی تھی اس لیے اکثر بھوکی رہتی۔ کھانا بھی لیتی تو نکال آتی۔ اور مزے کی بات پورے دن میں تین ٹائم کے علاوہ کچھ بھی کھانا ممنوع تھا۔

نہ بازار سے کچھ منگوا سکتے تھے۔ نہ ہی شوہر سے اتنے فرینک کہ چھپکے چوری وہ لادیں اور ہم کھالیں۔ (وہ بے چارے بھی اپنی اماں سے ڈرتے تھے) تو پہلا بچہ بڑی مشقتوں، تکلیفوں اور بیماریوں میں آیا۔ میں نے اس کی وقفہ آتی بھوک کی کہ جب کیس ہوا تو میں کبڑی ہوگئی۔ کمزوری کے مارے سیدھی ہی نہ ہو سکی اور دس تکلیفیں جان کو لگ گئیں۔ ڈاکٹرز بھی یہی کہتے کہ آپ غذا سے اور کرلو...... لیکن!! ہا...... دودھ کی شکل دیکھنا ممنوع، غذا وہی روٹین کی سبزی دال جو سب کھائیں، گھر کا کھانا ممنوع اور تو اور بچے کے لیے دودھ نہ اترے تو اس میں بھی غذا کا کوئی مسئلہ نہیں یہ تو خدائی مہر ہے جاری ہی رہنی چاہیے......!

س: میکے اور سسرال کے ماحول میں فرق؟

ج: بظاہر دونوں گھرانے ایک جیسے تھے۔ متوسط، پڑھے لکھے، اچھی سوچ رکھنے والے...... بلکہ میں تو کہوں گی کہ کچھ معاملات میں میرا سسرال میرے میکے سے اچھا تھا۔ جیسے مردوں کی نرم مزاجی، معاملہ داری وغیرہ۔

س: سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

ج: ایک عرصے تک جب ہر چیز سہ لی، ہر معاملے میں خاموشی اور صبر اختیار کیا جو کھلایا کھالیا، جو پہنایا پہن لیا۔ جو کہا سن لیا اور جیسے رکھا رہ لیے تو ساس کو یقین آہی گیا کہ اب یہ ہمارے ماحول میں ڈھل گئی۔ اس کی "تربیت" ہوگئی۔ پہلے ہر چیز پہ اعتراض، شکایات ہوتی تھی۔ اب یہ ہوتا ہے جیسے مرضی کرلو، بقول ہماری ساس وہ ہماری "ٹریننگ" کا دور تھا۔ اب وہ ہم سے مطمئن ہیں۔ اب ہر معاملے میں آگے رکھا جاتا ہے مشورہ لیا جاتا ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ واہ انہوں نے تو کچھ جھکتی ہی نہیں سسرال میں......

پہلے تو نہ تین میں تھے نہ تیرہ میں...... یوں لگتا کام والی ماسی ہے جسے تن ڈھانپنے کو سال کے دو جوڑے اور رہنے کو کمرہ دیا ہوا ہے۔ نہ تکلیف پہ دو بول پیار کے نہ آرام کا خیال...... میں یہ نہیں کہتی کہ بہو بیمار ہو تو اس کے سب کام خود کرو، وہ کچھ نہ کرے بلکہ تسلی والا سا اور دو بول پیار کے بول دیے جائیں تو اس کی آدھی بیماری ختم ہو جائے۔ ساسیں تو یہ بھی نہیں کرتیں کہ ایسا نہ ہو بہو اپنے کو بیمار سمجھ کے سب کام ہاتھ سے چھوڑ کے بیٹھ جائے......! چلو کچھ بہوئیں ایسا بھی کرتی ہوں گی (جیسا کہ ناولز میں پڑھتے رہتے ہیں) لیکن ایک عرصہ کسی کے ساتھ رہ کے اتنا مزاج تو پتا چل ہی جاتا ہے ناں!!

یہاں میں یہ کہوں گی کہ ساسیں بے شک اپنے ارمان نکال لیتی ہیں ابتدائی سالوں میں بہو کو سیدھا رکھنے کے، لیکن جب بعد میں وہ سب کچھ ان کے حوالے کرتی ہیں تو یہ بہوؤں کے لیے کوئی خوشی کا مقام نہیں ہوتا...... بہو کے لیے ساس کو وہ مقام دینا کہ جس میں اسے ماں کے درجے پہ رکھ سکیں۔ بہت مشکل ہوتا ہے۔ گو ظاہری ہو، مگر دل سے ہرگز نہیں ہوتا، کیونکہ اپنے گزشتہ طرز عمل کی وجہ سے وہ اپنا مقام کھو چکی ہوتی ہیں۔ جب آپ کی سلطنت تھی تو بہو پیر کی جوتی تھی۔ جب معزول ہوئے تو اب یہی پیر کی جوتی سر کا تاج ہے۔ کیسے؟ واہ!!

س: آپ جوائنٹ فیملی میں رہنا پسند کرتی ہیں یا سنگل؟

ج: جوائنٹ فیملی میں انسان ضرور رہے۔ اگر سب ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں۔ صرف اپنے حقوق ہی نہیں فرائض بھی ملحوظ نظر رکھیں تو جوائنٹ فیملی سسٹم ایک نعمت سے کم نہیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر الگ رہیں۔ لیکن اس میں بھی اپنے شوہر کو اس کے ماں باپ سے کاٹیں نہیں، اسے ان کی پوری خدمت کا موقع دیں۔ خواہ آپ نظرانداز ہو جائیں۔ (کیونکہ جوائنٹ میں رہ کے بھی تو یہی ہونا ہے تو الگ رہنا بہتر ہے)

س: آپ نے ماحول کو بہتر بنانے کی کیا کوششیں کیں؟

ج: صبر، صبر اور صرف صبر...... میں یہی کر سکتی تھی اور میں نے یہی کیا۔ دوسری چیز دعائیں، تیسری چیز خدمت، ظاہری طور پہ صبر اور خدمت (زبان بندی) کے ساتھ لگی رہی۔ اندر اندر دعائیں کرتی رہی۔ آخر اللہ پاک نے بہتری کی صورت پیدا فرمادی۔ اب ساس کو مجھ پہ اعتماد ہے۔ میں ان کی پسندیدہ بہو ہوں اور صرف میں نہیں ہر وہ لڑکی جو اپنے سسرال کے ماحول کی بہتری چاہے اسے ان ہی ہتھیاروں سے لیس ہونا پڑے گا۔

آخر میں پھر میں یہی کہوں گی کہ الحمدللہ مجھے ایسا کوئی خوفناک قسم کا سسرال نہیں ملا، اور جو کچھ تھوڑا سب چلتا ہے میرا سسرال اس اعتبار سے اچھا رہا کہ گھریلو سیاست، شوہر کے کان بھرنا، مار دھاڑ، گالم گلوچ سے پاک ماحول ملا، اور دل کے جب یہ قصے پڑھتی ہوں تو رب کا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں صرف کچھ سختی والا ماحول رہا اور اب وہ بھی نہیں، سوالحمدللہ۔

☆☆

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بندھن

عاصم محمود ہمراہ ملیحہ محمود

شاہین رشید

عاصم محمود ایک بہت ہی اچھے فنکار ہیں۔ آپ سب انہیں روزانہ کسی نہ کسی ڈرامے میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک سیریل "تقدیر" ختم ہوا ہے جس میں انہوں نے ایک اچھے بیٹے، بھائی اور شوہر کا کردار ادا کیا ہے۔ اپنی حقیقی زندگی میں یہ کیسے ہیں، اس کے لیے ہم نے ان کی مسز کے ساتھ اپنا مقبول سلسلہ "بندھن" کیا ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"الحمد للہ۔"

"تقدیر، میں آپ ایک اچھے شوہر، اچھے بیٹے اور ایک اچھے بھائی دکھائے گئے ہیں۔ اصل زندگی میں آپ کیسے ہیں؟"

"اصل زندگی میں کیسا ہوں۔ یہ میں خود تو نہیں بتا سکتا کہ میں کیسا ہوں۔ لیکن میری حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے ...... اور اگر باپ کے حوالے سے میرے بارے میں جاننا چاہتی ہیں تو میری بیٹی بتا سکتی ہے لیکن ابھی وہ چھوٹی ہے۔

شوہر کے حوالے سے بیوی بتا سکتی ہے۔ بیٹے کے حوالے سے میرے ماں باپ بتا سکتے ہیں۔ میں اپنی تعریف تو نہیں کروں گا لیکن میں کافی حد تک اس کردار جیسا ہی ہوں جو ڈرامہ سیریل تقدیر میں میں نے کیا ہے۔"

"شکریہ ...... اور آج کل کیا ہو رہا ہے۔ کیا آن ایئر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"آج کل فیلڈ کے حوالے سے اچھا خاصا مصروف ہوں۔ ابھی حال ہی میں ڈرامہ سیریل "تقدیر" اختتام پذیر ہوا ہے اور اس سیریل میں میرا کردار پوزیٹو تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اور آنے والے پروجیکٹس میں سے زیادہ ترجو ہے آن ایئر ہوں گے۔

ایک کی شوٹس مکمل ہو چکی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ عید کے بعد آئے گا کیونکہ وہ ہارر (ڈراؤنی) سیریل ہے۔ ایک سیریل "پیاری لمو" کے نام سے وہ بھی تقریباً مکمل ہے اور آج کل جو ہٹ سیریل جا رہا ہے "تیرے بن" اس میں تو آپ مجھے دیکھ ہی رہی ہوں گی بہت ہی شاندار، جاندار کردار ہے میرا۔ اور اسے پرفارم کر کے مجھے بہت زیادہ مزہ آیا۔ باقی دیگر چھوٹے موٹے بھی کچھ پروجیکٹس ہیں جن پر کام ہو رہا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ اب آتے ہیں سلسلہ "بندھن" کی طرف۔ پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ کا اور آپ کی بیگم کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟"

"میرا نام جیسا کہ سب کو معلوم ہے عاصم محمود ہے۔ میرا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور تعلیمی قابلیت "ایم پی اے" ہے اور ایک ڈگری ہوتی ہے "اے پی اے" اس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں APA سے مراد Associate Public Accounted ہے جبکہ بیگم گریجویٹ ہیں۔ ان کا تعلق لاہور سے ہے وہ میری فرسٹ کزن ہیں یعنی چچا کی بیٹی ہیں۔"

"شادی کو کتنے سال ہو گئے اور بچے ماشاء اللہ کتنے ہیں۔ بیگم سے لو میرج ہے؟"

"شادی کو الحمد للہ گیارہ سال ہونے والے ہیں۔ میری بیگم کا نام ملیحہ ہے اور میرے دو بچے ہیں۔ فروری میں پورے گیارہ سال ہو جائیں گے۔ اور ہماری ارینج میرج ہے جیسا کہ میں نے بتایا بیگم چچا کی بیٹی ہیں ...... اور جب شادی ہو جاتی ہے تو پھر Love بھی ہو ہی جاتا ہے۔ اور میری بیگم ایک سو فیصد ہاؤس وائف ہیں لیکن پارٹ ٹائم وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ آن لائن بھی اور ویسے بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ پریکٹیکل ہاؤس وائف ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

"جیسے شادیاں ہوتی ہیں ویسے ہی ہوئی تھی۔ نہ بہت دھوم دھام سے اور نہ ہی بہت زیادہ سادگی سے ...... دھوم دھام سے مراد یہ کہ بہت دنوں تک نہیں چلی تھی کہ آج یہ فنکشن ہے تو کل یہ فنکشن ہے کیونکہ فاصلے بہت تھے، ہم سیالکوٹ میں رہتے تھے وہ لاہور میں۔ جانا اور پھر واپس آنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ تو بس روایتی رسمیں ہوئی تھیں جیسے مایوں مہندی وغیرہ ...... نکاح اور پھر ولیمہ ...... لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ ذاتی طور پر مجھے یہ رسم و رواج پسند نہیں ہیں۔ بس نکاح ہو مسجد میں پھر رخصتی اور دوسرے دن ولیمہ ...... اس سے زیادہ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ لڑکی والوں پر کم سے کم بوجھ ڈالنا چاہیے بلکہ ڈالنا ہی نہیں چاہیے۔ سب کچھ لڑکے والوں کو ہی کرنا چاہیے۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور ملاقات یا فون پر بات ہوتی تھی؟ اور شادی سے پہلے کوئی خوش گوار یا ناخوش گوار واقعہ پیش آیا؟"

"منگنی کے بارے میں بتانے سے پہلے میں آپ کو شادی سے پہلے ناخوش گوار واقعے کے بارے میں بتاتا ہوں۔ میرے کزن جو میرے برادران لاء بھی تھے ان کا اچانک دبئی میں انتقال ہو گیا۔ ابھی ہمارا رشتہ ہوا ہی تھا کہ یہ ناخوش گوار سانحہ ہو گیا، یہ ہمارے خاندان کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا ...... آپ کو بتاؤں کہ ہماری ابھی اتنی عمر نہیں تھی کہ شادی ہو جائے۔ مگر اس واقعے کے بعد یہ طے پایا کہ شادی جلدی کر دیں۔ میرے کزن جن کا نام محمد رضا تھا، مجھ سے دو سال ہی بڑے تھے۔

اب آتے ہیں منگنی کی طرف تو آپ کو بتاؤں کہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی بس رشتہ ہی طے ہوا تھا اور کزن کے انتقال کی وجہ سے شادی جلدی ہو گئی۔ تو

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رشتہ صرف چھ ماہ رہا اور پھر شادی ہو گئی۔ اور ان چھ ماہ کے عرصے کے دوران ملاقات تو بہت ہی کم ہوئی تھی کیونکہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں آنا جانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ اور فون پر بھی بات نہیں ہوتی تھی۔

ایک بار کوشش کی تو چچا کو پتا چل گیا تو انہوں نے منع کر دیا کہ فون پر بھی بات نہیں کرنی۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ شادی سے پہلے فون پر بات کرنے سے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔۔۔ رشتے بگڑ جاتے ہیں۔ حالانکہ میرا کہنا ہے کہ شادی سے پہلے اگر بات چیت ہو جائے مختصر سے تو ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور پھر آپ یہ بھی ڈیسائیڈ کر سکتے ہیں کہ یہ میرے مزاج کی نہیں ہے یا میرے مزاج کا نہیں ہے تو کچھ اور فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ بڑوں کی اپنی ایک سوچ ہوتی ہے۔ تو نہ بات ہوئی تھی نہ ملاقات ـــ بہ حیثیت کزن کے بھی ہیلو ہائے نہیں ہوتی تھی۔"

"سسرال تو آپ کے چچا کا گھر تھا مگر پھر بھی سسرال سے تعلقات کیسے رہے؟"

"وہ میرے چچا کا گھر ہے اور اس کو میں نے کبھی سسرال کی نظر سے دیکھا ہی نہیں ہے، مجھے لگتا ہی نہیں کہ یہ میرے سسر ہیں اور یہ میری ساس ہیں۔ جیسے ہم بچپن میں سب بڑے چھوٹوں سے بات کرتے تھے ابھی بھی ویسے ہی کرتے ہیں۔ میرے اندر تو کوئی تبدیلی نہیں آئی سوائے اس کے کہ وہ مزید میرے لیے قابل احترام ہو گئے ہیں۔ کیونکہ میرا ان سے اب ڈبل رشتہ ہے۔ سالی، سالا صاحب سے ویسا ہی ہنسی مذاق ہوتا ہے جیسے پہلے ہوتا تھا۔"

"بیگم مزاج کی کیسی ہیں۔ آپ انہیں پیار سے کیا پکارتے ہیں اور بچوں کے بارے میں بھی بتائیں کہ وہ سسرال جا کر یعنی اپنے ننھیال جا کر خوش ہوتے ہیں؟"

"جی جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میری بیگم کا نام علیمہ ہے اور پیار سے چندا کہتے ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں میری، بڑی کا نام "جنت" ہے اور چھوٹی کا نام السا (ILSA) ہے۔ وہ اپنے ننھیال جا کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ بیگم مزاج کی اچھی ہیں۔ نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ اور مختصر بہت زیادہ ہیں۔ گھر داری میں ماہر ہیں کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں اور ان کی سب سے اچھی بات جس پر مجھے بڑا فخر ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی تربیت بہت اچھے انداز میں کرتی ہیں۔ بہت خیال رکھتی ہیں۔"

"روایتی بیگم کی طرح آپ کے سارے کام بیگم ہی کرتی ہیں؟ جوائنٹ فیملی ہے؟"

"آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں اپنے کام اپنی بیگم سے نہیں کرواتا۔ مجھے بچپن سے ہی اپنے کام خود کرنے کی عادت ہے اور ابھی بھی یہ عادت برقرار ہے۔ کپڑے خود ہی استری کرتا ہوں۔ جوتوں کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ وہ خود اٹھا کر سلیقے سے ادھر ادھر رکھ دیں، یہ اور بات ہے ورنہ میں کبھی نہیں کہتا۔ میں اپنا کوئی کام ان سے نہیں کرواتا۔ کیونکہ ان پر گھر کی دیگر ذمہ داریاں ہوتی ہیں تو میں ان کو تنگ نہیں کرتا نہ ہی گلہ شکوہ کرتا ہوں۔ اور کھانا نہ صرف بیگم بہت اچھا پکاتی ہیں بلکہ میں خود بھی پکا لیتا ہوں۔ بیگم "تمہاری منڈی۔ ہائے" بہت اچھے بناتی ہیں۔

شروع شروع میں تو جوائنٹ فیملی تھی کیونکہ میں کام کی وجہ سے کراچی میں اکیلا رہتا تھا۔ مگر جیسے جیسے کام بڑھتا گیا، سوچا کہ فیملی کو بھی بلا لوں تو اب تقریباً ڈھائی تین سال سے فیملی کے ساتھ کراچی میں آ گیا ہوں اور امی ابو چھوٹے بھائی کے ساتھ سیالکوٹ میں رہتے ہیں۔"

"شادی کیا دھاگا ہے۔ اختلافات، علیحدگی، طلاق یہ سب کی وجہ کون ہوتا ہے؟"

"میرا نہیں خیال کہ کوئی تیسرا ہاتھ ہوتا ہے اس بگاڑ میں کیونکہ اگر آپ سمجھ دار ہیں تو آپ کے درمیان کوئی پھوٹ نہیں ڈلوا سکتا...... اور اگر کوئی ڈلوانا چاہتا ہے اور آپ کی بیگم سمجھ دار ہے یا آپ کی بیگم کے خلاف کوئی بات کرے اور آپ عقل مند ہیں تو کچھ نہیں ہو گا لیکن آپ دونوں خود ہی کانوں کے کچے ہیں تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اگر آپ میں برداشت ہی نہیں ہے اور معاف کرنے کی بھی عادت نہیں تو پھر اللہ ہی مالک ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے اور اختلاف رائے ہوتا ہے لہٰذا دونوں کو اپنے اندر نرم گوشہ رکھنا چاہیے۔ خود ہی کے جھگڑے طلاق کی وجہ بنتے ہیں۔"

"بیگم آپ کے ڈرامے پسند کرتی ہیں۔ آپ کی اداکاری کو سراہتی ہیں؟"

"جی ...... جی میرے ڈراموں کو، میری اداکاری کو پسند کرتی ہیں مگر تنقید بھی کرتی ہیں۔ مگر زیادہ تر تعریف ہی کرتی ہیں اور ان کو ذرا بھی شوق نہیں ہے اداکاری کا ...... اس لیے دور دور تک کوئی ارادہ نہیں ہے اس فیلڈ میں آنے کا ...... ویسے میری بیگم اس حوالے سے شرمیلی بھی بہت ہیں۔"

"اور اب بیگم عاصم محمود سے کچھ سوالات"

"کیسے مزاج ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ دونوں کزن ہیں۔ تو سسرال کے ماحول میں اور اپنے گھر کے ماحول میں زیادہ فرق تو نہیں محسوس ہوا ہو گا؟"

"جی بالکل زیادہ فرق نہیں لگا ماحول میں کہ ہم دونوں کزن ہیں اور ہمارا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا ہے تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ نہ ہی کھانے پینے میں نہ ہی کھانا پکانے میں اور چونکہ ہم دونوں کی دادی بھی ایک ہی تھیں تو عاصم کی امی کو بھی کھانا پکانا دادی نے سکھایا تھا اور میری امی کو بھی انہوں نے ہی سکھایا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دونوں کی ماؤں کو کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ لیکن دادی نے اپنے طریقے سے اپنی بہوؤں کو کھانا پکانا سکھایا۔"

"عاصم مزاج کے کیسے ہیں اور داماد کیسے ہیں؟"

"عاصم نرم مزاج تو ہیں مگر غصے کے تیز بھی ہیں۔ اور داماد بھی بس ٹھیک ہی ہیں۔ اور ہاں ان کے لیے کھانا میں پکاتی ہوں۔ مجھے ان کے لیے کھانا پکانا اچھا لگتا ہے اور ہاں یہ انہوں نے سچ کہا۔ یہ اپنے کام خود ہی کرتے ہیں۔ میں نہیں کرتی۔"

"بچوں کی تربیت میں آپ کا ہاتھ زیادہ ہے یا عاصم کا؟"

"بچوں کی تربیت میں صرف اور صرف میرا ہاتھ ہے۔ ان کا نہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ بالکل بھی توجہ نہیں دیتے۔ توجہ تو یہ بھی دیتے ہیں مگر بچے میرے قریب زیادہ ہیں اور ڈرتے بھی مجھ ہی سے ہیں۔

یہ سپورٹنگ ایکٹرز کا کردار ادا کرتے ہیں جب میں بچوں کو ڈانٹ رہی ہوتی ہوں اور یہ اچھی بات بھی ہے، کہ ایک نرم اور ایک کو گرم ہونا چاہیے اور ویسے بھی یہ ایک رعب دار باپ ہیں یہ۔ بچوں کو پتا ہے کہ غلطی کی تو بابا کی ڈانٹ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

"مشہور بندے سے شادی کر کے فائدہ ہوا یا نقصان؟"

"جب ہماری شادی ہوئی، یہ مشہور نہیں تھے۔ اب کافی فیمس ہو گئے ہیں۔ اور مزے کی بات بتاؤں کہ جب ہم مل کر کہیں جاتے ہیں تو ان سے زیادہ لوگ مجھے دیکھتے ہیں کہ اچھا یہ ان کی بیگم ہیں۔ تو کئی بار عجیب سا بھی محسوس ہوتا ہے اور کئی بار میں اس چیز کو انجوائے بھی کرتی ہوں۔"

"جوائنٹ فیملی بہتر رہتی ہے یا ...... علیحدہ؟ منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

"پہلے ہم جوائنٹ فیملی میں ہی رہتے تھے جیسا کہ عاصم نے آپ کو بتایا ہو گا۔ گیارہ سال ہم جوائنٹ فیملی میں رہے۔ سوری آٹھ، نو سال رہے جوائنٹ فیملی میں منہ دکھائی میں "رنگ" دی اور ہنی مون منانے کے لیے ناران اور پیاز میں گئے تھے۔"

"ان کی طرف سے جہیز یا کسی بھی چیز کی ڈیمانڈ تھی؟"

"نہیں نہیں ...... ان کی طرف سے کسی بھی قسم کی کوئی ڈیمانڈ نہیں تھی۔ کیونکہ ہمارا ایک ہی خاندان ہے۔"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دستک، دستک، دستکیں

شاہین رشید

انور مقصود

"السلام علیکم۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"
"الحمد للہ۔"

"بہت زمانہ ہو گیا آپ سے بات کیے، آپ سے ملاقات کیے، آپ ٹھیک ہیں نا؟"
"جی جی..... بالکل ٹھیک ٹھاک۔"
"شکر الحمد للہ۔ ویسے آپ کی خیریت میں عمرانہ صاحبہ سے پوچھتی رہتی ہوں اور پھر آپ کے فیس بک اکاؤنٹ سے آپ کی پوسٹ سے بھی خیریت ملتی رہتی ہے۔ ویسے اصل اکاؤنٹ آپ کا کون سا والا ہے؟"

"عمرانہ سے جو خیریت ملتی ہے، وہ ٹھیک ہے۔ باقی آپ کو بھی بتاؤں اور کئی دوسرے لوگوں کو میں بتا بھی چکا ہوں کہ میرے پاس نہ لیپ ٹاپ ہے نہ اسمارٹ فون ہے اور نہ ہی میں انٹرنیٹ استعمال کرتا ہوں..... تو میرا کوئی فیس بک اکاؤنٹ نہیں ہے۔ میرے نام سے گیارہ یا شاید بارہ جعلی اکاؤنٹ ہیں۔"
"آپ کچھ کہتے نہیں؟"
"کسے.....؟ کون سنتا ہے۔"
"خیر..... آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"میرا ایک ہی شوق ہے مصوری کرنا۔ وہی کرتا ہوں اور مجھے یاد ہے کہ میرے شاہکاروں کی پہلی نمائش 1955ء میں ہوئی تھی۔ اور گھر کے اخراجات مصوری سے ہی پورے ہوتے تھے۔"
"عمرانہ بتا رہی تھیں کہ آپ بہت شدید قسم کے کووڈ کا شکار ہوئے تھے؟"
"ہاں بالکل، سترہ اٹھارہ دن آکسیجن لگی رہی تھی۔ تقریباً تین ماہ کمرے میں ہی قید رہا۔ کمزوری بہت ہو گئی۔ مگر پھر بھی نہ پینٹنگ چھوڑی اور نہ ہی پڑھنا لکھنا چھوڑا۔ بس شکر کہ برے دن بھی خیر خیریت کے ساتھ گزر گئے۔"
"انور مقصود صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میرا اصل ایوارڈ میرے چاہنے والے اور مجھے پڑھنے والے ہیں اور تمغوں کی بات کریں تو وہ اتنے ہیں کہ مجھے ان کی تعداد یاد ہی نہیں۔ ہاں حکومت پاکستان سے مجھے جو ایوارڈ ملے ان کی بات کچھ اور ہے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ حسن کارکردگی۔ ہلال امتیاز اور قائداعظم گولڈ میڈل مل چکے ہیں۔"
"آپ نے ایک بار کہا تھا کہ آپ کھانا بہت اچھا پکا لیتے ہیں۔ روٹی بہت اچھی بنا لیتے ہیں۔ تو آپ

"جی..... جی بالکل، میں بہت اچھا کھانا پکاتا ہوں اور روٹی بھی..... کھانا پکانا میرا بہترین شعبہ بھی ہے اور مشغلہ بھی..... اپنے لیے، بیوی کے لیے بچوں کے لیے اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے لیے سب کے لیے کھانا پکانا مجھے اچھا لگتا ہے اور سب کو ہی میرے ہاتھ کا پکا کھانا بہت پسند ہے۔ اور ایسا آج نہیں، میں بہت زمانے سے کر رہا ہوں۔ بس موڈ کی بات ہے۔"
"کیا کوکنگ باقاعدہ سیکھی ہے آپ نے؟"
"نہیں نہیں..... میں نے تو جو کچھ سیکھا ہے بیجیا سے سیکھا ہے نہ صرف کھانا پکانا بلکہ ہر چیز..... میں جو کچھ ہوں، ان کی ہی بدولت ہوں۔"
"گزرے دور میں جب کوئی ڈرامہ آن ایئر ہوتا تھا تو پہلے رائیٹر کا نام دیکھا جاتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟"
"اس لیے کہ آج کل ڈرامے وہ لکھ رہی ہیں جو ڈرامارائٹر نہیں ہیں تو ڈرامہ بھی اسی طرح کا ہی ہوگا۔ کئی کئی اقساط پر مشتمل ہوتے ہیں سیریل۔ کہانیاں عجیب، مکالمے بڑے بڑے۔ گھر کے ملازمین بھی فلسفہ بول رہے ہوتے ہیں۔"
"ہوں..... آپ کو اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں بہترین کون سا ڈرامہ لگتا ہے؟"
"آنگن ٹیڑھا..... مجھے آج تک بہت پسند ہے۔"
"آپ جس تحمل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ بات کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کو غصہ نہیں آتا..... ایسا ہی ہے؟"
"ہاں۔ سچ میں مجھے غصہ نہیں آتا۔ میں بہت نرم مزاج ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، مجھے تو کبھی کبھار بھی غصہ نہیں آتا۔"
"گھر والوں کو آپ سے کیا شکوہ رہتا ہے؟"
"یہی کہ میں بتائے بغیر گھر سے نکل جاتا ہوں۔ جس کی وجہ سے گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔"

"تنقید کرنے والوں کے لیے کیا کہیں گے؟"
"تنقید کرنے والوں کو میں صرف یہ کہوں گا کہ آپ تنقید کریں لیکن پہلے اپنے آپ کو اس شعبے میں منوائیں جس پر آپ تنقید کر رہے ہیں۔ جب آپ نے اس شعبے میں کام ہی نہیں کیا تو آپ تنقید کیسے کر سکتے ہیں۔"
"فیصلہ کس کی مرضی سے کرتے ہیں یا کس سے مشورہ لیتے ہیں۔ گھر والوں سے، اپنے دل سے یا دماغ سے؟"
"میں تو اپنے دماغ سے مشورہ بھی لیتا ہوں اور سنتا بھی اسی کی ہوں۔ دل کا تو ویسے ہی بائی پاس ہو چکا ہے۔"
"بس آپ کے یہی جملے مزا دے جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور بہت بڑی عمر عطا کرے صحت کے ساتھ۔ پہلے تو آپ خود سالگرہ کا اہتمام کرتے ہوں گے۔ اب یقیناً بچے اور ان کے بچے کرتے ہوں گے۔ ایسا ہی ہے نا؟"
"اپنی تو دور کی بات ہے میں نے تو کبھی اپنے بچوں کی سالگرہ نہیں منائی۔ لیکن اب بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ سمجھدار ہو گئے ہیں تو اس طرح کا اہتمام کر لیتے ہیں اور کیک وغیرہ کاٹ لیتے ہیں۔"
"نوجوان نسل کے لیے اور 8 مارچ خواتین کا عالمی دن ہے۔ کچھ کہنا چاہیں گے؟"
"نئی نسل کے لیے تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہمیشہ سچ بولیں کیونکہ سچ بول کر انسان بھول بھی جائے تو جب بھی پوچھیں گے، وہ وہی بتائے گا جو سچ ہوگا جبکہ جھوٹ کو ساری زندگی یاد رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے سچ کو زندگی کا اصول بنالیں ہمیشہ سکھی رہیں گے۔ نہ جھوٹ بولیں نہ جھوٹ لکھیں۔
اور 8 مارچ کے لیے یہ کہ پاکستان اگر ترقی کر رہا ہے تو صرف خواتین کی وجہ سے..... مردوں نے تو خود کو بے کار ہی ثابت کر دیا ہے۔"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شادی مبارک ہو

زروہ تحریم ہمراہ عمر شعیب

فائزہ رابعہ

یاد ش بخیر، آپ کو یاد ہی ہوگا جنوری 2020 کی سات بروز سوموار اور تیرہ بروز سوموار ہماری صاحبزادیوں حرمت فاطمہ اور محسنہ مریم کی شادی خانہ آبادی کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ جس کی روداد میں نے اگلے ماہ کے ڈائجسٹ میں دی تھی اور بہت سے قارئین نے پسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ اب تک گاہے بگاہے اس کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔

تین بیٹیوں کی شادی کے بعد ہمارے پاس چھوٹا اور چھوٹی ہی تھے چھوٹے کا نام محمد داؤد عبداللہ اور چھوٹی کا زروہ تحریم ہے جو کہ مقامی کالج میں کیمسٹری بی ایس آنرز کے دوران ایم فل کے خیالی پلاؤ پکائی پائی جاتی تھیں۔ میلاد القمر کے فوری بعد لاہور میں حریم ادب کا کنونشن تھا جس میں شرکت کا موقع ملا بہت سے نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

جن میں ایوارڈ یافتہ ادیب تسنیم جعفری اور رقیہ اکبر کے علاوہ بھی بہت سی مصنفات شامل تھیں جبکہ پرانے لوگوں میں، اولاد رائٹرز گولڈ رائٹرز کے ساتھ ساتھ حریم ادب کے اسٹال پر میری پھوپھو زاد بہن بھی تھیں۔ بھاگتے دوڑتے اس سے سلام دعا ہوئی، خیر خیریت پوچھنے کا اس کے پاس وقت تھا نہ میرے پاس کہ تحریر وادی کے لیے میری بکنگ ہو چکی تھی۔ اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں اس فرسٹ کزن کا اسکرین پر میسج دیکھا باتوں میں اس نے زروہ کے رشتہ ہونے یا نہ ہونے کے متعلق استفسار کیا، لوجی اس کے بعد ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے بھائی کا رشتہ بھی پیش کر دیا۔

اللہ اور اللہ کے بندوں سے مشاورت اور استخارہ میں کئی دن گزر گئے اور بات بیچ میں رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آسانی پیدا کی، دونوں اطراف سے دیکھے بھالے لوگ تھے پھر بھی دل کے اطمینان کے لیے دو چار بیٹھے، صلح مشورے میں کٹ گئے اور ادھر ہاں ہوئی ادھر سے نکاح کا سندیسہ پہنچ گیا۔ قصہ مختصر پھوپھی زاد بہن کا نام حمیرا اور ان کے بیٹے کا نام عمر شعیب ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ایک اور داماد کا نام بھی عمر ہی ہے اور اس سے بھی مزے کی بات یہ کہ ان کی بھی ایک بہو کا نام زروہ ہے یعنی ہمارے ہاں دو عمر ہو گئے اور ان کے ہاں دو زروہ!

جھٹ پٹ دو چار دن میں نکاح ہوا۔ رخصت ہونا موسم ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ خواہ سردی ہو یا گرمی، اس وقت اگست کا موسم تھا اور ساون بھادوں نے خوب رنگ جمایا۔ نکاح کے موقع پر بارات (دولہا کے گھر والے) سوا دو بجے کو چرہ انجر پہنچ پر پہنچی تو دھوپ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور جب دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر واقع میرج ہال میں پہنچی تو چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ کیا انجر — اور کیا انجر چرہ پرند سب طوفانی بارش سے سہم گئے تھے۔

جس کا ایک ثبوت میرج ہال کی اس چھت کا بھی ٹپکنا تھا جو اسٹیج کے اوپر تھی۔ چاروں طرف سے پانی کے ریلے ہال میں تالاب کی سی صورت حال پیدا کر رہے تھے، بوچھاڑ عام طور پر ایک رخ پر ہی ہوتی ہے یہ عجیب بارش تھی کہ اوپر نیچے دائیں بائیں پانی کی بوچھاڑ نے اپنا عمل کیا کہ تھم رہی تو مردوں کو ٹخنوں تک پانچے اوپر کرنے کا کہ اس دن خواتین بھی ایک حمام میں تھیں۔ خیر نکاح الحمد للہ — بخیر گزرا، دونوں ہی پر روپ آیا ہوا

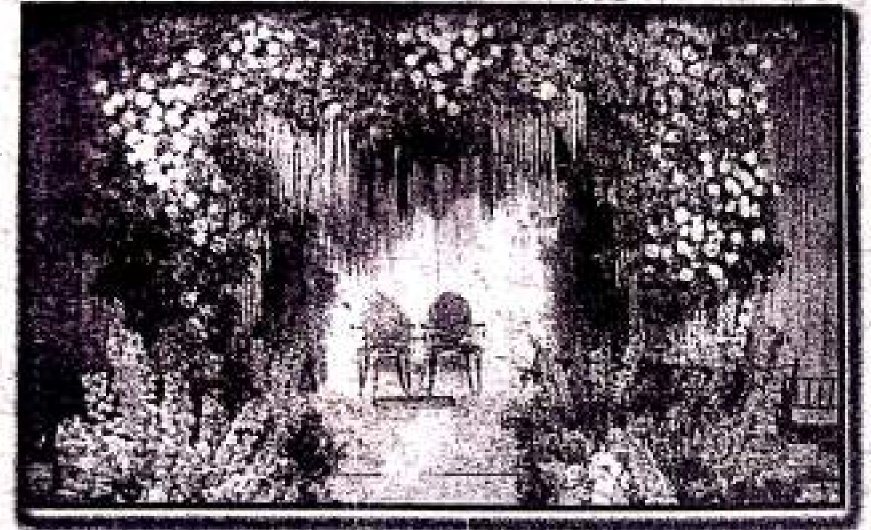

تھا۔ نکاح کے بعد زروہ کے بی ایس فائنل سمسٹر کے امتحانات تھے اور میرا امتحان اس کی رخصتی کی تیاری کا۔

اس مرتبہ صحت کے مسائل کی وجہ سے خریداری کا کام آہستہ روی سے ہوا، زیور پسند کرنے اور بنوانے کا کام شروع کیا تو باقاعدہ طور پر شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔

کپڑے جوتے تو اس نے فیصل آباد میں بہنوں کی مدد سے خرید لیے تھے تاہم باقی تیاری کے لیے مجھے بھی میدان میں اترنا پڑا۔ جب بازار پھر لگا چھوٹے کلہ کا ورد خریداری کو حیرت انگیز طور پر سہل بنا دیتا، بڑی خریداری کے لیے مجھے فیصل آباد امتیاز سپر مارکیٹ جانا پڑا۔ بڑی بہو مومنہ سے درخواست کی کہ وقت نکال کر تم بھی پہنچ جاؤ ایک سے دو بھلے ویسے بھی امتیاز سے اس کا گھر دس بارہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔

میں نے مومنہ کی تشریف آوری تک اچھی خاصی کچھ برتن مشینری وغیرہ پسند کی۔ جب وہ آئی تو میں نے بتایا کہ یہ چیزیں خریدی جا چکی ہیں وہ ہنسی تو پھر مجھے کیوں بلایا ہے؟

جواب تو یہی تھا کہ فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا، شاید امام بی بی کے بارے (علامہ اقبال) نے ہمارے لیے ہی کہا تھا۔

وقت کے ساتھ تیاریاں بھی ہوتی گئیں۔ روز کے روز کاموں کی فہرست بنائی جاتی شام میں جائزہ لیا جاتا کاموں کی درجہ بندی کی جاتی۔ دلہن کے سامان کی تیاری، گھر میں آنے والے مہمانوں کی میزبانی، شادی سے ایک دن قبل کی دعوت میں آنے والوں کے لیے چائے کے ساتھ لوازمات، رات کا کھانا دلہن کے ہاتھوں پر مہندی لگوانا، پارلر کا انتخاب شادی کے دن لانے لے جانے کی ذمہ داری وغیرہ وغیرہ، اسی میں وہ مہمان جو رات کو قیام کریں گے ان کی رہائش کا بندوبست بھی شامل تھا۔ بڑے شہروں میں ریسٹ ہاؤس اور گیسٹ ہاؤس کی سہولت موجود ہوتی ہے چھوٹے شہروں میں یہ سہولت اپنے قریبی عزیزوں اور حلقہ احباب سے فرمائش کر کے لی جاتی ہے۔

اللہ کا خاص فضل ہے کہ جن مسائل کے بارے میں سوچا، اس نے حل کے اسباب بھی خود ہی پیدا کر دیے۔ گزشتہ شادیوں میں صرف زاہدہ باجی کی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

طرف سے مہمانوں کے لیے گھر کے دروازے کھلے رکھنے کی پیشکش ہوئی تھی۔ اب میری دوست شبانہ نے بھی وسیع و عریض گیسٹ روم پیش کیا۔ ان میں بستر لگوائے اس کے خوب صورت لان میں یہ گیسٹ روم واقعی بہترین ٹھکانا ثابت ہوا۔

قیام گرچہ ایک رات کا تھا لیکن بہترین رہا ثمر آدم برسر مطلب، اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے والے (میرے خیال) میں ہمیشہ پل صراط پر ہی رہتے ہیں۔ کہیں یہ بات غلط نہ ہو، وہ کام غلط نہ ہو ڈر ڈر کر ہی زندگی گزاری شاید اسے ہی تقویٰ کہتے ہیں۔ مجھے اس مرتبہ بھی یہی فکر دامن گیر تھی کہ لوگوں کے لیے یہ خوشی کا موقع ایک مثال بنے کہ خوشی میں بھی اللہ کی قائم کردہ حدود کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہے۔ اس میں تین نکات قابل توجہ ہے بچوں اور بچوں کے ابا کے ساتھ مسلسل مشاورت بھی رہی کہ ہم کس انداز سے خوشی کی یہ تقریب منعقد کریں اور ان کے لیے یہ قابل تقلید بھی ہو۔

1۔ کسی قسم کی بھی رسم سے پرہیز از قسم جوتا چھپائی، دودھ پلائی، وغیرہ وغیرہ۔

2۔ میرج ہال میں ہر قسم کے مرد حضرات کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے کہ ایک گناہ کم از کم ایک ٹینشن تو ضرور پیدا کرتا ہے۔ رب کی خفگی اس کے علاوہ۔ بس پھر گزشتہ شادیوں کا طریقہ لیا اور فیصل آباد سے خواتین ویٹرز کو بلوایا گیا اس کے لیے میرے بڑے داماد نے بہت تعاون کیا اللہ اسے بہترین جزا دے۔

3۔ تقریب میں وقت کی پابندی کا خیال رکھا جائے گا اور فوٹو گرافی سے ہر ممکن بچا جائے۔

الحمداللہ تینوں پر عمل نہ بھی سہی بہت حد تک عمل ہوا مجھے میرج ہال میں وقت سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ کر معلوم ہوا کہ باراتیوں کے لیے پھول گجرے ہار نہیں پہنچے۔ میرے دوسرے داماد نے فوری طور پر ان کی جلد ترسیل ممکن بنائی اور بہت سے کاموں میں سب دامادوں کی بھاگ دوڑ دیکھ کر مجھے اپنے اوپر رشک آ رہا تھا اور ربنا ھب لنا من ازواجنا والی دعا پر دل ٹھہر سا گیا، واقعی ذریت کی طرف سے آنکھیں ٹھنڈی رہنا بھی رب کا خاص انعام ہے۔

آمد بارات کا وقت ایک بجے تھا اور بارات گوجرہ پہنچنے والی تھی۔ میرج ہال میں سوائے دلہن کی اماں اور دو بھتیجیوں کے کوئی بھی نہ تھا۔ انہیں درخواست کی کہ جتنا ہولا رکھیں یا نہ رکھیں لیکن گاڑیوں کی اسپیڈ ضرور آہستہ رکھیں بار بار گھر فون کر کے بہنوں اور بیٹیوں کو جلد پہنچنے کی تاکید کی جب چار چھ لوگ پہنچ گئے تو پتا چلا بارات تو نماز کی ادائیگی میں مصروف ہے یوں نماز ظہر کے بعد میرج ہال میں باراتی خواتین کی آمد ہوئی۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ بہت زیادہ تعداد میں میری سہیلیاں، اور عزیز و اقارب موجود تھے۔ ویٹرس بھی آ چکی تھیں اور ہار سنگھار کے بعد آن ڈیوٹی تھیں۔

بہت جلد اندازہ ہوا کہ خواتین کی کثیر تعداد کرسیوں پر تشریف فرما ہونے کے بجائے کھڑے کھڑے خوش گپیوں میں مصروف ہے اصل میں محترمہ کی شادی جنوری 2020ء میں ہوئی اور سر منڈاتے ہی اولے پڑے کے بعد مصداق شادی کرواتے ہی کرونا مسلط ہو گیا۔ اس منحوس وائرس نے پوری دنیا کو گھروں میں قید کر دیا اور یہ کورونا کے بعد ان سب افراد کی باقاعدہ پہلی تقریب تھی۔ چاروں طرف سے ہنسی قہقہے، ہائے آپ کتنی بدل گئی ہیں جیسے فقرے سنائی دے رہے تھے۔

بار بار میری اپیل کے باوجود کوئی بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ خیر تیس بیس کرسیاں مزید منگوائیں۔ کھانے کی دو تین میزوں کا بندوبست کروایا۔ خواتین اور خاموش؟ ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ سوپ سرو کرنے سے کھانے کی سروس کا باقاعدہ آغاز کر دیا جائے تاکہ سب خواتین اپنی خوش گپیوں کے لیے کھلنے والا منہ سوپ پینے کے لیے کھولیں۔ الحمداللہ اسکیم کامیاب رہی پھر چکن روسٹ، کولڈ ڈرنک پیش

کرنے کی دیر تھی کہ خواتین واقعی اپنی اپنی کرسیوں اور صوفوں پر تشریف فرما ہو گئیں۔ میں ہر میز پر، محفل کا نظارہ کر رہی تھی جلد ہی صہیب اور خبیب (میرے دامادوں) نے ویٹرز کو بلوا کر کھانا لگانے کی تلقین کی زرودہ کو اس کا محرم یعنی عمر شعیب ہی پارلر سے لے کر آ چکا تھا اور وہ برائیڈل روم میں سہیلیوں کے اور کزنز کے نرغے میں تھی۔ کھانے میں مٹن قورمہ، چائنیز پلاؤ، چکن روسٹ، نان اور فروٹ ٹرائفل رکھا گیا۔

اچھی میزبان ہونے کے ناتے میری ہر میز پر حاضری لگتی رہی، سب نے اپنے سرکل بنائے ہوئے تھے۔ ایک میز میری حسن آباد والی قرآنی کلاس کا تھا تو دوسرا تحریکی ارکان کا تیسرا، میری کالونی کا، ایک میری سسرال کا تھا تو دوسرا میکے کا چاروں طرف خواتین کے مسکراتے چہرے نظر آ رہے تھے۔

پرسکون ماحول میں کھانا ختم ہوا تو گرما گرم کشمیری چائے کی ٹرے بھی ویٹرز کے ہاتھوں میں دکھائی دی جو ہر خاتون تک پہنچا رہی تھیں۔

بالعموم لوگ کھانا کھاتے ہی رخصت ہو جاتے ہیں لیکن یہاں کھانے کے بعد بھی سب موجود تھیں کہ کم وقت میں سب کچھ ہو چکا تھا خواتین رخصت ہونا شروع ہوئیں تو زرودہ کو اس کی بہنیں اسٹیج پر لائیں ماشاء اللہ وائلیٹ کے میرون لہنگے میں بہت پیاری لگ رہی تھی کچھ ہی دیر میں دولہا میاں کو اندر بلایا گیا۔ حسب توفیق سلامیوں کے لفافے دست شفقت سے دیے گئے چونکہ دولہا میری پھوپھو زاد بہن کا بیٹا تھا تو سب ہی آپس میں بے تکلفی سے دل پسند موضوعات میں مگن تھیں۔ تین سال قبل کی شادیوں میں اور اس شادی میں ایک فرق میری دو ننھی شہزادیوں ہالہ احمد عمر اور فاطمہ تہذیب کے علاوہ مصعب اور ابراہیم کے اضافے کا تھا۔ فاطمہ تو فقط چار ماہ کی ہے جو باری باری سب کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی تھی کہ دلہن کے ساتھ اس کو بھی خواتین کی اکثریت نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

میری بڑی نواسی عائشہ مہدیہ اپنی خوب صورت فراک اور خوب صورت ہیئر اسٹائل میں تتلی بنی گھوم رہی تھی تو موسیٰ اور سلمان بھی شہزادے بنے سب کی

اعتذار

بہن امت العزیز شہزاد علالت کی وجہ سے اس ماہ قسط نہیں لکھ پائیں۔ اس لیے آپ اس ماہ قسط نہیں پڑھ پائیں گی۔
اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازے۔ (آمین)

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نکاحوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔
رخصتی کا وقت قریب آ رہا تھا دل اندر سے پانی بن کر آنکھوں کے گوشے بھگو رہا تھا۔ ماضی میں لوگوں کے تبصرے کانوں تک پہنچے تھے پھر وہ ساعت پر بازگشت بن گئے۔
"فاطمہ کے چوتھی بیٹی ہوئی ہے۔ اچھا اللہ بیٹا بھی دے گا۔" اور وہ وقت بھی سر پر آ گیا کہ چاروں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ میرے نبی کی بھی چار بیٹیاں تھیں انہوں نے جانے کس جگرے سے رخصت کیا ہو گا۔ سیدہ فاطمہ الزہرہ تو چھوٹی اور بن ماں کی تھیں تب ان کی رخصتی کے فوری بعد ان کی خبر گیری کے لیے پہنچ گئے تھے۔
میں دور دور سے زروہ کو نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے رب سے راز و نیاز کر رہی تھی۔
"مالک! میں بہت کمزور بندی ہوں لیکن تو جانتا ہے میں نے انہیں نیکی بدی کی حدود سے آگاہ کیا ہے میں نے حقوق و فرائض کی تعلیم بھی دی ہے میں نے تیری کتاب ان کے ہاتھوں میں دے کر انہیں اس کا علم دینے کی بھرپور کوشش کی۔ مالک! آج میرے حق میں یہ گواہی قبول فرما ان کی حیا ان کے ایمان اور صحت کو مرتے دم تک قائم رکھنا۔"
زروہ کی رخصتی کے ساتھ ہی ایک دو دنوں میں موحد، حمزہ اور محسنہ کو بھی روانہ ہونا تھا، اس کے بعد خالی ڈھانڈھ گھر اکلوتا بیٹا اور ہم بڈھا بڈھی۔
اسی سوچ میں یہ بھی بھول گئی کہ دولہا کو دودھ، مٹھائی بھی تو کھلانا تھی، یہ کام زروہ کرتی تھی۔ وہ رخصت ہوئی میرا دل پسلیوں میں اچھل رہا تھا۔ سانس لینا مشکل تھا۔
سب میرے گلے لگیں مجھے دلاسا دے رہی تھیں مجھے مبارک باد دے رہی تھیں کہ آج کی تقریب میں ناقابل بیان مزہ آیا کوئی ہڑبونگ یا افراتفری نہیں تھی، حالانکہ میں نے اپنے حلقہ احباب میں سے جس جس کو مدعو کیا تھا سوائے دو چار کے سب ہی موجود تھیں اور تقریبی بھی سنائی دیں کہ ہم اپنے گھر والوں سے یہ کہہ کر آئے ہیں ہم لوگوں کو جو کچھ فاطمہ باجی نے سکھایا تھا ہم اس کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔ کھانے کی سو فیصد افراد نے تعریف کی، اتنا مزے کا مٹن قورمہ، گلا ہوا گوشت کھانے کا مزہ آ گیا۔
سب کچھ مختصر سے کہیں ہوتا بہت پلوں کے پیچھے سے گزر کر رب سے مناجات کر کے، جب دنیا خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی تو تہجد کے وقت پونے چار بجے میرے میاں اپنی نگرانی میں بکرے ذبح کروانے گئے تھے اور میں دیکھ رہی تھی کہ پروفیسر صاحب خود بھی زروہ کی رخصتی پر بہت سنجیدہ تھے۔
زروہ بیٹے ٹیسٹ نہیں چل رہا۔
زروہ بیٹے میرے اکاؤنٹ سے اتنی رقم نکلوا کر بل ادا کر دو۔
زروہ بیٹے میرے ڈاکومنٹس اس ایڈریس پر ای میل کر دو۔
زروہ ہم سب کی ضرورت تھی لیکن اللہ نے اپنے فضل سے اسے بھی وقت پر اپنے گھر کا کر دیا۔ آج شادی کا چھٹا دن ہے اور ابھی تک میں تقریب بہت اچھی تھی، کھانا بہت اچھا تھا کے کمپلیمنٹ پڑھ رہی ہوں تو سجدہ شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے بے پردگی اور بدلحاظی کو پسند نہیں کیا تو اس سے بچنے کی کوشش کی، برکت کا تعلق رب کی اطاعت میں ہے ہم نے بطور میزبان سب خواتین کے پردے کا اہتمام کیا کوئی رسم نہیں کی اور بے شک یہ رب کی مدد و توفیق کے بغیر ممکن نہیں تھا۔
کراچی سے میری بہن شاقعہ اور بہنوئی سید ظفر اقبال زیدی شادی سے چند دن قبل تشریف لے آئے تھے۔ انہوں نے ہمارے ہر کام کو بہترین بنانے کے لیے بہت کوشش کی، میرے تینوں داماد، اللہ انہیں سلامت رکھے ان کو ہر طرح سے عافیت عطا فرمائے۔ میرے دست و بازو بن کر ہر کام میں آگے رہے۔ سب کی دعاؤں میں زروہ بہت سی اچھی گواہیوں اور دعاؤں کے ساتھ چلی گئی۔ اللہ سب کی بیٹیوں کو ان کے گھروں میں شاد و آباد رکھے۔ آمین۔

☆☆

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

فرحانہ مہناز گوجرہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے
تین سال بعد گوجرہ سے یہ میرا دوسرا خط ہے۔ جس کو پوسٹ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اسلام آباد میں دوسرے مسائل درپیش تھے۔ مگر وہاں ڈائجسٹ کی وجہ سے میں ہمیشہ ریلیکس رہتی تھی۔ خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ والی گلی میں پوسٹ آفس تھا۔ ہمارے ہی سیکٹر میں تینوں کے اسکول کے پاس ہی رسالے دستیاب۔ بچے کو لینے جاتی تو رسالہ ہمراہ مگر یہاں بازار جانا پڑتا ہے۔ دیور کو کہوں تو سب کچھ لا دیں گے مگر ڈائجسٹ نہیں، بہت مشکل سے رسالہ لے کر آئی۔
اب آتے ہیں فروری کے شمارے کی طرف پہلی شعاع سے سو فیصد متفق ہوں، ہم نعروں سے بہلنے والی جذباتی قوم ہیں۔ محمد وحشت دل مسرور کر گئی اور پہلی شعاع کے مسائل کا حل پیارے نبی کی پیاری باتوں میں پوشیدہ ہے اگر ہم سمجھ جائیں تو قناعت، سادگی، مال جمع نہ کرنا، سب کچھ تو ہے۔ نسب شیر آپ اتنی چھوٹی لگتی تو نہیں خیر (حاتوں کی) ثمینہ اعجاز کی پکچر بھی لگا دیتے۔ ہمیں بھی پہچاننے میں آسانی ہوتی میں تو کسی اور کو ہی ثمینہ اعجاز سمجھتی رہی۔ تجھ سے ناتا جوڑا اچھا لگا، پیاری، کرن اپنا نام بھی بتا دیتیں۔ کس نے زیادہ تنقید کی تھی اب یاد نہیں، رضوانہ وقاص نے پہلا شعر بہت پیارا بیان کیا۔ رضوانہ بہن آپ کو کیا مسئلہ ہے کیا آپ کی بیماری کا علاج نہیں؟ صدف ناصر کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بھرپور تھا۔ صدف آپ کی طرح ہم بھی ترتیب سے تبصرہ کرنے لگے اور ریحانہ وقاص کا (آپی کا) رسالہ پورے کا پورا ہم میں ٹرانسفر ہو چکا تھا جلد پڑھ کر مزا آ گیا۔ یہ ہم جیسی سب بندیوں کا حال ہے۔ دیر تک مسکراتی رہی۔ اگلا جملہ بھی دل کو لگا۔
آپی کام والیوں کے بارے میں رائے سے میں بھی آپ سے متفق ہوں جیسے ہم تھک جاتے ہیں وہ بھی تھک جاتی ہیں، میں نے یہاں آ کر اپنی پرانی کام والی کو بلا لیا۔ ابھی کل ہی وہ صفائی لیٹ کرنے آئی، آتے ہی کہنے لگی باجی یہ والا کمرہ آپ نے صاف کر دیا۔ میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا۔ "نہیں آپ خود ہی کرو" صفائی میں استعمال ہونے والی تمام چیزیں ادھر ہی رکھ جاتی ہے پھر میں ان کو ٹھکانے لگاتی ہوں میری نند کہتی ہے کہ آ گئی تمہاری کام والی تم سے کام کروانے مگر میاں صاحب کہتے ہیں اسے لگا رہنے دینا کیونکہ بڑی مشکل سے ملتی ہیں۔ پھر اس سے آگے اپنا خط پڑھ کر ایک بار پھر رو پڑی۔ کیا کچھ یاد آ گیا۔
فراز کے ساتھ اسلام آباد کا چپہ چپہ گھوما ابھی پچھلی ایئیورسری پر میرے ایک بار کہنے پر ہی مجھے سنتال ڈنر کروانے لے گئے۔ (بچے ای کے پاس رہے) وہاں پر گھوڑے پر بیٹھ کر پیزا کھایا جس کا نام ابھی اسی ماہ کے شعاع میں ایک کہانی میں سنا تھا۔ واپسی پر رات بارہ بجے آئس کریم کھائی۔ سولہویں اینیورسری پر ہم نے بھی دو پل کی طرح پکچر بنائی۔ یاد تو آئیں گی نا۔ اب کہانیوں کی طرف۔ حمیرا اشتیاق نند بھاوج کا مکافات عمل

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اچھا لگا۔ آپ کا قلم نکھرتا جارہا ہے۔

”جھلملیں آئینے اور سائے“ آخر میں پڑھوں گی۔

”شام شہر ہجر“ فرح بخاری جی یہ بن باگھی اور نازمین جیسی چارمنگ ہوتی چاہیے بن باگھی بنگلہ دیش کے کنارے کی اور وہ نازمین کوئٹہ کی کہانی اب شام شہر ہجر بیکورہ سوات کے مضافات کی خوب سیر یں کروائی ہیں آپ نے تحریم لگتا ہے گہری نیند ہی سوئے گی بیچاری، زندگی کی عصر ہوئی عام سا افسانہ لگا ”مکتوم محبت“ شکر ہے ناجیہ سنبھل گئی۔ ”میں ولی“ واہ بھئی فائزہ بھئی کمال کا لکھا۔ ”آپ اپنے دام میں“ میں زبردست اسٹوری ہلکی پھلکی سی تحریر میرے اداسی کے دنوں میں مزہ دے گئی۔ ”قید“ بھی اچھی اسٹوری لگی۔ اور آخر میں بات ہو جائے ”عمر یسرا“ کی، جنت نے بہت خوب صورتی سے عمر یسرا کی تشریح کی، ذہن کی گرہیں کھل گئیں۔ کیا حسنہ حسین پھر پارٹ تو لکھیں گی اینڈ تو ایسا ہی تھا۔ ٹھنڈی چھاؤں احمد نے زہرا کے لیے اسٹینڈ لیا۔ اچھا لگا۔ مسکراہٹیں میں اس ماہ کی مسکراہٹ بہت مزے کی تھی۔ واصفہ غائب تھی۔

ج: پیاری مہناز! اسلام آباد کی یاد تو آئے گی اس لیے کہ شوہر صاحب وہاں مقیم ہیں لیکن وقت جتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ یہ دو چار سال گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس دوران کوئی دوسری صورت نکل آئے اور آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔

اس بار آپ کا تفصیلی تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ آپ کی کہانیاں قابل غور کی لسٹ میں ہیں۔

سونیا ربانی قاضیاں محلہ بالا سے لکھتی ہیں

پہلے جنوری اور اب فروری بھی بہت مصروف گزر رہا ہے۔ جنوری میں شادی تھی اور اب اماں اور ابو عمرے پر گئے ہیں۔ بہت سارے کام سر پہ آ پڑے ہیں تو پڑھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا ہے۔ مگر پھر تھوڑا بہت پڑھ لیا ہے۔ انٹرویو میں جب تھوڑے تا تا۔ ہماری بہن نے پہلے تنقید کی۔ مگر پھر ایسی دلچسپی ہوئی کہ اپنی اماں کے زندگی کے سفر لکھ ڈالا اچھا لگا اور ”شعاع کے ساتھ ساتھ“ اس بار رضوانہ وقاص سے مل کر مجھے بھی شرکت کا پھر سے خیال آیا اور رات کو بیٹھ کر لکھ بھی ڈالا۔ اللہ صحت دے رضوانہ آپ کو۔

عمر یسرا حسنہ حسین کا ناول ختم ہوا۔ بہت ہی پیارا اور اچھا ناول رہا۔ بہت بہت مبارک باد اتنا اچھا لکھنے پر۔ بے شک ہر مشکل کے ساتھ عظیم آسانی ہوتی ہے۔ گزرے سال میرا اتنا بیمار ہونا اور پھر اماں کے گھر شفٹ ہو جانا۔ تب صرف مشکل نظر آرہی تھی مگر دبے قدموں کتنی ہی آسانیاں زندگی میں داخل ہو گئیں خبر ہی نہ ہوئی۔ جن میں سے ایک آسانی یہ بھی ہے کہ پھر سے لفظوں سے کھیل رہی ہوں۔

فرح بخاری کا شام شہر ہجر بہت اچھا ہونے والا ہے اور مکمل ناولوں میں ایک اعلیٰ اضافہ ثابت ہوگا۔ بس وسیلہ کے ساتھ ہونے والے اتفاق اس سے زیادہ مجھے حیران کرتے ہیں۔

حمیرا کا نیا سال نئی کہانی تو نہیں مگر اینڈ ضرور نیا تھا کہ اپنی خطا کا احساس۔ فائزہ کا میں ولی، ہاں جی سارا دن کام کر کر کے یہ باتیں ہم نے بھی سنی ہیں کہ ”اب کیا کام ہیں کام تو ہمارے زمانے میں تھے، پانی باہر سے لانا ہوتا تھا اور آگ جلانے کے لیے گوبر بھی باہر سے اکٹھا کرتے۔“

میں سوچتی تھی کہ اب گیس لگ گئی، پانی گھر پر ہو گیا تو ہماری کیا غلطی؟ مگر ابھی طیبہ کی طرح نخرے سنا کر بہت کام کرتی ہوں۔ مونا شاہ، مکتوم محبت، ناجیہ کو عقل آ گئی بہت ہی اچھی بات ہے۔ باقی ابھی پڑھنا ہے۔

ابھی کرن اور خواتین انتظار میں ہیں۔ مگر خط آپ کے سارے خط پڑھ لیے اور یوں لگا کہ جیسے خون میں اضافہ ہو گیا ہے تسلیم کو تو سچ سچ سر صاحب ہی رہے ہیں۔ مگر اک شخصیت اور بھی ہے اور یہ راز ہے، بتا دیا تو راز جائے گا۔ میں اس پہ لکھنے کا سوچ رہی ہوں۔

رضوانہ مجھے دماغی مسئلے سے ڈپریشن میں پاگل پن میں داخل ہو کر اپنی ساری دوائی ایک ساتھ کھا کر مرتے مرتے بچ گئی اور پھر روز دورے پڑتے، کچھ ہوش نہ رہتا۔ گھر سے نکل جاتی۔ بچوں کو جان سے مارنے کی کوشش کرتی۔ بے ہوش ہو جاتی اور ہوش میں آنے کے بعد کچھ یاد نہ ہوتا۔ ابھی بھی علاج چل رہا ہے۔ شکر ہے اللہ کا کہ اب بہتر ہوں۔ بہت بہت شکریہ پیاری ریحانہ آپ کی دو لائن نے دل خوش کر دیا۔ صدف متاثر ہوتی۔ چلو ہم کون سا تھک گئے ہیں۔ ابھی نہ سہی پھر کبھی سہی۔ اور سونی زل مزل تمہاری بات پہ بے اختیار لبوں پہ مسکراہٹ آئی تھی کہ جیسا میرے ساتھ ہوا تھا ویسا ہی تمہارے ساتھ ہو گیا۔

8 مارچ کو نائلہ لطیف کی سالگرہ ہے مبارک باد۔

پیاری سونی! آپ نے اپنی جو کیفیت بتائی ہے کچھ خواتین اس کیفیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی ناقابل علاج بیماری نہیں نہ ہی پاگل پن ہے۔ علاج کے بعد ٹھیک ہو جاتی ہے۔ آپ کو یہ تکلیف شادی کے بعد ہوئی یا پہلے سے ہی تھی؟ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ سے نوازے لیکن دوائیوں میں غفلت نہ کیجیے گا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت کی پابندی کے ساتھ لیجیے گا اور ٹھیک ہو جائیں۔ تب بھی ڈاکٹر کے مشورے سے دوائیں چھوڑیے گا۔

صدف ناصر...... گوجرانوالہ

ماہ فروری کا شعاع ملا تو ساری خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ خوشیاں! بچوں کے بہترین سالانہ رزلٹ کی۔ ماشاء اللہ سے بہترین کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مزید برآں یہ خوشی کہ جب بی بکس لینے اسکول گئی تو بس اتنا ہی کہا۔ ”خدیجہ ناصر“ کی بکس لینی ہیں تو فوراً ہی ایک ٹیچر الرٹ ہو کر بولیں۔ ”آپ صدف ناصر ہیں ناں؟“ میں بہت پزل ہو گئی کہ ادھر میرا کیا ذکر؟؟ ٹیچر بولیں کہ میں آپ کو شعاع اور خواتین میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں آپ کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ یہ تھیں۔ ”مس سدرہ“ پھر وہ اندر ہال میں جا کر ایک اور ٹیچر ”مس شائلہ عثمان“ کو بلا لائیں۔ وہ بھی بہت محبت سے ملیں اور کہا ”میں اسپیشلی آپ سے ملنے آئی ہوں۔“ تھینکس آلاٹ اشعاع اور خواتین۔

”سرورق بہت اچھا لگا۔ سرورق کی ہسٹری سنانے والی ”طوبیٰ، صدف، مقدس“ پچھلے کئی ماہ سے غائب ہیں۔ اللہ پاک سب کو خیر خیریت عطا فرمائے (آمین)

”کچھ شعاع“ سے سو فیصد متفق ہوئے۔ علامہ صاحب یاد آ گئے سامنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی ”حمد اور نعت“ بہترین ہیں۔ ماشاء اللہ۔

”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ ہمیشہ کی طرح زبردست ہیں۔ اگلے ماہ کے لیے ”رمضان“ کے حوالے سے آگاہی فرمائیں۔

”زینب شبیر“ سے ملاقات اچھی اور ”ثمینہ اعجاز“ سے بہت اچھی رہی ”نعمان اعجاز“ کے بیٹے کا انٹرویو بھی لیں (مجھے پیارا ہوا تھا) ”نانا جوڑا“ ہم سب بہن شکر ادا کریں۔

تین ماہ میں آپ کو الگ کر دیا گیا اور حالات بھی نارمل ہو گئے آئے اور نہ باقی بہنوں کا ناتا پڑھیں تو اللہ کی پناہ۔

”شعاع کے ساتھ ساتھ“ رضوانہ وقاص سے ہیلو ہائے کی۔ ایک تو مجھے ”رضوانہ وقاص“ اور ”ریحانہ وقاص“ ہر ماہ بہت کنفیوژ کرتی ہیں (ان کے نام)

”خط آپ کے“ میں ”زل مزل“ سمیت سب ہی تبصرے بے حد زبردست اور بھرپور رہے۔

تحریروں کا آغاز اس ماہ خلاف معمول ”افسانوں“ سے کیا۔

”نیا سال، نئی کہانی“ تنقید کاروں کو اچھا سبق دے گی۔ عادت ہوتی ہے کچھ لوگوں کو بلاوجہ اپنا رعب ڈالنے اور تنقید کرنے کی۔ مگر یہ کردار ہمیشہ ”پھوپھو“ کے حصے میں ہی کیوں آتا ہے بھئی؟؟ ”میں ولی“۔ سب ہی خواتین کا دکھ بیان کیا فائزہ نے، کام پورے خاندان کا کروا کر بھی بعد میں ”کرتی کیا ہو ویلی رہتی ہو“ کے طعنے ہر گھر کی زینت بنے رہتے ہیں۔

”زندگی کی عصر ہوئی“ ایک منفرد عنوان کیونکہ ہمیشہ سے ”زندگی کی شام ہوئی“ سنتے آئے۔ بہرحال پلاٹ تھوڑا پرانا مگر لکھا اچھی طرز پر، کیونکہ نئی رائٹر ہیں تو انداز تحریر اچھا ہے۔

”مکتوم محبت“ کو مونا شاہ نے خاصا طویل کر دیا ہے۔

”ٹھنڈی چھاؤں“ اچھی تحریر مگر اتنا صبر بھی کیا کہ انسان خود سے کی گئی ناانصافیوں پر بھی خوش رہے۔

”آپ اپنے دام میں“ صدف عمر کے ناولٹ نے متاثر نہیں کیا۔ اس ٹاپک پر ہزاروں تحریریں پڑھ چکے ہیں۔

”مکمل ناول“ ”ثمین صداقت کی اچھی کوشش“ ”قید“ تحریر کرنے کی۔

”شہر شام ہجر“ اتفاقات سے پر تحریر اس ماہ بھی اچھی رہی۔ ”سوسن“ کا کردار اچھا لگا۔

”جھلملیں آئینے اور سائے“ نگہت سیما کا نام پڑھ کے از حد خوشی ہوئی مگر ”باقی آئندہ“ پڑھ کر از حد کوفت بھی ہوئی۔ تبصرہ ادھورا رہا۔

”باتوں سے خوشبو آئے“ میں ”بچھو کی پیدائش“

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
PKDAILYINFO.COM

پڑھ کر اش اش کر اٹھے۔ "نادیہ یاسر" نے کیا خوب شعر ارسال کیا۔

سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہیں ہم تو
کسی نے سمیٹا بھی تو صرف جلانے کے لیے

اور آل ماہ فروری کا شمارہ اچھا رہا۔ پرانے ٹاپک نے پریشان کیا مگر کئی رائٹرز نے اچھا لکھنے کی کوشش کی۔ "مکمل ارباب" کیوں نہیں لکھتی ہیں اب، ورنہ ان کے ناول باقاعدگی سے آتے رہے۔

پیاری صدف! بچوں کے بہترین رزلٹ پر دلی مبارک باد۔ آپ زندگی میں ایسی بہت سی خوشیاں دیکھیں بچوں کی کامیابی پر والدین جتنا خوش ہوتے ہیں۔ اتنی خوشی شاید انہیں اپنی کامیابی پر بھی نہیں ملی ہوگی۔

شعاع اور خواتین پر تبصرے آپ کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔ یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ قارئین خطوط بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جس طرح ناول، افسانے پڑھتے ہیں آپ کے تبصرے بلاشبہ قابل تعریف ہوتے ہیں اور آپ بھی ہر کہانی پر تبصرہ کرتی ہیں اور بڑی باقاعدگی سے محفل میں شرکت کرتی ہیں۔

ریحانہ وقاص نے لاہور سے لکھا ہے

پچھلے سال مارچ 2022 کی طرح اس سال فروری 2023 میں سارہ تیلم (ناول) کا میک اپ اور اسٹائل ملتا جلتا تھا اپ اسٹک بھی ملتی جلتی تھی۔ اب روز بیوٹی پارلر والے ہر مہینے نئے اسٹائل کہاں سے لائیں؟ رسالے تو ہم اور بھی پڑھتے ہیں لیکن جو بات شعاع میں ہے وہ کسی اور میں کہاں؟ ویسے ہمارا بڑا دل کرتا ہے کہ ہم کراچی آئیں آپ سے ملیں اور دیکھیں آپ لوگ کیسے کام کرتے ہیں۔

ہمارا پہلا افسانہ 2021 میں شائع ہوا دوسرا 2022 میں اور اب 2023 میں جانے کب شائع ہوتا ہے۔ کام والیوں کی بھی آپ نے خوب کہی۔ آپ یقین کریں کہ میں تو کوشش کرتی ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں۔ لیکن بعض اوقات تو حد ہو جاتی ہے، کھانے پینے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ میں نے دیر سے آنے پر ناشتا کرنے پر پابندی لگا دی کہ جو دس بجے کے بعد آئے گا وہ ناشتا گھر سے کر کے آئے۔ مجھے کام چاہیے بس پھر کیا تھا، دو دن انہوں نے دوپہر کا بھی غصہ سے کھانا چھوڑ دیا۔ تیسرے دن وقت کی پابندی بھی ہوگئی ناشتا اور دوپہر کا کھانا بھی شروع ہوگیا۔ ورنہ گیارہ بجے آنا، سکون سے ناشتا کرنا اور پھر کام شروع۔

پیارے نبی کی پیاری باتوں پر بات کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ زینب شبیر کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ دنیا کیسے کیسے غموں سے بھری پڑی ہے۔ رضوانہ وقاص کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا انہیں کیا مسئلہ ہے؟ یہ نہیں بتایا انہوں نے، اللہ ان کے لیے سب اچھا کرے (آمین) فرحانہ مجاز کے سفر، مشکلات اور بچوں کے لیے انتھک کوششوں کو پڑھ کر ان کے لیے دل سے دعا نکلی کہ ان کے سب خواب پورے ہوں (آمین) "نیا سال نئی کہانی" مختصری سبق آموز تحریر تھی۔ "جھلملیں، آئینے اور سائے" ہجر، جدائی اور غم کی اذیت سے بھرپور تحریر تھی۔ دو بھائیوں کی محبت نے بڑا دکھی کیا۔ بہت خوب صورت لیکن نامکمل انتظار آئندہ ماہ کا یہ اچھی بات نہیں ہے۔ "میں ویلی" فائزہ بھٹی نے اچھا لکھا۔ ویسے واقعی چھوٹے چھوٹے کام کسی کو نظر نہیں آتے۔ "مکتوم محبت" گھریلو عام سی تحریر لگی۔ "جب زندگی کی عصر ہوئی" میں صنوبر کی جلد بازی ہوئی ورنہ وہ اسے طلاق دیے بغیر بھی دوسری شادی کر سکتا تھا اور ساری زندگی محبت خراج مانگتی۔ غرور اور تکبر کی سزا اور صابر کرنے کا انعام......
"قید" نے تو محفل ہی لوٹ لی، ثمین صداقت نے بہت اعلا لکھا، ویل ڈن۔ "عمر یسرا" کے تو کیا کہنے...... بالآخر اپنے انجام کو پہنچا، صدقہ جاریہ ہے جس نے بھی پڑھا ہوگا اس کا ایمان مضبوط ہوا ہوگا۔ ایک آیت کی ایسی خوب صورت باکمال تشریح...... اور کچھ کہنا چاہوں تو بھی نہیں کہہ سکتی انتہا ہے بس۔ "مقطری پچھاویں" قسمت اور نصیب کی بات ہے۔ احمد نے محبت کا حق ادا کر کے اچھا کیا۔ چکن بریانی اور فش کٹلس کا تو آج کل موسم ہے لیکن جلدی کا تو نہیں؟ موسم کے پکوان موسم کے حساب سے ہی اچھے لگتے ہیں نا؟ "آپ اپنے دام میں" ہاہاہا بڑی مزیدار اسٹوری تھی۔ خاص طور پر ایک فقرہ "چائے لیں گے یا پھنڈ!؟ بہت مزا آیا پڑھ کر۔

پیاری ریحانہ! آپ کی ملازمہ صرف ناشتے کی دھمکی سے راہ راست پر آ گئی۔ اور اب ایک گھنٹہ پہلے آجاتی ہے بے چاری غریب اور ضرورت مند ہوگی ورنہ آج کل ملازمین کہاں کسی کی سنتے ہیں۔

تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ نے پورا پرچا پڑھ کر ہر کہانی پر بہت اچھا اور درست تبصرہ کیا۔ اتنی جلدی پرچا پڑھنا اور خط لکھنا بڑی بات ہے۔ آپ کراچی آئیں تو ہم سے ضرور ملیں ہمیں آپ سے مل کر خوشی ہوگی۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنا ایڈریس ضرور بھجوائیں۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اس بار تو صدف عمر کے دلچسپ و دلکش ناولٹ آپ اپنے دام میں نے تو میدان مار لیا۔ اتنا اچھا مزیدار ناول دل خوش کر دیا۔ صدف خوش رہیے اور جناب ثمین صداقت کے ناول قید کو بس مناسب کہہ سکتے ہیں اور اسی طرح حسنہ حسین عمر یسرا بھی ہمیں بہتر لگا مگر معذرت کے ساتھ کہ ہم اس سے بالکل بھی متاثر نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن اوور آل دیکھا جائے تو ٹھیک تھا البتہ اس ناول کے اینڈ کے پیراگراف نے دل کو چھوا۔ جھلملیں آئینے اور سائے، یہ ناول ہمیں پسند آیا ہے۔ نگہت سیما نے جس کے اسٹوری لکھی ہے ان کی کہانی میں چارم ہے اور فرح بخاری کا ناول شام شہر ہجر تو خوب زبردست لگ رہا ہے لگتا ہے آگے جا کر اور بھی نکھار آجائے گا۔ افسانوں میں نیا سال نئی کہانی بالکل حقیقت سے قریب لگا۔ مونا شاہ کا مکتوم محبت بھی عمدہ افسانہ لگا۔ اور ملیا سمیون کی کہانی جب زندگی کی عصر ہوئی بھی اچھی لگی خاص طور پر افسانے کا نام بہت بھلا لگا۔

کتھا کسی یہ کیوں یہ میرے دل کا معاملہ کو تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں اور باتوں سے خوشبو آئے ماشاء اللہ یہ دونوں پیارے سلسلے ہیں کہ پڑھ کر دل منور بھی ہوتا ہے اور آپ لوگوں کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ پیاری بہن اس بار مجھی شعاع آپ کی تحریر پڑھ کر بالکل ایسا لگا جیسے یہ ہر محب وطن پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ اور سب سے پیارا دلکش سلسلہ آپ کے خط لگتا ہے حیرت ہوتی ہے آپ اتنی توجہ اور پیار سے سب کے خطوط پڑھتی ہیں اور ان کے جواب بھی کتنے خوب صورت اور محبت بھرے انداز میں دیتی ہیں تو بہت بہت خوشی ہوتی ہے۔

پیاری تسنیم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔ ثمین صداقت کا ناول قید آپ کو زیادہ متاثر نہ کر سکا، یہ ثمین کی پہلی تحریر تھی۔ وہ آگے چل کر اس سے اچھا لکھیں گی (ان شاء اللہ)

آپ نے صحیح کہا "کتھا کسی یہ کیوں" کو توجہ کی ضرورت ہے ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

مسرت تنویر نے اٹک سٹی سے لکھا ہے

اس دفعہ پھر سرورق کی ماڈل سرخ کپڑوں میں بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ پہلی شعاع پڑھی دل بہت دکھا۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت شریف ہمیشہ کی طرح دل کو سکون ملا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ صحابہ کی خودداری، قناعت، سادگی عبادت کرنا فوائد و مسائل کے بارے میں جان کر علم میں اضافہ ہوا۔ آپ کے شمارے سے بہت سارے دینی و دنیاوی مسائل کے بارے میں جانا۔ ہماری بہت ہی پیاری مصنفہ بہن محترمہ صامت العزیز شہزادہ صاحبہ کو بہت بہت مبارک ہو ان کی بیٹی کے بہت اچھے نصیب ہوں۔ (آمین)

معروف فنکارہ زینب بشیر سے ملاقات اچھی لگی۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ ام حبیب گجرات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ دستک میں ثمینہ اعجاز کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ رضوانہ وقاص کراں ہری پور سے ملاقات بھی اچھی لگی۔ افسانے اس دفعہ بھی زبردست تھے۔ نیا سال نئی کہانی حمیرا شفیع نے اچھے ٹاپک پر لکھا۔ مجھے یہ کہانی بہت اچھی لگی۔ مکمل ناول جھلملیں، آئینے اور سائے بہت ہی زبردست تحریر، مجھے اس کی دوسری قسط کا بہت انتظار رہے گا۔ پتا نہیں ماہی اور عثمان اینڈ میں ملتے ہیں کہ نہیں نگہت سیما صاحبہ نے بہت اچھا ناول لکھا ہے۔ پردیس کے بارے میں لکھا گیا ناول مجھے بہت اچھا لگا۔

عزیز بہن مسرت! آپ نے اتنے پیار سے خط لکھا۔ ہم آپ کی محبتوں کے تہ دل سے ممنون ہیں۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ آپ کی دعائیں ان

بقیہ صفحہ نمبر 210 پر

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

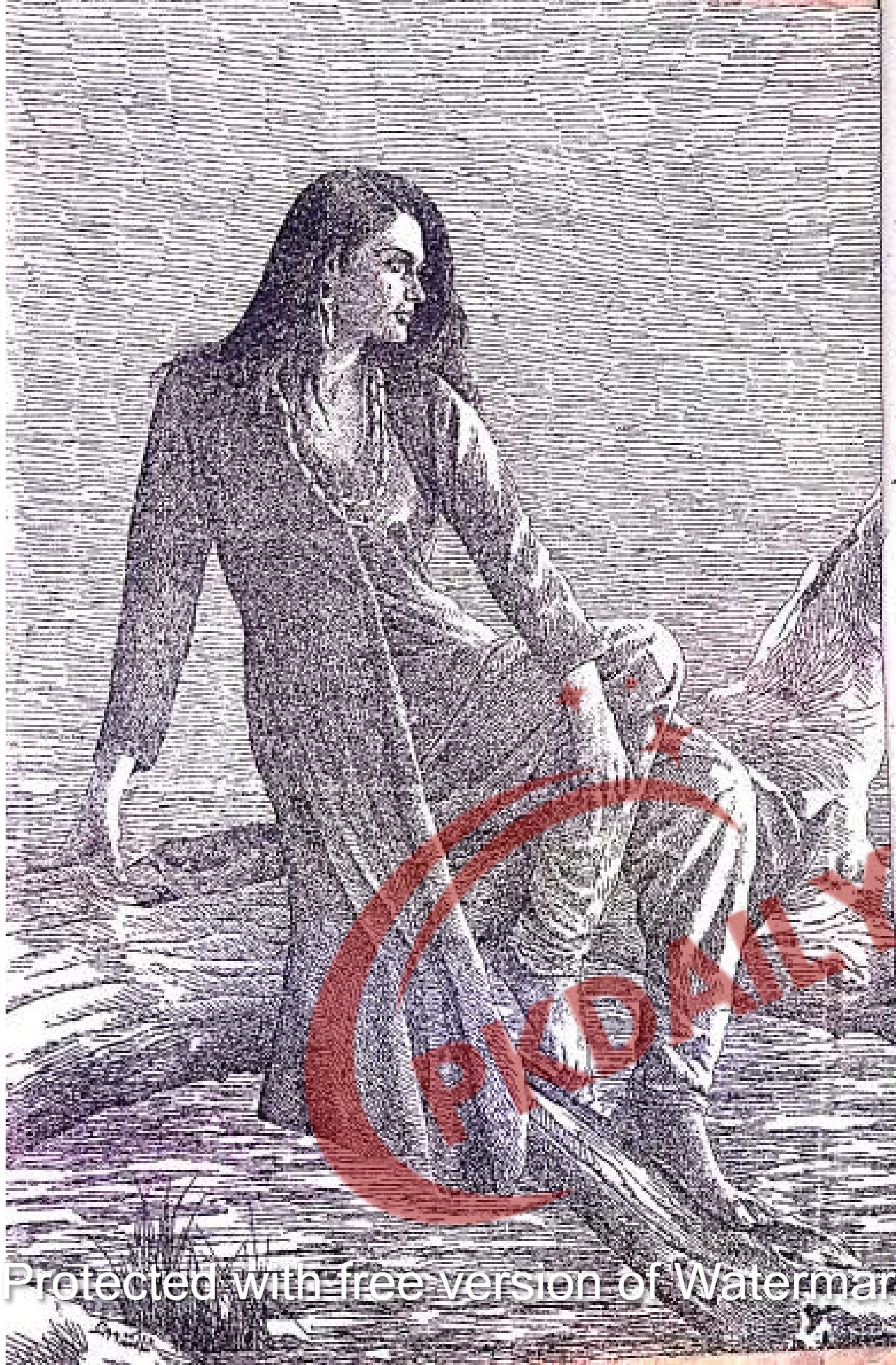

میمونہ صدف

عاقبت نااندیش

ایوبیہ سے تھوڑا آگے خان پور میں آرمی ریسٹ ہاؤس تھا جہاں ان کی دو دن کی بکنگ تھی اور انھیں وہاں پہنچتے پہنچتے دن کے بارہ بج چکے تھے۔ ہلکے بادلوں میں سے گزرتے ہوئے وہ بھی بادلوں کے سنگ اڑ رہے تھے۔ ہوا کی خنکی جولائی میں بھی ایسی تھی کہ عشوہ کا دل چاہا، بیگ سے اپنی شال نکال کر اوڑھ لے۔ یہاں کے موسم کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ کسی دم بھی بارش برسنا شروع ہو جاتی۔ اسی لیے وہ گرم شال اور سویٹر بھی لے آئی تھی۔

ریسٹ ہاؤس پہنچ کر گیٹ پہ موجود گارڈ نے ہی ان کا سامان اٹھوا کر پہلے سے بک ہوئے کمروں میں پہنچا دیا۔

"واٹ آ نائس روم یار۔" موحد نے کمرے میں پہنچ کر ــــ کمرے کا جائزہ لیا تو۔ کہے بنا رہ نہیں سکا۔

"مانتے ہو نا پھر معیز بھائی کو۔" وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ یہ موحد تھا جو اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

"انھیں کون نہیں مانتا۔ وڈے لوگ ہیں وہ تو۔" معیز بھائی عشوہ کے سب سے بڑے بھائی تھے جو آرمی میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ یہ بکنگ انھوں نے ہی کروا کر دی تھی۔ موحد کی ان سے بالکل نہیں بنتی تھی اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی بھی نہیں کہ وہ معیز بھائی سے کتنی خار کھاتا ہے۔

"مذاق بھی نہیں سمجھتیں۔"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"تمہارے بھونڈے اور آؤٹ ڈیٹڈ مذاق۔" اس نے اٹھ کر موحد کو بازو سے کھینچ کر اٹھایا ورنہ وہ اس کے کمرے میں چیونگم کی طرح چپکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"اب تم اپنے کمرے میں گم ہو جاؤ۔ جا کر چینج کرو تا کہ لنچ کے لیے نکلا جائے۔ آج کا دن گھومنے کے نام کل میں میٹنگ اٹینڈ کرلوں تو واپسی کے لیے نکلیں گے۔ مجھے واپس جا کر پھر کچھ تیاریاں بھی کرنا ہیں۔"

وہ کمپنی کے باس سے کچھ ضروری معاملات طے کرنے اور اہم کاغذات پہ ان کے دستخط لینے وہاں آئی تھی۔

راستے کے اخراجات کمپنی کے ذمے تھے۔ کام کا کام اور سیر کی سیر۔ ممانے اسے اکیلے جانے سے منع کیا تھا۔ مونس جو اس سے سال بڑا تھا، ان دنوں اپنی کمپنی کے کسی ٹور پہ ملک سے باہر تھا اور معین کا جو اس سے تین سال چھوٹا تھا، کوئی اہم پروجیکٹ تھا جس پہ کام کے سلسلے میں وہ ان دنوں مصروف تھا تو اس کے ساتھ نہیں آسکتا تھا۔ اسی لیے اس کے پاس آخری آپشن کے طور پہ موحد ہی موجود تھا جسے وہ ڈرائیور اور گارڈ بنا کر اپنے ساتھ یہاں لے آئی تھی۔

"ابھی تو پیٹ میں چوہے شوہے پکڑن پکڑائی کھیل رہے ہیں۔ کچھ اچھا سا کھلا پلا دو بس پھر جہاں کہو گی یہ خادم لے جائے گا۔"

وہ جانتی تھی کہ ایک عرصے سے وہ بے روزگار ہے اسی لیے اس کے پاس پیسے کم ہوتے تھے۔ اکثر وہ غریب، مسکین بنا اسی سے ادھار مانگ کر گزارا کرتا تھا۔

"اسی لیے یہاں سے نکال رہی ہوں کہ جا کر چینج کرو اور پھر باہر جا کر کہیں سے اچھا سا لنچ کرتے ہیں۔ اب تم میرے کام سے آئے ہو تو خرچا بھی میرا ہی کرواؤ گے۔" موحد اس کی سمجھداری کی داد دیتا اپنے کمرے میں چلا گیا تو عشوہ اپنے کپڑے نکال کر شاور لینے چلی گئی۔

☆☆☆

ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل کر ایک ذیلی سڑک سے اوپر کی طرف نکلو تو سامنے مشہور "بٹ کڑاہی" موجود تھی۔ گاڑی وہیں پارکنگ میں چھوڑ کر وہ دونوں واک کرتے ہوئے وہاں پہنچے اور آرڈر کر کے اوپن ایئر میں ہی بیٹھ گئے۔ کھانے کا وقت ہونے کے باوجود وہاں رش نہیں تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ویک اینڈ نہیں تھا اور عام دنوں میں سیاح کم ہی یہاں کا رخ کرتے تھے۔ یوں بھی یہ علاقہ عام ریزورٹس سے مختلف تھا یہاں مختلف کمپنیوں اور یونیورسٹیوں کے ہی ریسٹ ہاؤس تھے۔

پیچھے کی جانب لگی ریلنگ سے نیچے کھائیاں تھیں جہاں سے بندروں کی پوری فوج جوق در جوق اوپر چلی آرہی تھی۔

"مانا کہ تمہارے قبیلے سے ہیں لیکن انھیں فری مت کرنا۔ یہ زیادہ فری ہو جائیں تو بیٹھنا محال کر دیں گے یہاں اور عین ممکن ہے کہ ہمارا کھانا بھی چرا کر بھاگ جائیں۔" موحد اسے بندروں کی تصویریں اتارتے ہوئے دیکھتا نصیحت کر رہا تھا۔

"میں بچپن سے ایک بندر ساتھ لیے پھرتی ہوں۔ یہ چھوٹے موٹے بندر اس کے سامنے کیا چیز ہیں۔" ساتھ ہی ایک تصویر کھٹاک سے اس کی بھی کھینچ لی۔

"بندروں میں سب سے بڑا بندر۔" تصویر کا کیپشن اس نے خود ہی سوچ لیا تھا۔

"اور جس بندر کے نام کی انگوٹھی پہننے جا رہی ہو، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" گرل سے ٹیک لگائے وہ اسے کہیں سامنے مناظر کو دیکھتے ہوئے اسے چڑانا چاہ رہا تھا۔

"وہ بندر نہیں ہے۔" عشوہ نے ترنت جواب دیا۔

"ہاں۔ وہ بن مانس ہے۔۔ بلکہ گوریلا۔" موحد نے ایک کمینی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا تو عشوہ نے جھٹ سے منہ بنا کر رخ پھیر لیا۔

"یقیناً یہ ہمارا آخری ٹرپ ہے ساتھ میں۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"تم تو ابھی سے مجھے مس کرنے لگے ہو۔" وہ مسکرا دی لیکن اس مسکراہٹ میں ایک اداسی تھی۔

"قسم سے یار۔ قسم سے۔ شدید مس کرنے لگا ہوں میں تمہیں۔" اس کی شکل ایسی تھی کہ عشوہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسنے لگی۔

"کون سا دور جا رہی ہوں۔ اسی شہر میں ہوں گی اور اسی طرح تمہارے کان کترتی رہوں گی۔"

"ہاں میجر صاحب اجازت دے دیں تو۔"

"کیوں اجازت نہیں دے گا۔ ؟ تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ مما اور آنٹی اچھی فرینڈز ہیں۔ ہم پڑوسی ہیں۔ تم بچپن سے میرے کلاس فیلو رہے ہو اور ہم نے ساری زندگی اکٹھے گزاری ہے۔ اکٹھے پڑھا ہے۔" وہ انگلیوں پہ اپنے ایک ایک تعلق کا حوالہ گن رہی تھی۔

"بالکل بالکل۔ ہم دونوں انسان ہیں۔ مسلمان ہیں۔ پاکستانی ہیں۔ ایک فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ایک ہی سپلائی سے آنے والا پانی پیتے ہیں۔" عشوہ نے اپنا ہینڈ بیگ اسے اٹھا کر مارا جو اس نے کیچ کر لیا۔

"ویسے اس سب کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ وہ کہے گا۔ جہاں موحد مرزا سے اتنے تعلق ہیں تو تمہیں باقی کی زندگی بھی موحد مرزا کے ساتھ گزارنے کی اجازت ہے۔ باقی زندگی پہ تو اس کا حق ہوگا۔" عشوہ نے اسے تڑپ کر دیکھا۔

"مجھے باقی کی زندگی موحد مرزا کے ساتھ گزارنے کی اجازت ہی تو نہیں ہے۔" یہ محض وہ سوچ سکی تھی۔

"ویسے بھی وہ مجھے ذرا خود سے جیلس لگتا ہے۔" عشوہ نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

"وہ اور تم سے جیلس۔ اس کا اتنا برا ٹیسٹ نہیں ہے۔"

"مان لو کہ اس کا ٹیسٹ برا نہیں ہے لیکن تمہارا دوست ضرورت سے زیادہ اچھا ہے۔" عشوہ نے منہ کے زاویے بگاڑے۔

"چلو مان لیا کہ میرا دوست ہی بہت اچھا ہے۔"

موحد نے ماتھے تک ہاتھ لے جاتے اسے سیلیوٹ کیا۔

"اب یہ بھی مان لو کہ تمہاری شادی کے بعد ہماری دوستی ایسی نہیں رہے گی عشوہ بی بی۔" عشوہ کا دل یکدم اداس ہو گیا۔ اسے ایسی کوئی بھی بات آج کل یوں ہی اداس کر دیتی تھی۔

"میں بھی ایسی نہیں رہوں گی۔" موحد نے اسے سرتاپیر دیکھا۔ پاؤں میں برف پہ چلنے والے لمبے بوٹ، مردانہ لباس، سر پہ پی کیپ اور کسی بھی قسم کے میک اپ سے مبرا چہرہ لیے وہ اداس کھڑی تھی۔

"اچھا، ہم یہاں انجوائے کرنے آئے تھے۔ نا کہ تمہاری آنے والی زندگی کا سوچ کر اداس ہونے۔" وہ اٹھ کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔ عشوہ نے جلدی سے اپنا موڈ درست کر لیا۔

"کھانا کھا کر مال روڈ کی طرف نکلتے ہیں۔" وہ اب کرسیوں کی طرف آگئی تھی جہاں ویٹر اب سلاد اور رائتہ رکھ کر جا رہا تھا۔ کھانا تقریباً تیار تھا۔

کھانا کھا کر وہ مال روڈ کی طرف نکل گئے۔ مال روڈ پہ جاتے ہی عشوہ نے معیز بھائی کے تمام بچوں کے لیے شاپنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ادیبہ باجی کے چار عدد بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لے لیا۔ ادیبہ باجی موحد کی اکلوتی بہن تھیں جو آئے دن میکے میں ہی اپنے سارے بچوں کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔

عشوہ کی چونکہ کوئی بہن نہیں تھی تو ادیبہ باجی ہمیشہ سے اس کے لیے بڑی بہنوں ہی کی طرح تھیں۔ ان کی شادی پہ عشوہ نے چھوٹی بہنوں والے سارے ارمان پورے کیے تھے۔ ان کے بچوں کی ہر طرح سے خالہ بھی بن کر دکھایا تھا یہ اور بات تھی کہ

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حلیے سے وہ انھیں ماموں زیادہ خالہ کم لگتی تھی کیونکہ اس کا حلیہ موحد ماموں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا تھا

شاپنگ کے دوران ہی مما کی کال آئی اور وہ اسے فون پہ نجانے کیا کیا نصیحتیں کرتی رہیں کہ کال بند ہونے پہ اس کے چہرے کے تاثرات مکمل طور پہ بدل چکے تھے۔

"چلو، مجھے کچھ شالز خریدنا ہیں۔" وہ وہاں ایک بڑے شال باف کی دکان پر پہنچ گئی۔ نفیس کڑھائیوں سے مزین اس نے مما اور موحد کی امی کے ساتھ ایک کڑھائی والی شال اپنی ہونے والی ساس کے لیے بھی خریدلی۔

"یہ کالی والی کیسی ہے؟" اس نے ایک بہت ہی نازک اور حد درجے نفیس کام والی شال کاندھے پہ اوڑھ کر دکھائی۔

"اب کیا بھابھیوں، جیٹھانیوں، دیورانیوں کے لیے بھی خریدو گی۔ قسم سے انسان کی بالکل بھی لاکھ ڈیڑھ تنخواہ نہ ہو۔ وہ بھی کسی لڑکی کی۔ ساری شاپنگ میں ہی لگا دیتی ہے۔"

"یہ میں اپنے لیے خرید رہی ہوں بندے۔" موحد نے یہ سن کر اسے یوں دیکھا جیسے کسی بجلی کی ننگی تار پہ پاؤں پڑ گیا ہو۔

"مطلب کہ پرکٹی کبوتری بن کر، پینٹ شرٹ اور ان جوگرز کے ساتھ اب تم یہ حسین ترین شال اوڑھ کر کوئی نیا فیشن ایجاد کرنے جا رہی ہو۔ کوریا صاحب نے پوری طرح سے تمہیں سحر زدہ کر دیا ہے کہ فیشن کی سدھ بدھ بھی کھو چکی ہو۔"

عشوہ نے وہیں شال پھینک دی اور باقی ساری شالز بھی وہیں چھوڑ کر، بنا خریدے ہی دکان سے باہر نکلتی چلی گئی۔ موحد دکان دار سے معذرت کرتا اس کے پیچھے لپکا۔

"یار! یہ کیا مذاق ہے۔ اب پسند کی تھی تو خرید لیتیں۔" عشوہ غصے سے آگے بڑھتی رہی۔

"کیوں اتنا بھاگ رہی ہو۔ کیا مال روڈ پہ کسی دوڑ کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے جس میں حصہ لینے تم لاہور سے یہاں آئی ہو؟" وہ جیسے اسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ بس دوڑے جا رہی تھی۔

وہ اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا کہ اندر کئی ٹن ایندھن جل رہا ہے جو اسے یوں بھگا رہا ہے۔ سو سارا مذاق گیا بھاڑ میں۔ اب تو سنجیدگی کا چولا اوڑھنا ضروری تھا۔

"میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم کب سے اتنا سیریس لینے لگیں میرے مذاق کو۔۔؟"

وہ اب ایک طرف جا کر کھڑی ہو گئی۔

"اب اگر میں خود کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں تو ضروری ہے کہ تم میرا مذاق اڑا کر مجھے مجبور کرو کہ میں ویسی ہی رہوں جیسی ہوں۔ ہاں ٹھیک ہے کہ یہ سب مجھے پسند نہیں ہے۔ لیکن اب میں بال لمبے کر رہی ہوں تا تو دیکھو کہ اب ان کی چھوٹی سی پونی بڑی ہو کر چوٹی بنتی جا رہی ہے۔ اس ٹرپ کے بعد ڈھنگ کے کچھ کپڑے بھی خرید لوں گی جنھیں پہن کر میں یکدم مما اور آنٹی کی مشرقی لڑکی بن جاؤں گی۔ دوپٹے بھی تین گز کے اوڑھ لوں گی جن سے الجھ کر سو بار گروں گی تو چلنا سیکھ ہی لوں گی۔ مما نے سینٹورس مال سے جا کر ڈھیروں میک اپ بھی خریدنے کا کہا ہے جیسے لاہور میں میک اپ غائب ہو چکا ہے۔۔ اور یہاں مال روڈ سے دو بیگ بھر کر جیولری کے بھی لے جاؤں گی جنھیں پہننے کی پریکٹس میں اور پپو باجی کے پاس جا کر کروں گی۔۔ تم سب اب خوش ہو جاؤ کیونکہ یہ باغی مینڈا اب مکمل طور سے بدلنے پہ آمادہ ہے۔ اسی لیے تمہیں اعتراض تھا نا مجھ پہ کیونکہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ۔"

اس کی بات وہیں نامکمل چھوڑ دی تھی۔ اب وہ دوسری طرف منہ کیے اپنی گھٹی گھٹی سسکیوں کو منہ پہ ہاتھ رکھ کر دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

موحد جوابا بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اس سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی وہ اس کے چند جملے اس نے دل پہ یوں ثبت کر لیے تھے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے یوں تکلیف دیتے ہوں گے۔

موحد اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے ایک طرف بنے بینچ کی طرف لے آیا جہاں پہ اکا دکا لوگ ہی موجود تھے۔

عشوہ سر جھکائے روتی رہی۔ ایسی صورت حال کم ہی آئی تھی جب عشوہ موحد کے سامنے آنسوؤں سے روتی۔ وہ بچپن سے حساس دل ضرور تھی لیکن کمزور نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے کسی کے سامنے رونے بیٹھ جاتی۔ ایسا بہت کم ہوا تھا۔ شاید اتنا کم کہ موحد گن کر تعداد بتا سکتا تھا۔ اسی لیے ایسی صورت حال نے اسے بھی عجب کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"ایسا کیا ہوا ہے کہ تم سے میرا ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں ہوا۔؟" وہ بچپن سے اس کے ساتھ تھا۔ اس کی ہر ادا پہچانتا تھا۔ کچھ تو ایسا تھا جو اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔

"میں جیسی ہوں ویسے ہی مجھے قبول کیوں نہیں کیا جا سکتا موحد۔۔؟ کیا میں نے کوئی شرط رکھی کہ میرا منگیتر سگریٹ پیتا ہے تو وہ چھوڑ دے۔ اس کا غصہ تیز ہے تو وہ خود کو بدلے۔ اسے شلوار قمیص نہیں پسند لیکن وہ میرے لیے لازمی اسے اپنائے۔ اسے قہقہہ لگانا غیر مہذب لگتا ہے تو تھوڑا سا غیر مہذب بن جائے۔ وہ دہی نہیں کھاتا تو اب اسے کھانے کی عادت اپنائے۔ اسے موویز دیکھنا پسند نہیں ہے تو اب دیکھنے کی مشق کرے۔ نہیں نا۔؟ تو پھر مجھ پہ اتنے اعتراضات کیوں یار۔؟ مجھے کیوں میری شناخت سمیت قبول نہیں کیا جا رہا۔ مجھ پہ کیوں اتنی تبدیلیوں کی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ میں یہ یہ یہ "چھوڑ دوں اور" یہ یہ یہ "اپنا لوں۔ میں جیسی ہوں ویسی کیوں ناقابل قبول ہوں اور آخر مجھے کتنا اور کس حد تک خود کو بدلنا پڑے گا۔ کیا مجھے خود کو ایک بار پوری طرح سے توڑ کر جوڑنا ہو گا۔ ایک بار مٹا کر پھر سے اپنا وجود بنانا ہو گا۔ کیوں بھلا۔؟ اس لیے کہ میں ایک لڑکی ہوں اور وہ لڑکا ہے۔؟"

"تم یہ شادی نہیں کرنا چاہتیں تو منع کر دو۔ کوئی زبردستی تو نہیں ہے۔"

"لڑکیوں کے لیے زبردستی اور طرح کی ہوتی ہے موحد۔ مما کہتی ہیں کہ معیز بھائی برا مانیں گے۔ عدنان کے بڑے بھائی کامران اور معیز بھائی کولیگز ہیں۔ یہاں تک بات پہنچ گئی ہے، اب انکار کرنا تعلقات خراب کرنا ہو گا اور ایک جاب میں تعلقات خراب کرنا معیز بھائی افورڈ نہیں کر سکتے۔" موحد نے تاسف سے سر ہلایا۔

"کسی دوسرے سے تعلق خراب نہ ہو اور بے شک تمہاری زندگی خراب ہو جائے۔" اسے معیز بھائی پہ نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔

"میری زندگی خراب کرنے میں بس معیز بھائی کا ہاتھ تو نہیں ہے۔ اور بھی کئی ہاتھ ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ موحد اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اس کے حوالے سے سمجھ رہا تھا لیکن اس پہ اپنی رائے محفوظ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

عشوہ نے بات، لہجہ اور رخ سب ہی بدل لیے۔

"اب مما کہتی ہیں کہ میں تمہارے ساتھ یہاں آئی ہوں، اس بات کا پتا میری ہونے والی سسرال میں نہ چلے۔ مطلب کہ آگے چل کر انھیں ہماری دوستی پہ بھی اعتراض ہو گا۔ تو میری زندگی میں پھر کیا رہا۔؟ انسان شادی خوشی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے نہ کہ پہلے سے حاصل خوشیوں کو بھی کھونے کے لیے۔"

موحد خاموش رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ جس ٹرپ کو وہ انجوائے کرنے آئے تھے، وہ عشوہ کے خراب موڈ کی نذر ہو رہا تھا۔

"لیکن میں کیا چاہتی ہوں، میری کیا خواہش ہے۔ میں کیسے جینا چاہتی ہوں اس بات کی تو شاید کسی کو بھی پروا نہیں ہے۔" موحد نے اپنی سوچ کو ایک طرف رکھتے اسے دیکھا۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"اچھا ابھی تو چپ کرو۔ ہم یہاں گھومنے پھرنے، انجوائے منٹ کے لیے آئے ہیں۔ ابھی تو اس ٹرپ کا مزہ خراب نہیں ہونا چاہیے۔ واپس جا کر کچھ کرتے ہیں۔"

اس نے اپنے سویٹر کی جیب سے ٹشو نکال کر اس کی جانب بڑھائے۔ عشوہ نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ کچھ دیر گہرے سانس لیے اور خود کو نارمل کیا۔ تازہ ہوا جیسے ہی اندر گئی، اس کا ڈپریشن باہر آ گیا۔ اب وہ کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"چلو اب۔ یہاں سے واک کر کے پنڈی پوائنٹ تک چلتے ہیں۔"

"سوچ لو۔ اتنا چلوگی تو ٹانگوں میں کھلیاں پڑ جائیں گی اور کل تو تم سے بیڈ سے اترا بھی نہیں جائے گا جب باس سے ملنے جانا ہوگا۔" عشوہ اسے پیچھے سے دھکیلتے ہوئے آگے چلنے لگی اور وہ مسلسل بولتے چلا گیا۔

"اور میرا پلان کل پتہ چل جانے کا ہے۔ بہت بچپن میں چیئر لفٹ میں بیٹھا تھا۔ اب پھر سے بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تو امی نے جھوٹ بول کر کرایہ بچا لیا تھا کہ یہ پانچ سال سے کم عمر ہے۔ اب تو پورا کرایہ دینا پڑے گا مجھے اور میں تو یوں بھی آج کل بے روزگار ہوں یار۔ ایسا کرنا، میرا کرایہ تم ہی دے دینا۔ اب کیا اچھا لگے گا کہ بے روزگار بے چارا کرایہ بھرے جبکہ اس کی لاکھوں کمانے والی دوست اس کے ساتھ ہو۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور اڑتے بادل ان کے اردگرد سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆

کرنل رمیض اور نعمان مرزا کے ہمیشہ سے خاندانی مراسم رہے تھے۔ کرنل صاحب کے ابا اور نعمان مرزا کے ابا شطرنج کھیلنے روزانہ شام کو اکٹھے ہوتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب کرنل رمیض کی پوسٹنگ گلگت میں تھی اور اپنی فیملی کو وہ ابا کے پاس ہی لاہور چھوڑ گئے تھے۔ اس وقت ساتھ

والا گھر نعمان صاحب نے خریدا تھا اور تب سے دونوں خاندانوں میں جو تعلقات استوار ہوئے تو وہ ان کی نسلوں میں بھی قائم رہے۔ خاص طور سے عشوہ رمیض اور موحد مرزا کی دوستی تو مثالی تھی۔

جب بچپن میں عشوہ کھانا نہیں کھاتی تھی تو ماما اسے آنٹی بتول کے پاس لے جاتیں۔

"بھابھی! آپ اسے موحد کے ساتھ کھانے کی میز پہ بٹھا دینا۔ شاید یہ اسی کے ساتھ مل کر چار نوالے کھا لے۔"

اور بتول آنٹی اسے محبت سے گلے لگا کر موحد کے ساتھ کھانا کھانے بٹھا دیتیں۔ موحد کے ساتھ بیٹھنے کی دیر ہوتی کہ عشوہ پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتی۔ یہی حال موحد کا بھی تھا۔ جب وہ گھر پہ کچھ کھا کر نہ دیتا تو بتول آنٹی اسے عشوہ کے گھر بھیج دیتیں۔ یوں دونوں مل کر کھانا کھا لیتے۔ یوں دن بھر ان کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا ہی رہتا۔

موحد اپنے گھر کے ساتھ ساتھ اس گھر کا بھی لاڈلا تھا اور عشوہ اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے اپنے گھر کے ساتھ مرزا فیملی کی بھی لاڈلی بن گئی۔ ادیبہ باجی موحد کی بڑی بہن تھیں اور انھیں چھوٹی بہن کا بہت شوق تھا۔ قدرت نے چھوٹی بہن تو نہ دی، بھائی ہی دیا تو وہ اسی کو سجا سنوار کر خوش ہو لیتیں۔ پھر تھوڑا بڑا ہوا تو اسے غیرت آ گئی کہ میں لڑکا ہوں اور مجھے لڑکیوں کی طرح تیار نہیں ہوا کرتے تو ادیبہ باجی نے عشوہ کو بہن بنا لیا۔ وہ اس کی جتنی لیپا پوتی کرتیں، اتنی ہی وہ سجنے سنورنے سے چڑنے لگی۔ حتیٰ کہ جب ادیبہ اسے بلاتیں تو وہ سب چھوڑ چھاڑ گھر بھاگ جاتی۔

وہ دونوں اسکول بھی اکٹھے ہی داخل ہوئے تھے۔ گھر میں بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے عشوہ ہمیشہ بھائیوں کے زیر اثر رہی تھی۔ ان ہی کی طرح اٹھنا بیٹھنا، بولنا چلنا، کھانا پینا۔ رہی سہی کسر موحد کے ساتھ کھیلنے سے پوری ہوگئی۔ بچپن میں تو وہ "میں آئی، میں کھائی، میں جاؤں" کہ بجائے "میں آیا، میں

کھاتا، میں جاتا" استعمال کرتی تھی جو وقت کے ساتھ پھر بھی ٹھیک ہو گیا لیکن اس نے اپنا حلیہ نہیں تبدیل کیا۔

اسکول میں موحد ہر مقام پر اس کی ڈھال بن جاتا۔ اسے کوئی مسئلہ ہوتا، موحد اس کی مدد کو حاضر ہوتا۔

زندگی اسی لاڈ پیار میں گزر رہی تھی کہ ایک دن جب عشوہ اسکول سے واپس آئی تو معیز بھائی، جو ان ہی دنوں پی ایم اے سے چھوٹ کر آئے تھے، اونچا اونچا بول رہے تھے۔ عشوہ چھوٹی تھی اسی لیے اس گفتگو کا حوالہ و متن نہیں سمجھ سکی لیکن اسے بس اتنا یاد تھا کہ معیز بھائی غصے میں ماما کے سامنے چلا رہے تھے۔ کرسی کو ٹانگ سے پرے دھکیل کر وہ اندر جاتے جاتے اسے بھی تنبیہہ کر گئے۔

"آئندہ کوئی ضرورت نہیں ہے اسے بھی برابر والوں کے گھر جانے کی۔"

وہ نا سمجھی میں ماما کو دیکھنے لگی جو سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھیں لیکن اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ پھر اس دن کے بعد سے معیز بھائی بہت چڑچڑے ہوگئے۔ وہ بات بات پہ چلانے لگتے تھے اور جب خاموش ہوتے تو اتنے خاموش ہوتے کہ کسی بھی بات کا جواب نہ دیتے۔ ان کا یہ رویہ انتہا پہ تھا جو اس کی چھوٹی سی عقل میں نہیں سماتا تھا۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ گھر آنے پہ ادیبہ باجی سے ملنے جایا کرتے تھے جو ان کی اچھی دوست تھیں۔ جیسے موحد اور وہ ساتھ کھیل کر بڑے ہو رہے تھے۔ ماما بتاتی تھیں کہ معیز بھائی اور ادیبہ باجی بھی ایسے ہی ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔

"ماما! معیز بھائی کو کیا ہوا ہے۔ وہ ایسے کیوں ہوگئے ہیں۔؟" وہ اکثر جب موحد کے ساتھ کھیل رہی ہوتی تو وہ انھیں بلاوجہ ڈانٹ دیتے۔ موحد پہ غصہ کر کے اسے وہاں سے بھگا دیتے۔

"وہ ٹھیک ہے بیٹا! شاید تھک جاتا ہے۔ مشکل نوکری ہے نا اس کی۔"

"موحد کہتا ہے کہ بھائی جان جب سے فوجی بنے ہیں، ان کے نخرے زیادہ ہوگئے ہیں۔" ماما اس کی بات سن کر گنگ رہ گئیں۔ ایک چھوٹے بچے سے وہ ایسی بات کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔

"موحد کو سمجھایا کرو کہ ایسی باتیں بچے نہیں کرتے۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائیں کہ عشوہ بھی تو بچی تھی پھر وہ اسے کیسے سمجھاتی۔ عشوہ نے سر ہلا دیا لیکن معیز بھائی کا غصہ اور چڑچڑا پن دن بدن زیادہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اسی لیے عشوہ کھیلنے کے لیے چھپ کر مرزا ہاؤس چلی جاتی لیکن موحد نے آنا ترک کر دیا تھا۔

"مجھے بھیا سے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ بہت خوف ناک ہوگئے ہیں۔ کسی بات پہ بھی مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔ مجھے ڈانٹنے کے لیے مام اور بابا ہی کافی ہیں۔ دوسروں کے بھائیوں سے ڈانٹ کیوں کھاؤں۔؟"

وہ ان کے گھر آنے سے صاف منع کر دیتا۔ دونوں باہر سڑک پہ کھیل لیا کرتے یا عشوہ ان کے گھر پائی جاتی لیکن موحد نے ان کی طرف آنا چھوڑ دیا تھا۔

تب ہی ادیبہ باجی کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی اور انھی دنوں معیز بھائی کی ملتان پوسٹنگ آ گئی۔

"شادی میں شرکت نہیں کرو گے۔؟" ماما نے پوچھا تو انھوں نے زخمی نگاہوں سے انھیں دیکھا۔

"فوجی ہوں لیکن ہوں تو انسان۔ جذبات مرے نہیں ہیں میرے۔"

اپنا سامان پیک کرتے انھوں نے ہر وہ چیز جو ادیبہ سے منسلک ان کے پاس موجود تھی، کوڑے دان کے حوالے کر دی۔

معیز بھائی کے جانے کی دیر تھی کہ موحد اور عشوہ کا پھر سے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا پہلے جیسا ہو گیا۔

☆☆☆

"انار کے درخت سے انار کس نے چوری کیے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہیں۔؟" ایسے ہی ایک دن جب موحد عشوہ کے باغ میں لگے انار کے درخت سے عشوہ کی فرمائش پہ انار اتار کر سیڑھیوں پہ بیٹھا دانے نکال کر اسے دے رہا تھا تو اندرونی حصے سے معیز بھائی کی گھن گرج سنائی دی۔ موحد نہیں جانتا تھا کہ وہ چھٹی پہ گھر آئے ہوئے ہیں اور عشوہ اسے بتانا بھول گئی تھی۔ اس نے گھور کر عشوہ کو دیکھا جس نے معصومیت سے شانے اچکائے کہ وہ بتانا بھول گئی تھی۔

وہ معیز بھائی کی موجودگی کے سبب اندر سے سہم گیا تھا۔ وہ مسلسل چلا رہے تھے۔

"معیز بھائی آئے ہوئے ہیں، تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔"

"میں خود بھی بھول گئی تھی کیونکہ وہ رات ہی آئے تھے جب میں سو چکی تھی۔" عشوہ کو اپنی غلطی کا احساس تب ہوا جب اس نے موحد کا فق ہوتا چہرہ دیکھا۔

"اتنے سارے پکے انار تھے اس درخت پہ جو چوری ہو گئے۔ سب مر گئے ہیں جو چور کو دیکھ نہیں سکے۔ کسی کی مجال کیسے ہوئی کہ گھر میں گھس کر انار اتار کر چلا گیا۔"

وہ بھائیوں پہ چلا رہے تھے۔ بھائی خاموش کھڑے ڈانٹ سن رہے تھے۔ ان کی مجال نہیں تھی کہ معیز بھائی کے آگے زبان کھول سکیں۔

موحد چوری کا الزام لگنے سے مزید ڈر گیا تھا حالانکہ اس کے مطابق یہ چوری نہیں تھی۔ اس نے عشوہ کے باغ سے، اس کی اجازت سے انار توڑ کر خود کھانے کے ساتھ اسے بھی کھلائے تھے۔ پھر یہ چوری کیسے ہوگئی۔؟ لیکن معیز بھائی کے بقول وہ چور تھا۔۔۔ انار چور۔۔۔ اور اس الزام کے بعد ایک دانا اس کے حلق سے نیچے نہیں اتارا گیا۔

"چلو اندر۔" اس نے عشوہ کا ہاتھ تھاما جو اسے روک رہی تھی کہ وہ اندر مت جائے۔

"چلو عشوہ! انہیں لگ رہا ہے کہ کسی نے انار چرائے ہیں۔ میں ان کو سچ بتانا چاہتا ہوں۔" وہ عشوہ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

"انار ہم نے اتارے ہیں معیز بھائی۔" وہ عشوہ سے پہلے ان کے سامنے جا پہنچا تھا۔ ہاتھ میں ٹرے تھام رکھی تھی جس میں انار کے دانے اور انار موجود تھے۔ معیز بھائی جو غصے سے بھرے بیٹھے تھے، اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر ٹرے اس کے ہاتھ سے کھینچ کر ایک طرف دیوار پہ دے ماری۔ بھائیوں اور عشوہ سمیت موحد کا بھی دل جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آیا۔

مما اندر سے بھاگی آئیں اور فرش پہ ٹوٹی ٹرے، بکھرے انار دیکھ کر حق دق رہ گئیں۔ معیز نے اتنا شدید ردعمل کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ مجھ سے پوچھے بغیر میرے درخت سے انار چوری کرو۔ میں نے کتنے سال اس پودے کے ساتھ محنت کی ہے جانتے بھی ہو۔ یہ اس درخت کا پہلا پھل تھا جو مجھے کسی اولاد کی طرح عزیز تھا اور تم ایک پل میں آ کر مزے سے کسی کی محنت کو اتار کر لے گئے۔"

"موحد نے میرے کہنے پہ ہی مجھے انار اتار کر دیے ہیں کیونکہ مجھے انہیں کھانا تھا اور یہ انار میرے گھر میں لگے ہیں تو میں تو کھا سکتی ہوں نا۔ یا میں بھی چور ہوں۔؟" وہ جھٹ سے آگے بڑھی تھی۔ اس کی بات پہ معیز بھائی کا غصہ ایسے ٹھنڈا پڑا جیسے جلتے کوئلوں پہ پانی کا ڈول آ گرا ہو۔

"چلو یہاں سے۔" عشوہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے گھسیٹ کر لے گئی۔ وہ بالکل ساکت سا اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا تھا۔

"وہ مجھے چور کیسے کہہ سکتے ہیں۔؟ میں نے تمہارے کہنے پہ، تم سے پوچھ کر تمہارے گھر کا پھل توڑا تھا۔" اسے لفظ "چور" اپنے لیے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"انہیں نہیں پتا تھا کہ ہم نے انار توڑے ہیں موحد اور نہ وہ ایسے نہ کہتے۔ جب انہیں پتا چلا تو انہوں نے ہمیں جانے دیا۔"

"انہیں جب یہ پتا لگا کہ تم میرے ساتھ تھیں تو انہوں نے ہمیں جانے دیا ورنہ چوری کی سزا میری سزا ہوتی۔۔۔ اگر تم اس میں شامل نہ ہوتیں تو میں چور ہی تھا عشوہ۔" عشوہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات اسے سمجھائے۔

"وہ ایک غلط فہمی تھی موحد اور نہ ایسا نہ ہوتا۔" عشوہ کو بھی بھائی سے ایسی حرکت کی توقع کہاں تھی اس کے پاس صفائی کے لیے الفاظ کم پڑ گئے تھے۔

"ایسا ہی ہوتا عشوہ۔ کیونکہ انہیں مجھے ڈانٹنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔" عشوہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وہ تمہیں کیوں ڈانٹیں گے۔؟"

"کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ مجھے ڈانٹنے اور بے عزت کرنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔" وہ جانتا تھا کہ معیز بھائی اسے ذاتی طور پہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس ناپسندیدگی کے پیچھے کی وجہ اس کی ادیبہ باجی تھیں جن کے لیے معیز بھائی نے پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوتے ہی رشتہ بھیجا تھا۔ وہ ان کی بچپن سے دوست تھیں اور اسی دوستی کو وہ پسندیدگی میں بدل چکے تھے۔

ادیبہ باجی بچپن سے ہی اپنے پھپھی زاد سے منسوب تھیں، منسوب کیا تھیں، پھپھو نے زبردستی انہیں اپنی بہو مشہور کر رکھا تھا جس پہ بقول جزبز ہوتی رہتیں لیکن انہیں روک نہیں سکتی تھیں۔ ان کی اسی بات پہ سارا خاندان اس رشتے پہ ایمان لے آیا تھا۔

ادیبہ باجی اپنے نام سے منسوب اس شخص کا نام سن سن کر ان سے اسیت کا شکار ہو چکی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے بقول آنٹی کو کہہ کر انکار کہلوا دیا گیا جس سے معیز بھائی کی انا پہ کاری ضرب پڑی تھی۔ اس دن کے بعد سے معیز بھائی ان کی پوری فیملی سے بغض پالے ہوئے تھے جس کا سب سے زیادہ شکار موحد ہوتا تھا کیونکہ وہ سب سے زیادہ ان کے گھر آتا جاتا تھا۔

☆☆☆

عشوہ اور موحد کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا اور جہاں جہاں جس جس اسکول کالج سے موحد نے پڑھا، عشوہ نے بھی ضد کر کے وہیں داخلہ لیا۔ یہ تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے وقت عشوہ کے نمبرز اتنے اچھے نہیں تھے تو دونوں کی یونیورسٹی الگ ہو گئی۔ مضامین بھی مختلف تھے۔ عشوہ نے ایم بی اے کیا تھا اور موحد نے الیکٹریکل انجینئرنگ لیکن عشوہ کو فوراً ہی جاب مل گئی تھی وہ بھی ایک اچھی پوسٹ پہ اور موحد انٹرن شپ کرنے کے بعد ہنوز بے روزگار تھا۔ جو جاب بھی اس کی فیلڈ کی آتی وہ ضرور ہی اپلائی کرتا، انٹرویو بھی اس کا اچھا ہوتا لیکن اسے رکھا نہیں جاتا تھا۔

"تمہیں تو تمہارے معیز بھائی کی بدولت جاب مل گئی۔ اب ہر کوئی میجر، کرنل کا بہن بھائی یا اولاد نہیں ہوتا نا۔" وہ بھی کبھار اپنی جاب کو لے کر فرسٹریٹ ہو جاتا تو عشوہ پہ چوٹ کر جاتا۔ جواباً عشوہ خاموش ہو جاتی کیونکہ اسے بھلے نوکری اپنی قابلیت پہ ملی تھی لیکن ایک سچ یہ بھی تھا کہ اس کی کمپنی کے سی ای او معیز بھائی کے اسکول اور کالج کے زمانے کے دوست تھے۔

"تو تم بھی معیز بھائی سے تعلقات کو استعمال کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے کوئی پہرے تو نہیں بٹھا رکھے بھائی جان نے۔" وہ اسے یونہی ہلکے پھلکے انداز میں آفر کرتی رہتی لیکن وہ نہیں ماننے والا، وہ یہ بات بھی جانتی تھی۔

"جاب کروں گا تو اپنی قابلیت کے بل بوتے پہ۔ سفارش کی نوکری میں کبھی نہیں کرنے والا۔ اس سے بندے کا سر جھک جاتا ہے اور میں اپنی قابلیت سمیت سر اٹھا کر چلنے والوں میں سے ہوں۔ اور تمہارے بھائی جان کے سامنے تو میں کبھی اپنا سر نہیں جھکنے دوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" اور اس "کچھ بھی ہو جائے" نے بہت کچھ بگاڑ دیا تھا۔

☆☆☆

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عشوہ کا جب پہلا رشتہ آیا تو اس نے مما کے سامنے انکار کر دیا۔

"آپ جانتی ہیں کہ میں یہ یہاں شادی نہیں کرسکتی۔ یہاں کیا میں کہیں بھی اور شادی نہیں کرسکتی مما۔" اس کے مطابق جیسے مما کو الہام ہونا چاہیے تھا کہ وہ موحد کے علاوہ کسی کے بارے میں بھی سوچ نہیں سکتی پھر وہ کیسے کسی کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

"تم کسی کو پسند کرتی ہو عشوہ۔۔۔؟" اس سوال پہ اس نے ماں کو یوں دیکھا جیسے وہ ایسے سوال کی ان سے کبھی توقع نہ کر رہی ہو۔

"آپ جانتی نہیں ہیں مما کہ میں کس کو پسند کرتی ہوں۔۔۔؟" مما جیسے اس کا جواب جانتی تھیں اسی لیے وہ زیادہ حیران نہیں ہوئیں۔

"میں نہیں جانتی۔" وہ اس کے منہ سے سننا چاہتی تھیں۔

"مما! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ جانتی بھی ہیں کہ موحد اور میں ایک دوسرے کو کتنا پسند کرتے ہیں۔"

"کیا موحد نے کبھی ایسا کہا۔۔؟" مما کی بات پہ وہ ہونق بنی انہیں دیکھنے لگی۔

"بولو عشوہ! کیا موحد نے ایسا کبھی کہا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔؟" عشوہ ماں کی بات پہ ہنس دی۔

"اس میں کہنے کی کیا بات ہے، میں جانتی ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ وہ بھلا میرے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔" وہ اس معاملے میں بہت پر اعتماد تھی جس پہ مما نے تاسف سے سر ہلا دیا۔

"وہ سوچ سکتا ہے عشوہ اور شاید وہ سوچتا ہو گا۔ بہتر ہے کہ تم اس سے پہلے یہ بات کنفرم کر لیتیں کیونکہ اس کے خاندان میں یہ تاریخ دہرائی جا سکتی ہے اب ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے۔" اس نے نا سمجھی سے ماں کو دیکھا۔

"کیسی تاریخ۔؟"

"جس جگہ تم کھڑی ہو بہت وہاں تمہارے بھائی جان کھڑے تھے۔ اور جہاں موحد ہے وہاں اور یہ تھی۔ بہت اچھی دوستی اور انڈرسٹینڈنگ تھی دونوں میں لیکن جب معیز نے باقاعدہ رشتہ بھجوایا تو اور یہ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ معیز اور وہ تو بس اچھے دوست تھے۔ وہ معیز کو ایک دوست کے طور پہ بہت پسند کرتی ہے لیکن بطور لائف پارٹنر تو ہمیشہ سے اپنے پھپھی زاد کو پسند کرتی آئی ہے کیونکہ وہ بچپن سے اسی سے منسوب ہے۔" یہ سب عشوہ کے لیے نیا تھا اسی لیے وہ شاکڈ سی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ یکدم معیز بھائی کی ساری ناپسندیدگی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ موحد ٹھیک کہتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ ایک وہی تھی جو سمجھ نہیں پائی۔

"اب وہی سب تم دہرانے کھڑی ہو عشوہ۔ اسی لیے پوچھ رہی ہوں کہ کیا موحد نے کبھی کہا کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ نہیں نا۔؟ تو تم یہ غلط فہمی کیوں پال رہی ہو۔ بہتر ہے کہ تم اس سے کلیئر کر لو۔ ورنہ کل کو وہ بھی اور یہ کی طرح یہ کہہ کر ایک طرف ہو گیا کہ ہم دونوں تو بس دوست تھے تو تمہارا کیا ہو گا۔" عشوہ ساکت رہ گئی۔

مما کی بات نے اسے اندر تک جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ اس رات سو نہیں سکی تھی۔ صبح وہ آفس ضرور چلی گئی لیکن کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہو سکا۔ کئی غلطیاں وہ کام کے دوران کر کے باس سے ڈانٹ سن چکی تھی، غائب دماغی میں دوسروں کا کام غلط کروا چکی تھی۔ اور اس بے کلی اور بے چینی کی کیفیت میں وہ مزید ایک دن بھی نہیں گزار سکتی تھی۔ جو باتیں کل طے ہونا تھیں۔ وہ آج، ابھی کیوں طے نہ کر لی جاتیں۔ اس نے اسی رات موحد سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"کل میرا ایک رشتہ آیا ہے موحد۔" وہ رات کھانے کے بعد کالونی میں ٹہلنے نکلی تھی۔ بیل بجا کر اس نے موحد کو بھی بلا لیا تھا [illegible]

گزر رہے تھے جب عشوہ نے یک دم ذکر کر دیا۔ وہ کسی تمہید میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"مبارک ہو۔ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔؟" اس نے گھور کر موحد کو دیکھا کہ کیا وہ سچ مچ کی مبارک باد دے رہا تھا یا طنز کر رہا تھا لیکن طنز تو کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مکمل سنجیدہ تھا۔

"معیز بھائی کے کولیگ کا بھائی ہے۔ میجر ہے آرمی میں۔"

"معیز بھائی لائے ہیں رشتہ تو پرفیکٹ ہی لائے ہوں گے۔" معیز بھائی کے ذکر سے ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے موحد۔؟"

وہ جو اس سے براہ راست بات کرنے کا سوچ کر نکلی تھی، اب ہمت نہیں کر پا رہی تھی کہ اس سے دوٹوک اپنے ہی رشتے کے بارے میں بات کر سکے۔ ابھی وہ اتنی بھی بولڈ نہیں ہوئی تھی کہ اس سے اپنی اور اس کی شادی کا معاملہ ڈسکس کر سکے۔ آخر کچھ بھی تھا، وہ بھی تو ایک لڑکی ہی تھی۔

"تم بھلا کیا کرو گی اور تم کر بھی کیا سکتی ہو۔ معیز بھائی کو تم انکار کر سکو گی کیا جو تمہارے لیے ہمیشہ بہترین سوچتے ہیں۔ وہ یقیناً ایک بہترین لڑکا ڈھونڈ کر لائے ہوں گے جس کی نوکری بھی شاندار ہے۔" عشوہ کا دل ڈوب گیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ یہ نہیں دیکھ سکی کہ موحد کا لہجہ کچھ عجیب ہوا تھا۔

"کیا بس یہی کچھ بہت ہوتا ہے شادی کے لیے۔؟"

"تو اور کیا ہوتا ہے۔ اب میں اتنا اچھا ہوں لیکن کتنے عرصے سے بے روزگار ہوں تو میری یہ خوبی کس کام کی، جب میری جیب خالی ہے۔ لڑکے کی شکل، عقل سے زیادہ اس کی جیب دیکھی جاتی ہے بالی ڈیئر فرینڈ۔ اور اس دور میں تو بہت زیادہ ہی دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ اچھی ہے تو سمجھو سب اچھا ہے۔ مستقبل محفوظ ہے۔ اور میں کسی لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ شادی تو تب ہی کرنا چاہیے جب آپ کسی کی ذمہ داری اٹھا سکیں۔ ابھی تو میں خود ماں کی طرف دیکھتا ہوں کہ وہ میری ضروریات پوری کریں۔ سو اس دور میں اتنی اچھی جاب والا لڑکا کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔"

عشوہ سے اس بات کو مزید بڑھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ کھل کر نہ کہہ سکی لیکن اسے منع ہی کر رہا تھا۔

"مطلب تم کسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے جب تک کہ تمہیں نوکری نہیں ملے گی۔؟" وہ اس سے جواب چاہتی تھی۔ موحد ہنس دیا۔

"ان فیکٹ کوئی لڑکی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہے گی جب تک کہ میرے پاس نوکری نہیں ہے۔ ایک بے روزگار انسان سے کون پاگل شادی کرنا چاہے گا۔ اور کون ماں باپ اپنی بیٹی کو ایسے بے روزگار کے پلے باندھنا چاہیں گے۔" عشوہ کا دل کیا کہ وہ کہہ دے کہ وہ پاگل میں ہوں جو تم سے ہر قیمت پہ شادی کر سکتی ہے، وہ ماں میری ماں ہوں گی جو ہنسی خوشی تمہارے ہاتھ میں میرا ہاتھ دے دیں گی لیکن وہ نہیں کہہ سکی۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ یہ سب کہنا بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ بچپن سے ہر بات اپنے بہترین دوست سے کہنے والی عشوہ رمیض یہ بات اپنے منہ سے اسے نہیں کہہ سکی۔

موحد کا جواب وہ جان چکی تھی۔ لیکن اب وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ نوکری ملنے کے بعد کیا کرے گا۔ کیا وہ اس سے شادی کرے گا یا نوکری صرف ایک بہانہ ہے جو وہ بیچ میں لا رہا ہے۔ یا جیسا مما نے کہا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے تو بس ایک دوست کے طور پہ پسند کرتا ہے۔ شادی کے لیے پسندیدگی ان کے درمیان کبھی تھی ہی نہیں۔ تو اس "پسند" کے پیمانے کو وہ ناپنا چاہتی تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں اسے بطور لائف پارٹنر پسند آؤں گی۔؟" موحد اسے دیکھے بنا ہنس دیا۔

"ایسے تو تم کسی کو کیا ہی پسند آؤ گی یار۔ ایسے تو تم مجھے بھی پسند نہیں آ سکتیں جو بچپن سے تمہارے ساتھ ہے تو اس بے چارے کا کیا قصور۔؟"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مذاق تھا اور موحد ایسے مذاق کرتا رہتا تھا لیکن عشوہ کو پہلی بار یہ مذاق سچ لگا تھا اور اتنی بری طرح لگا تھا کہ وہ مل کر رہ گئی تھی۔

"ہم بچپن سے ساتھ ہیں، تب بھی تم میرے اس حلیے کو قبول نہیں کر سکے؟ تم مجھے پسند نہیں کرتے اپنے لیے۔"

اسے لگا وہ رو دے گی۔ وہ دنیا کے منہ سے اپنے اوپر ہزار باتیں سن سکتی تھی، ہمیشہ سنتی بھی رہی تھی لیکن وہ اس کے منہ سے ایسے الفاظ سنے گی، اس بات کا اسے گمان نہیں تھا۔

"کیوں نہیں کرتا۔ تم دوست ہو میری۔ اور جب کسی سے دوستی کی جاتی ہے تو اس کی خامیوں خوبیوں سمیت اسے قبول کیا جاتا ہے لیکن یہاں میں نے اپنی چوائس کی بات کی ہے۔"

تو واضح ہو گیا کہ چوائس اور دوستی میں فرق ہے۔ دوست اور جیون ساتھی مختلف رشتے تھے۔ موحد اس سے محبت نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ نام بوائے قسم کی لڑکی تھی۔ وہ اس کے معیار کے مطابق نہیں تھی۔ وہ اس معیار پہ پوری نہیں اتری جو اس نے اپنی بیوی کے لیے سوچ رکھا تھا۔ وہ شخص دوست تھی اور دوست کسی بھی طرح کے ہوں، اچھے لگ سکتے ہیں۔ لائف پارٹنر نہیں۔

"تو مجھے ہاں کر دینی چاہیے؟" موحد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ عشوہ کو لگا تھا کہ وہ اس کے جواب کی تاب نہیں لا سکے گی۔ وہ نظریں چرا گیا اور اس کا یہ نظریں چرانا عشوہ سے چھپا نہیں رہ سکا۔ جواب تو مل چکا تھا۔ اب وہ جواب دیتا نہ دیتا۔

"آخر یہ رشتہ معیز بھائی لائے ہیں۔" جب موحد بولا تو اسے اپنا آپ زمین کی تہوں میں اترتا محسوس ہوا۔ حلق میں نمک کا گولا پھنسا۔ اس نے سر ہولے سے اثبات میں ہلا دیا۔ واقعی یہ رشتہ معیز بھائی لائے تھے اور وہ یہ بات بھول گئی تھی کہ موحد کا معیز بھائی سے کینہ دنیا کے ہر تعلق سے اوپر تھا۔

اسے کچھ بھی کہے بناوہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ مزید کھڑی رہتی تو نمک کی ڈلی بن کر اس کے سامنے گھل جاتی۔

موحد نے اسے جاتا دیکھا اور اپنی آنکھیں کرب سے بند کر لیں۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ اس سے اتنی دیر سے کیا جاننا چاہ رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا جواب وہ دے چکا تھا۔

اگلے دن ہی عشوہ نے بنا مزید وقت ضائع کیے مما کو رشتے کے لیے "اوکے" کہہ دیا تھا۔

"تم نے موحد سے بات کی۔۔۔؟" وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ اس کے مان جانے پہ خوش ہوں یا اس کے دل ٹوٹ جانے پہ ماتم کریں۔

"آپ نے ہی تو کہا تھا مما کہ اس خاندان کی تاریخ ہے دوستوں کو بس دوست ماننا اور محبت تک آنے ہی نہ دینا۔"

مما اس کی متورم آنکھیں دیکھ کر کافی کچھ جان گئیں۔ موحد نے بھی وہی کیا تھا جو ادیبہ کر چکی تھی۔ اس کے پاس معیز کو رد کرنے کے لیے اس کا کزن وجہ تھی پہ موحد کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔

ایک سرد آہ بھر کر اپنا محبت بھرا ہاتھ اس کے سر پہ دھر کر وہ چلی گئیں۔

☆☆☆

لڑکے والوں کی طرف سے جب باقاعدہ رشتہ طے ہونا تھا تو ان کی طرف سے فون کیا گیا تھا کہ لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھ لینا بہتر ہے۔ مما کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"موحد شام میں تم ضرور آنا بیٹا۔ تمہاری بیسٹ فرینڈ کی بات پکی ہونے جا رہی ہے۔"

صبح ہی مما سے کیک سیٹ کی سینٹرل پلیٹ ٹوٹ گئی تھی۔ اب اتنی جلدی میں وہ بتول آنٹی سے ہی ادھار کر سکتی تھیں۔ جب سیٹ لینے گئیں تو واپسی پہ لاؤنج میں ہونے پہ لیٹے موحد کو بھی مدعو کیا۔

مما کی بات پہ وہ اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔

"بات پکی ہونے جا رہی ہے۔۔؟ آخر اتنی جلدی کیا تھی آپ کو آنٹی۔ تھوڑا انتظار تو کر لیتیں۔"

"کس بات کا انتظار بیٹا۔۔؟" ان کے سوال نے موحد کو چپ لگا دی تھی۔ اس کے پاس واقعی اپنے کہے جملے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ انھیں کس بات کا انتظار کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"جب رشتہ اچھا ہو تو لڑکی کو خواہ مخواہ گھر بٹھانے کی میں قائل نہیں ہوں۔" بتول آنٹی ان کی بات پہ زبردستی مسکرا دیں۔ ان کی مسکراہٹ ایک دم پھیکی تھی۔ وہ عشوہ کو موحد کے حوالے سے کتنا چاہتی تھیں، یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا لیکن موحد کے بے روزگار ہونے کی وجہ سے وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ کس بنیاد پہ وہ رشتے کی بات چلاتیں۔ سال سے زیادہ ہو چکا تھا اسے گھر بیٹھے اور نوکری ڈھونڈتے۔

"تم شام میں ٹائم سے آ جانا۔ چھ بجے تک وہ لوگ پہنچ جائیں گے۔" موحد نے سر ہلا دیا۔

"انھوں نے ادیبہ کا بدلہ لیا ہے۔" اسوہ کے جانے کی دیر تھی کہ بتول آنٹی بولے بنا رہ نہیں سکیں۔ موحد چونکا۔

"کون سا بدلہ۔۔؟"

"ادیبہ نے معیز کے رشتے سے انکار کیا تھا اسی لیے وہ عشوہ کے لیے تمہارے رشتے سے انکار کر رہی ہیں۔"

"واٹ۔۔؟" وہ اپنی جگہ سے اچھلا۔

"یہ کس نے کہا کہ انھوں نے میرے رشتے سے انکار کیا ہے۔ میرا رشتہ گیا ہی کب ہے ماما کہ وہ انکار کرتیں۔۔؟" "ادیبہ باجی نے معیز بھائی کے لیے انکار کیا تھا یہ بات اسے کچھ عرصے پہلے ہی معلوم ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات تو وہ تھی جو ماما کہہ رہی تھیں۔

"میں نے ایک بار اشاروں میں اظہار کیا تھا۔ اتنی نا سمجھ تو نہیں ہیں اسوہ کہ میری بات سمجھ نہ سکی ہوں۔ جب میں اشارہ دے چکی تھی تو کیا ضرورت تھی اتنی جلدی دکھانے کی۔ کچھ عرصہ انتظار کر لیتیں۔ لگ ہی جاتی تمہاری نوکری بھی۔ لیکن انھوں نے اتنے سالوں پرانا بدلہ جو لینا تھا۔ اسی لیے آنا فاناً عشوہ کی بات پکی کر رہی ہیں۔"

بتول آنٹی کو بہت گلہ تھا۔ وہ غصے سے کھول رہی تھیں۔ موحد نے تاسف سے سر ہلایا۔

"ماما! ایسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔ ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔ اور ضروری نہیں ہے کہ دوستیاں رشتے داریوں میں بدل جائیں۔ ویسے بھی عشوہ مجھے اس رشتے کے بارے میں پہلے سے بتا چکی تھی۔ میری رائے بھی مانگی تھی اس نے۔ میں نے ہی کہا تھا کہ وہ "ہاں" کر دے کیونکہ لڑکے کی جاب بہت اچھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ رشتہ معیز بھائی کے توسط سے ہو رہا ہے۔ پھر وہ لوگ کیسے انکار کر سکتے ہیں۔"

کرنل رمیض کی وفات کے بعد سے اس گھر کا کرتا دھرتا معیز ہی تھا اسی لیے اسوہ وہی کچھ کرتیں جو معیز کہتا تھا۔

"تو تم پسند نہیں کرتے عشوہ کو۔۔؟" ماما کو اور کوئی بات سمجھ میں آئی ہو یا نہ آئی ہو، یہ ضرور آئی تھی کہ ان کا بیٹا خوش دلی سے عشوہ کو شادی کے لیے ہاں کرنے کا کہہ چکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے اس فیصلے پہ حیران سے زیادہ پریشان تھیں۔

"پسند کیوں نہیں کرتا۔ دوست ہے وہ میری۔ ان فیکٹ بیسٹ فرینڈ ہے لیکن اس کا مطلب اب یہ تو نہیں ہے کہ شادی بھی کر لوں اس سے۔ شادی کے لیے جیسی لڑکی چاہیے ہوتی ہے عشوہ ویسی نہیں ہے ماما۔"

"کیا کمی ہے اس میں۔۔؟" انھیں موحد پر غصہ آ رہا تھا ایسا ہی غصہ بہت سال پہلے ادیبہ کی کم عقلی پہ آیا تھا۔

"اس کا حلیہ دیکھا ہے آپ نے۔۔؟" انھوں نے اس کے جواب پہ سر تھام لیا۔

"موحد! حلیے بدل جایا کرتے ہیں۔ اور لڑکیاں تو شادی کے بعد سر تا پا بدل جاتی ہیں۔ زندگی حلیوں کے بل بوتے پہ تھوڑا گزاری جاتی ہے۔۔

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

۔۔۔ بھی تو سوچو کہ اتنی پرانی دوستی ہے تم دونوں کی۔ کتنا سمجھتے ہو تم دونوں ایک دوسرے کو۔ کتنی عادت ہے تم دونوں کو ایک دوسرے کی۔ کیسے رہو گے اس کے بغیر جب اس کی شادی ہو جائے گی تو۔ یہ نہیں سوچا تم نے۔ اور سوچا بھی تو بس یہ کہ اس کا حلیہ ایسا ہے۔ ارے عقل مند! تم نے اس کے اور اپنے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔" وہ چپ چاپ اب ماں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ وہ انھیں اپنی مجبوری نہیں سمجھا سکتا تھا۔

☆☆☆

شام میں وہ تیار ہو کر جب رسیفی ہاؤس پہنچا تو معیز بھائی بھی وہیں موجود تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے وہ فون پہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ اسے دیکھا ان دیکھا کر دیا۔ وہ بھی دل میں شکر ادا کرتا، چپ چاپ جان بچا کر کچن کی طرف چلا گیا جہاں اسوہ کھانے کے انتظامات دیکھ رہی تھیں۔

"شکر ہے وقت پر آگئے۔ اوپر چلے جاؤ بیٹا۔ عشوہ کمرے میں ہی ہے۔ ابھی ان سے بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی بس پہنچ ہی رہے ہیں۔"

وہ سر ہلاتا اوپر عشوہ کے کمرے میں چلا گیا۔ دستک دے کر وہ اندر داخل ہوا تو وہ بیڈ پہ عام حلیے میں بیٹھی ہوئی سرخ ناک سے سوں سوں کر رہی تھی۔ یقیناً وہ اس کے آنے سے پہلے رونے کا کام ہی کر رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ یہ شکل پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں۔"

اس کا حلیہ گھر والے حلیے سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ پہ شارٹ فراک پہنے اس نے گلے میں ایک چھوٹا سا اسٹول بھی اوڑھ رکھا تھا۔ بالوں کو اس نے اسی طرح اونچی سی پونی میں مقید کر رکھا تھا اور کسی بھی قسم کے میک اپ سے بے نیاز وہ ہمیشہ کی طرح معصوم سی لگ رہی تھی۔

"مجھ سے میک اپ ٹھیک نہیں ہوتا اور مما کہہ کر گئی تھیں کہ کچھ لگا لینا منہ پہ۔۔۔ بھابھی آئی نہیں ہیں سیالکوٹ سے اور ادیبہ باجی بھی یہاں نہیں ہیں ورنہ وہی کچھ لیپا پوتی کر دیتیں۔"

"کہو تو میں ٹرائی کروں۔؟" اس کے ڈریسنگ پہ سرسری سی نظر ڈال کر اس نے مطلوبہ میک اپ کا سامان ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس کے ڈریسنگ پہ میک اپ کا کیا کام تھا۔

"مجھے انسان دکھنا ہے، کارٹون نہیں۔"

"اس سے زیادہ انسان بنا دوں گا۔ اور بے فکر رہو جتنا کارٹون تم ہو اس سے زیادہ دکھنے کا مزید کوئی امکان ہے بھی نہیں۔" اس کی بات پہ عشوہ کے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ وہ ایسی روندو لڑکی بھی نہیں رہی تھی جیسے اب رو رہی تھی۔ موحد کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

"کیا ہو گیا بھئی۔ مذاق تھا۔ یقین جانو، سراسر مذاق تھا۔ لیکن تم ان دنوں بالکل کوئی مذاق سمجھنے کے قابل نہیں رہیں۔" اپنے سر پہ چپت لگاتے اس نے آئندہ مذاق کرنے سے توبہ کر لی۔

"تم نہیں تیار ہونا چاہتی تو مت ہو۔ ایسے بھی ٹھیک بلکہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہو۔ آنٹی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا اگر تم ایسے ہی چلی گئیں تو۔ بس ایک کام کرو کہ اپنے کوئی چھوٹے موٹے ٹاپس نکال کر کانوں میں پہنو اور گلے میں کوئی چین شین ڈال لو۔ پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں ساتھ کہہ دوں گا کہ ہماری لڑکی سادہ ہی ہے۔ میک اپ نہیں کرتی۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے خاموش کروائے۔ عشوہ سوں سوں کرتی ٹشو ناک سے رگڑتی رہی اور وہ نیچے کشن پہ بیٹھا، ڈبہ گود میں رکھے، بار بار اسے ٹشو نکال کر دیتا رہا۔

"بس شادی کی بات ہوئی نہیں اور تم لڑکیوں کے آنسو بہنے لگ جاتے ہیں۔"

"ہاں تو سب کو چھوڑ کر جانا بھی تو ہمیں ہی ہوتا ہے۔ تم لڑکوں کو نہیں۔ کبھی چھوڑنا پڑے تو پوچھوں

سے۔"

اتنے میں نیچے گاڑیوں کے رکنے اور دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ وہ ایک جست میں کھڑا ہوا۔

"آ گئے ہیں وہ لوگ۔" موحد عشوہ کو وہیں چھوڑ کر کھڑکی کے پردے ذرا سے سرکا کر نیچے دیکھنے لگا۔

ایک آنٹی گاڑی کی پچھلی نشست سے اور اگلی نشست سے ایک سادہ سے انکل برآمد ہوئے۔ آنٹی کے ساتھ ہی ایک بارعب سی شخصیت والے صاحب بھی باہر نکلے تھے جو یقیناً معیز بھائی کے کولیگ تھے کیونکہ معیز بھائی بڑے پرتپاک سے ان سے مل رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ سے جو لڑکا برآمد ہوا تھا، وہ یقیناً "لڑکا" ہی تھا جو قدرے اونچا لمبا اور سانولی رنگت کا عام سے نقوش کا حامل تھا۔

"یہ تو کسی کو رلے سے کم نہیں۔" عشوہ اس کے کاندھے سے جھانک کر نیچے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ان کی شکلوں پہ لکھا ہے کہ یہ رشتہ طے کرنے کی غرض سے ہی آئے ہیں۔"

"تو تمہیں اعتراض ہے کیا۔؟" وہ پلٹ کر ڈریسنگ کی طرف چلی گئی۔

"میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا۔؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ معیز بھائی کے سامنے تمہیں بھی کوئی اعتراض نہیں کرنے دیا جائے گا۔"

عشوہ نے اسے کچھ شاکی نظروں سے گھورا تو اس نے شانے اچکائے۔

"وہی ہوتا ہے۔ جو معیز بھائی چاہتے ہیں۔" وہ جتائے بغیر رہ نہیں سکا۔

ان تینوں کی فیلڈ بھی معیز بھائی نے اپنی مرضی سے رکھوائی تھی حالانکہ موئس اور معین اپنی مرضی کے مطابق سی اے اور میڈیکل پڑھنا چاہتے تھے۔ معیز بھائی نے اس وقت بھی خاصی لمبی تقریر جھاڑی تھی کہ معین میڈیکل نہیں پڑھ سکتا اور موئس کا سی اے کرنے کا یارا نہیں ہے۔ پھر ان دونوں نے چپ چاپ اچھا، بیٹا بچے بنتے ہوئے ایم بی اے اور فارمیسی پڑھ لی تھی۔ آج وہ اپنی اپنی فیلڈ میں کامیاب تھے اور انھیں یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کیا پڑھنا چاہتے تھے لیکن موحد کو یہی لگتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے اگر وہ اپنی پسند کے مضامین میں آگے جاتے۔

"معیز بھائی نے کبھی کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کی، نہ ہی کسی پہ ناجائز فیصلے مسلط کیے ہیں۔ وہ پاپا کے بعد اس گھر کے بیٹے ہیں۔ جو سوچتے ہیں، ہم سب کی بہتری کے لیے ہی سوچتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کو، چیزوں کو ہم سے بہتر پرکھتے ہیں، بہتر جانتے ہیں۔" وہ اکثر ہی اس کے سامنے معیز بھائی کی طرف داری کرتی تھی۔ ابھی بھی وہ یہی کر رہی تھی۔

"تو پھر کس بات کی ٹینشن ہے۔ اگر لوگ ٹھیک نہ لگے تو منع کر دینا۔"

"لوگ ٹھیک ہی ہوں گے ورنہ معیز بھائی انھیں بلاتے کیوں۔؟" موحد نے اس کی بات کی تائید میں سر ہلایا۔

"ہاں، وہ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتے ہیں۔ انھیں جو اچھا لگتا ہے، وہ اچھا ہی ہوتا ہے اور جو برا لگتا ہے، وہ برا ہی ہوتا ہے جیسے کہ میں۔" عشوہ نے اسے دکھ سے دیکھا۔ موحد نے سر جھکا کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"چلو، تم نیچے...... میں تمہارے پیچھے آتی ہوں۔" اپنا عکس آئینے میں دیکھ کر وہ اسے کہنے لگی۔ موحد باہر نکل گیا تو اس نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔

"شاید موحد بھی مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن معیز بھائی کی وجہ سے وہ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ اسے لگتا ہے کہ معیز بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔"

جلدی جلدی ٹاپس کانوں میں ڈالتے اس نے ایک نازک سی چین نکال کر گلے میں ڈالی۔ یہ پہلا تجربہ تھا، اسی لیے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

"لیکن وہ مجھ سے تو کہہ سکتا تھا نا۔ میں معیز بھائی کو منا ہی لیتی مگر اس نے تو اقرار کرنا بھی ضروری

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نہیں سمجھا۔" آخری دفعہ خود پہ نظر ڈال کر وہ باہر کی جانب بڑھی۔

"مان لو عشوہ! اگر تم اس کے ٹیسٹ کی نہیں ہو۔" باہر نکل کر دروازہ بند کرتے آخری بات اس نے خود سے کہی تھی اور اس بات نے اسے نئے سرے سے دکھی کیا تھا۔

☆☆☆

مہمانوں کے درمیان بیٹھ کر کئی سوالات کے جوابات دیتے ہوئے موحد اسے پہلو بدلتے دیکھتا رہا تھا۔ وہ کتنا زچ ہو رہی ہو گی، اس کی اس کیفیت کو وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ انکل اور کامران بھائی اس سے بھی گاہے بگاہے بات چیت کر رہے تھے۔ اس کی جاب اور دلچسپیوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ عدنان البتہ اس سب میں خاموش ہی بیٹھا رہا تھا۔ وہ بس معیز بھائی اور مونس کے پوچھے گئے سوالات کے ہی جوابات دے رہا تھا۔

"بیٹا! آپ باہر جا کر بات کرنا چاہیں تو چلے جائیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیوں بھابھی؟"

مسز کرامت نے عدنان کو اتنا خاموش دیکھا تو ان دونوں کو اکیلے بات کرنے پہ اکسایا حالانکہ عشوہ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس بات کے بعد معیز بھائی نے اسے اشارتاً عدنان کے ساتھ باہر جانے کے لیے کہا تو اسے چار و ناچار اٹھنا ہی پڑا۔

"موحد! تم بھی ساتھ چلے جاؤ بیٹا۔" مما نے نرمی سے کہتے موحد کو بھی اشارہ کیا۔ موحد کچھ گڑبڑایا اور کچھ کھسیا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اپنا ساتھ جانا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا لیکن اب اسوہ آنٹی جو کہہ رہی تھیں تو وہ کیسے ٹالتا۔

"موحد جا کر کیا کرے گا مما؟" معیز بھائی نے سرسری سے انداز میں اعتراض کیا تو موحد ہیں پھنس ہو گیا۔

"موحد۔" اسوہ آنٹی نے موحد کے نام کو ذرا کھینچا۔ "جاؤ بیٹا۔ انہیں کمپنی دو۔" انہوں نے بیٹے کے اعتراض کو مکمل نظر انداز کیا اور موحد کو اس بار تاکید کی تو اسے پیچھے جانا ہی پڑا۔

وہ تینوں باہر لان چیئرز پہ آ کر بیٹھ گئے۔

"اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی۔۔۔؟"

"جاب اور گھر۔" وہ سر جھکائے انگلیوں کے کڑاکے نکال رہی تھی جس سے عدنان کوفت زدہ ہو رہا تھا۔

"گھر پہ کیا مصروفیات ہیں۔۔۔؟"

"عشوہ کی کوکنگ بہت اچھی ہے۔ وہی ٹرائی کرتی رہتی ہے میری مام کے ساتھ۔" جواب موحد نے دیا تو عدنان نے پہلے اسے پھر عشوہ کو دیکھا۔

"کوکنگ کے علاوہ اور کچھ۔۔۔؟" اس بار عشوہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ عشوہ اور موحد نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔

"سیاحت کا بہت شوق ہے عشوہ کو۔" عشوہ سے پہلے موحد کے منہ سے پھسلا۔ عدنان نے ناگواری سے موحد کو دیکھا۔

"کوئی گونگی تو نہیں ہیں عالیہ۔۔۔؟"

"بالکل بھی نہیں۔" موحد کچھ نادم ہوا۔

"تو انہیں جواب دینے دیجیے نا۔ ویسے بھی یہ ہم دونوں کی ملاقات ہے تو آپ کا بولنا بلکہ ہونا مناسب نہیں لگ رہا۔"

موحد کا اس ہتک سے چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ کون سا وہاں شوق سے کباب میں ہڈی کا درجہ پانے آیا تھا۔ یہ تو اسوہ آنٹی نے اسے زبردستی وہاں بھیجا تھا۔

وہ جھٹ سے اٹھا تاکہ سیدھا اپنے گھر جا سکے لیکن جوں ہی وہ عشوہ کے قریب سے گزرا، اس کا ہاتھ عشوہ نے بڑھ کر تھام لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو عشوہ نے ملتجی نظروں سے سر دائیں بائیں ہلایا کہ وہ اسے چھوڑ کر مت جائے۔ موحد نے گہرا سانس لیا اور واپس اپنی جگہ سنبھال لی۔

"مسٹر صاحب! مجھے آنٹی نے بطور خاص یہاں بھیجا ہے کہ آپ دونوں کو کمپنی دوں اور عشوہ بھی نہیں چاہتی کہ میں یہاں سے جاؤں تو مجبوراً ہی سہی لیکن آپ کو مجھے برداشت کرنا پڑے گا۔" عدنان نے ناگواری سے گردن ہاں میں ہلائی اور عشوہ کے چہرہ کی رونق بحال ہوئی۔

باقی کی گفتگو میں عدنان کم ہی بولتا پایا گیا۔ موحد ہی سوالات کرتا رہا۔ عشوہ تو یوں بھی خاموش ہی رہی تھی کہ اس کے بعد عدنان نے اسے مخاطب نہیں کیا۔ وہ جلد ہی ان دونوں سے معذرت کرتا اندر چلا گیا تھا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد معیز بھائی نے گیٹ پہ کھڑے کھڑے ہی اپنے گھر کی جانب جاتے موحد کو دیکھتے ہوئے مما سے کہا۔

"کیا ضرورت تھی موحد کو بلوانے کی۔۔؟"

"وہ عشوہ کا دوست اور اس فیملی کا حصہ ہے۔ موحد کے ہونے سے اسے تسلی رہتی، اسی لیے بلوایا تھا۔" معیز بھائی پھر کچھ نہیں بولے۔

"ٹھیک یو مما۔ موحد کو میرے ساتھ باہر بھیجنے کے لیے۔" وہ اندر داخل ہوئیں تو عشوہ ماں سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے گال تھپک کر پیار سے اس کا ہاتھ چوما۔

"مائی پلیور میری جان۔" عشوہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

آخری سیڑھی پہ غائب ہوتی عشوہ کو دیکھ کر انہوں نے کچھ سوچا اور پھر برتنوں کو ٹرالی پہ رکھنے لگیں۔

☆☆☆

اگلی صبح ہی مسز کرامت کا فون عشوہ کے اٹھنے سے پہلے ہی آ چکا تھا۔ مما نے عشوہ کو خوش خبری سنائی کہ ان لوگوں کو یہ رشتہ قبول ہے۔ معیز بھائی اسی صبح ناشتہ کر کے واپسی کے لیے نکل گئے تھے۔ ان کی ملاقات نہیں ہو سکی لیکن وہ یہ خبر سن کر بہت اداس تھی۔ مونس اور معین نے بھی اس سے اداسی کی وجہ نہیں پوچھی، نہ ہی اسے رشتے کے حوالے سے اسے چھیڑا تھا۔ یہ بات کچھ تعجب خیز تھی۔

"شاید میری طرح یہ دونوں بھی اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔" یہی ایک وجہ اس کی سمجھ میں آئی تھی ورنہ ان تینوں میں بہن بھائیوں والی نوک جھونک لگی رہتی تھی۔

"موحد! اب عشوہ کی ساری شاپنگ تم ہی اسے کروانا۔ یوں بھی اس کے بھائی خاصے مصروف ہوتے ہیں اور اکیلے تو وہ کبھی جائے گی نہیں۔"

مما مٹھائی دینے ان کے گھر گئیں تو موحد کو تاکید کی۔ وہ سر جھکائے ان کی بات سنتا رہا۔ بتول آنٹی اندر ہی اندر تلملاتی رہیں۔ مما اپنی بات مکمل کر کے مطمئن سی واپس آ گئیں۔ وہ نجانے کتنی دیر بڑبڑاتی رہیں۔

☆☆☆

اگلے دن ایبٹ آباد سے نتھیا گلی کی طرف جاتے ہوئے ایک مشہور ہوٹل میں عشوہ کو اپنے باس سے ملنا تھا۔ باس چونکہ ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے یہیں آئے ہوئے تھے اور مزید ان کا آگے شمالی علاقہ جات کی طرف نکلنے کا ارادہ تھا اسی لیے ایک اہم پروجیکٹ کی فائلز پہ ان کے دستخط کروانے اور انہیں ڈسکس کرنے عشوہ کو لاہور سے یہاں آنا پڑا تھا۔

بادل بالکل نیچے اترے ہوئے تھے اور کسی بھی وقت بارش کی صورت دھار سکتے تھے۔

"اتنے حسین موسم میں باس سے میٹنگ کرنے کون جاتا ہے۔۔۔؟" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے موحد اسے چھیڑ رہا تھا۔

"فارغ ہو جاؤں تو پھر نکلتے ہیں تمہاری آوارہ گردی کو۔"

"جب تک تم فارغ ہو گی میری آوارہ گردی کا اختتام ہو گا۔ اب میں یہاں کسی ہوٹل میں باس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ کر کسی میٹنگ کے ختم ہونے کا انتظار تو نہیں کروں گا۔ میں تو حسین چہروں کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔"

وہ جانتی تھی کہ اسے لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے کا کوئی شوق نہیں تھا، نہ ہی وہ نظر باز قسم کا دل پھینک

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

انسان تھا۔

"جب فری ہو جاؤ تو کال کر لینا۔ میں یہیں کہیں، یہاں وہاں گھومتا پھرتا رہوں گا۔ تم بلاؤ گی تو فوراً واپس لوٹ آؤں گا۔"

"اب اور دفع ہو جاؤ۔" اس نے ٹھک سے اس کی گاڑی کا دروازہ بند کیا تو وہ دانت نکالتا اسے وہیں چھوڑ کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

موحد اسے وہاں ڈراپ کر کے خود گھومنے نکل گیا تھا۔

وہ جب اندر آئی تو بارش کی چند بوندیں اس پہ پڑ چکی تھیں۔ ایسے میں قدم اندر جانے کے بجائے باہر کی طرف اٹھنے کے لیے بغاوت کر رہے تھے لیکن وہ جس کام سے آئی تھی، وہ انجام دینا زیادہ ضروری تھا۔

جب وہ گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو ایک کونے والی میز پہ بیٹھے باس کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اسے ہاتھ ہلا کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے سلام کر کے ان کے سامنے والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ ہاتھوں میں تھاما فائلز کا پلندہ اس نے میز پہ رکھ دیا۔ اب باس ویٹر کو اس کے لیے بھی کافی لانے کا کہہ رہے تھے۔

"ساتھ کچھ لو گی۔۔؟" اس نے کچھ تذبذب سے سر ہلایا۔

"سینڈوچز۔"

آرڈر مکمل کروا کر اب وہ کام کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ریسٹورنٹ آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا سو سیاحوں کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ جگہ میٹنگ کے لیے موزوں ترین تھی۔

کچھ اہم ڈاکومنٹس ڈسکس کرنے اور دستخط لینے کے بعد عشوہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ کندھوں سے جیسے ایک ذمہ داری ادا ہونے کا بوجھ اترا تو ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔

"ایک اور اہم کام بھی تھا آپ سے علی بھائی۔" چونکہ وہ معیز بھائی کے پرانے دوست تھے تو آفس کے معاملات طے کرتے ہوئے وہ انہیں "باس" ہی کہتی تھی لیکن جب آفس لپیٹ دیا جاتا تو باس والا تعلق بھی اڑنچھو ہو جاتا۔ پھر وہ باس سے علی بھائی بن جاتے جو معیز بھائی کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔

"بولو۔ اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"میرا ایک دوست ہے بچپن کا۔" اس نے تمہید باندھی۔

"موحد۔۔؟" وہ جھٹ سے بولے تو عشوہ مسکرا دی۔ موحد اور اس کی دوستی کا آدھا زمانہ گواہ تھا اسی لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ وہ اس کا نام جانتے تھے۔

"جی وہی۔ اس نے پچھلے سال میرے ساتھ ہی اپنی الیکٹریکل انجینئرنگ مکمل کی تھی۔ چھ مہینے ایک کمپنی میں انٹرن شپ بھی کی ہے لیکن اب سال ہونے والا ہے کہ وہ بے روزگار ہے۔ اسے کوئی ڈھنگ کی کیا بے ڈھنگی سے نوکری ہی نہیں مل رہی۔" پھر وہ خاموش ہو گئی کہ آگے بات کہنا چاہیے یا نہیں۔

"لیکن ہماری کمپنی اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے بھلا۔؟ تم جانتی ہو کہ یہ ہماری فیلڈ نہیں ہے۔ ہم تو دو جمع دو کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ تاروں بجلی سے کھیلنا ہمارا کام نہیں ہے۔ مجھے یوں بھی کرنٹ لگنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

آفس میں ایک سخت اصول پسند قسم کے باس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عام زندگی میں بڑے سادہ اور نفیس قسم کے انسان تھے جن سے بندہ بلا جھجک کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

"یہ بات میں تو میں جانتی ہوں۔ اپنی کمپنی کے لیے بات کر بھی نہیں رہی میں۔ آپ کے بہت جگہوں پہ تعلقات ہیں علی بھائی ہزاروں لوگوں سے ملنا ملانا ہوتا ہے۔ آپ بہت سوشل ہیں۔ کوئی نا کوئی تو ہوگا ہی جو اس فیلڈ سے وابستہ ہوگا۔ آپ وہاں ٹرائی کر سکتے ہیں پلیز...... یہ بات میں معیز بھائی سے بھی کہہ سکتی تھی لیکن معیز بھائی سے کسی قسم کی فیور وہ کبھی نہیں لے گا۔ اس کی نام نہاد انا گو ہے جو اسے کسی کی مدد لینے سے بری طرح روکتی ہے۔ وہ اپنے بل بوتے پہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور اسی چکر میں سال ضائع کر چکا ہے اور شاید زندگی بھی ضائع کر دے گا لیکن کسی سے مدد نہیں لے گا۔"

"اور مجھ سے لے لے گا۔؟" وہ ہولے سے مسکرائے۔ عشوہ نے سانس بھری۔

"آپ سے بھی کیسے لے سکتا ہے۔ آپ میرے باس اور معیز بھائی کے دوست ہیں۔ وہ تو مجھے طنز کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا کہ مجھے یہ جاب معیز بھائی کی وجہ سے ملی ہے تو خود کیسے ایسی جگہ جاب کر سکتا ہے۔"

"حالانکہ تم میری کمپنی میں معیز کی بہن ہونے کی وجہ سے نہیں ہو، اپنی قابلیت کی وجہ سے ہو۔ تم نے جسٹ انٹرن شپ معیز کی بہن ہونے کی وجہ سے حاصل کی تھی یہ میں مانتا ہوں۔ نوکری تو اپنے کام کی وجہ سے پائی تھی۔ میں کامپیٹنٹ لوگوں کے علاوہ کسی کو اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں دیتا چاہے وہ میرا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کمپنی میں نے کام کرنے اور کام لینے کے لیے کھولی ہے، رشتے داریاں نبھانے کے لیے نہیں۔ اگر بے کار لوگوں کو بھرتی کرتا پھروں گا تو ضرور میرا کام چل جائے گا۔"

"یہ بات وہ سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔" اس نے کافی کا کپ شانے اچکاتے منہ سے لگایا۔

"تو پھر تم اب یہ چاہتی ہو کہ میں اپنے کانٹیکٹس استعمال کر کے اس کو جاب دلواؤں اور اسے خبر بھی نہ ہونے پائے کہ اس کی جاب لگوانے میں تمہارا ہاتھ ہے۔"

"ایک دو دوست ہیں اس فیلڈ کے جن سے بات ہو سکتی ہے۔ کرتا ہوں کچھ اس سلسلے میں بھی۔ دیکھو کچھ بن پاتا ہے یا نہیں۔"

"میرا نام۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اسے پتا نہیں چلے گا کہ تمہارا اس میں کسی قسم کا ہاتھ ہے۔ کیا وہ لنکڈ ان پہ ہے۔۔؟" عشوہ نے سر ہاں میں ہلایا۔

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کام ہو جائے گا اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔" وہ ممنون سی اب اپنی کافی ختم کر رہی تھی۔ تب تک اس کے آرڈر کیے سینڈوچز بھی آ چکے تھے۔

☆☆☆

میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ دونوں پتریاٹا کی جانب نکل گئے۔ موحد کو چیئر لفٹ میں بیٹھنے کا جو شوق تھا، وہ اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔

"مجھے اونچائی سے ڈر لگتا ہے موحد۔ تم چلے جاؤ، میں نیچے ہی انتظار کر لوں گی۔" وہ بیٹھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

"اکیلے تو میں کسی حال میں نہیں جانے والا۔" وہ ٹکٹ گھر کی طرف اسے گھسیٹ رہا تھا۔

"لیکن میں بیٹھوں گی کیسے۔۔؟"

"آنکھیں بند کر کے۔"

"اگر آنکھیں بند کر کے ہی سارا سفر کاٹنا ہے تو پیسے ضائع کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔" ٹکٹ گھر تک پہنچتے تک ان کی یہ بحث جاری رہی۔

"سنو عشوہ بی بی! مجھے بس اتنا پتا ہے کہ ہم ساتھ میں آخری دفعہ گھومنے نکلے ہیں اور مجھے اس سفر کو یادگار بنانا ہے۔ چیئر لفٹ میں تو تم میرے لیے بیٹھو گی ہی۔ باقی کی زندگی پھر گزارتی رہنا اپنے اس بن مانس کے کہے کے مطابق۔ بچپن کے دوست کا جتنا حق ہے وہ تو میں جتا کر ہی رہوں گا۔" وہ ٹکٹ خرید چکا تھا۔ اب دونوں لائن میں لگ گئے تھے۔

جب ان دونوں کی باری آئی تو عشوہ نے بند آنکھوں سے موحد کا ہاتھ تھامے تھامے ہی چیئر سنبھالی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ آنکھیں کھولنے سے ڈر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر اس کا ڈر جاتا رہا۔ اب اسے اس سفر میں مزہ آ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رہا تھا۔

"بیوی بننے جا رہی ہو بن مانس کی اور دل ہے چڑیا جتنا۔ تم تو ایک ہی نوالے میں لگی جاؤ گی۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"میں پہلے کبھی نہیں بیٹھی۔ اب بیٹھی ہوں تو مزہ آ رہا ہے۔" وہ نیچے سڑک اور دیگر مناظر دیکھتے ہوئے خوش تھی۔

"میرے چیئر لفٹ میں بیٹھنے کی خوشی میں تم مجھے رات شان دار سا ڈنر کروا رہے ہو۔" اتر نے سے پہلے اس نے کہا تو موحد مزے سے بولا۔

"پکا ہے۔ تم مجھے ابھی جانتی نہیں ہو۔" وہ بڑی آسانی سے مان گیا تھا اپنی بے روزگاری، مسکینیت، بیچارے پن کے حوالے نہیں دیے تھے یہ حیران کن بات تھی اور عشوہ کی یہ حیرت دور ہوگئی جب وہ ایوبیہ پہنچی۔

وہ میس پہنچے تو وہاں ایک فیملی لان میں باربی کیو کر رہی تھی۔ یہ وہی فیملی تھی جن کے سربراہ سے موحد صبح دوستی گانٹھ کر گیا تھا۔ انھوں نے ان دونوں کو بھی ڈنر پہ انوائٹ کر ڈالا۔

"قسم سے انتہائی شوہدی حرکت ہے یہ۔" عشوہ کو موحد پر غصہ آ رہا تھا۔

"اب ایک بے روزگار انسان تو تمہیں ایسے ہی ڈنر کروا سکتا ہے۔"

"تم چلو۔ میں تمہیں باہر سے شان دار ڈنر کروا دیتی ہوں۔"

"یہ مفت کا باربی کیو تو میں مر کر بھی مس نہیں کرنے والا۔" وہ مزے سے اس فیملی کے درمیان جا بیٹھا۔ عشوہ بھی مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق دانت پیس کر، موحد کو ہزار گالیاں نکال کر ڈنر کرنے ان کے ساتھ شامل ہوگئی۔

صبح انھیں جلدی واپسی کے لیے نکلنا تھا اسی لیے ڈنر کرتے ہی وہ دونوں ہلکی پھلکی واک کے بعد سونے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

لاہور پہنچ کر موحد اسے گھر کے باہر اتار کر اپنے گیٹ کے باہر ہی گاڑی پارک کر رہا تھا تو گیراج میں اسے اسلم بھائی کی گاڑی دکھائی دے گئی جس کا مطلب تھا کہ ادیبہ باجی آئی ہوئی تھیں۔ جب سے انھوں نے ڈرائیونگ سیکھی تھی، وہ خود ہی ڈرائیو کر کے آجاتی تھیں۔ گھر کے بہت سے کام بھی اب وہ خود ہی کرنے لگی تھیں کہ اسلم بھائی تو ہمیشہ سے آلکسی کے مارے ہوئے تھے اور اب تو گنی چنی چند ذمہ داریاں جو انھوں نے کاندھوں پہ لے رکھی تھیں، وہ بھی ادیبہ باجی کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو گئے تھے

اندر داخل ہونے پہ اسے ماما اور ادیبہ باجی کی اونچی آوازیں سنائی دیں جو اس کی موجودگی سے لاعلم آپس میں بحث کر رہی تھیں۔ وہ دبے قدموں اندر داخل ہوا۔

"اب ہو گئی نا غلطی تو کیا کروں۔ گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جاؤں کیا۔۔۔؟ یا رشتہ ختم کروا لوں اس عمر میں۔۔۔؟" ادیبہ باجی نجانے کس غلطی کی بات کر رہی تھیں لیکن ان کے ایسے سخت الفاظ موحد کو حیران کر گئے تھے۔

"اگر معیز سے شادی ہوتی تو کیسے عیش کر رہی ہوتیں۔ ٹھاٹھ باٹ والی زندگی ہوتی۔ لیکن اس وقت تمہارے سر تو اسلم کا بھوت سوار تھا۔ میری ایک سننے کو تیار نہیں تھیں ورنہ کتنا سمجھایا تھا میں نے تمہیں کہ معیز ہر لحاظ سے بہترین انتخاب ہے۔ لیکن جب انسان نے پتھر ہی جمع کرنے کا تہیہ کر لیا ہو تو اسے ہیرے کہاں دکھائی دیتے ہیں۔ سبز باغ دکھانے والے اسلم سے کہو کہ اب تمہاری ساری ضروریات پوری کرے جو ایک دن کام کرتا ہے اور دو دن آفس ہی نہیں جاتا۔ اتنا غیر ذمہ دار اور سست انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

ماما کو ہمیشہ سے ادیبہ باجی کے اس انتخاب پہ غصہ رہا تھا۔ ان کے نزدیک انھوں نے جلد بازی میں انتہائی جذباتی اور احمقانہ فیصلہ کیا تھا جو معیز کو ٹھکرا کر اسلم کو چنا تھا اور اس کا اظہار وہ اکثر ہی کر جاتی تھیں۔

"بچپن میں پھپھو سے اسلم کے لیے بات بھی تو آپ نے کی تھی۔ پھر سارا الزام میرے سر کیوں دھر رہی ہیں۔۔؟ ہمیشہ خاندان میں اسلم کا نام اپنے نام کے ساتھ سنا تھا تو اسی سے انسیت تھی مجھے۔ یہ انسیت پسند میں بدل گئی وہی میرا منگیتر ہے اور اس عمر میں کہاں کچھ سمجھ ہوتی ہے۔ سارا قصور میرا تو نہیں تھا ماما۔ اگر آپ کو لگتا تھا کہ میرا فیصلہ اتنا غلط ہے تو لگا دیتیں مجھے دو اور معیز کے رشتے کے لیے ہاں کر دیتیں۔ اس وقت آپ سختی دکھا دیتیں تو زندگی میرے لیے اتنی سخت نہ ہوتی۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

موحد کا دل کیا اپنا سر پیٹ ڈالے۔ اب جب بچے کاندھوں تک آ پہنچے تھے تو انھیں اسلم بھائی غلط انتخاب لگ رہے تھے اور معیز بھائی درست۔ اتنی دیر میں انھیں اتنی زبردست عقل کہاں سے آ گئی تھی۔

"شکورہ نے بچپن سے ہی تمہیں خود ہی اپنی بہو تسلیم کیا تھا۔ میرا اس بارے میں کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بچپن کی بات کا کیا ہے، بچے بڑے ہو کر کدھر کو نکل جاتے ہیں۔ کیسے کیسے ہو جاتے ہیں۔ اسی نے خاندان کے ہر دوسرے گھر میں تمہیں اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ تو تمہارا اسلم سے رابطہ تھا، اگا دوا دوستی بھی کہ تم نے خود ہی پکڑلی تھی کہ شادی تم اسلم سے ہی کرو گی ورنہ میں تو معیز کو دل و جان سے پسند کرتی تھی تمہارے لیے۔ اتنا سمجھایا تھا اس وقت بھی تمہیں لیکن تم اسلم کی چکنی چپڑی باتوں میں ایسی آئی ہوئی تھیں کہ ماں کی کوئی بات بھی سن اور سمجھ نہیں رہی تھیں۔ پھر کیا ماری جوان اولاد کو جبکہ تمہارا باپ بھی سر پہ نہیں رہا تھا تو مجھے اپنا آپ یوں بھی کمزور لگتا تھا۔" ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"تو اب کیا کروں میں۔۔۔؟ یہی کر سکتی ہوں کہ موحد کے لیے کوشش کر کے دیکھوں کہ جو بے وقوفی میں نے کی ہے وہ نہ کرے۔ قسم انھوا لیں جب سے عشوہ کی بات پکی ہونے کی خبر سنی ہے، موحد کے لیے بہت پریشان ہوں میں ماما! اس لیے یہاں بھاگی آئی ہوں کہ مل کر اس بارے میں سوچتے ہیں۔ کچھ تدبیر ایسی لڑاتے ہیں کہ یہ رشتہ ہو جائے۔"

موحد کا دماغ ہی گھوم گیا۔

"براہ مہربانی آپ اپنے گھر پہ توجہ دیں باجی! اور میرے معاملات میں مت پڑیں۔ میری جو چند لوگوں میں عزت ہے، اسے قائم رہنے دیں۔" وہ دونوں اسے سامنے دیکھ کر گڑبڑا گئیں۔

"موحد! تم کب آئے۔۔۔؟" ادیبہ باجی کی ہوائیاں چھوٹ گئیں۔

"بالکل ٹھیک وقت پہ آیا ہوں۔ اگر آپ معیز بھائی کو ٹھکرا کر پچھتاوں کا شکار ہیں تو اپنے ان پچھتاوں کا مداوا اس طرح کریں گی۔۔۔؟ معیز بھائی ہمیں پسند نہیں کرتے۔ اور مجھے تو بالکل بھی نہیں کرتے۔ پلیز مجھے ان کی نظروں میں مزید دو کوڑی کا مت کیجیے گا کچھ بھی ایسا ویسا کر کے۔"

"یہ سب میری وجہ سے ہے موحد! ورنہ اس کا بہت آنا جانا تھا یہاں۔ بہت دوستی تھی ہماری۔ بہت پسند کرتا تھا وہ ہمیں۔" ادیبہ باجی نے وضاحت پیش کی۔

"جو بھی تھا، اب ماضی ہوا۔ وہ اپنی میرڈ لائف میں سیٹل ہیں۔ بھول چکے ہیں سب۔ نہیں بھولے شاید تو وہ کینہ نہیں بھولے جو دل میں پلتا رہا ہے۔"

اس نے تاسف سے سر جھٹکا اور باری باری ماں اور بہن کو دیکھا۔

"اگر کسی نے بھی اس بارے میں کوئی قدم اٹھایا تو میں وہ کر گزروں گا جو آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتیں۔" اس کے دھمکی آمیز لہجے پہ دونوں ہی دہل گئیں۔ موحد غصے میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

موحد اپنا جی میل اکاؤنٹ باقاعدگی سے چیک کرنے کا عادی تھا۔ ایوبیہ سے لوٹنے کے ہفتے بعد جب اس نے اکاؤنٹ کھولا تو اسے وہاں ایک کمپنی کی جانب سے میل موصول ہوئی تھی جس میں اس کی انٹرویو کال تھی۔ ایک امید ہوئی جب اس نے نیٹ پہ اس کمپنی کا نام کھول کر اس کی تفصیلات پڑھنا شروع کیں۔ بہت بڑی نہ سہی لیکن ایک اچھی کمپنی تھی۔ بہت زیادہ نہ سہی لیکن نوکری کی صورت میں اسے ایک اچھا پیکج مل سکتا تھا۔

”پہلے نوکری تو مل جائے۔ پیکج تک کہاں سے پہنچ گیا تیز چلی۔“ خود کو سرزنش کرتے ہوئے اس نے اپنا اکاؤنٹ بند کیا۔ ابھی وہ اس بارے میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”ماما! میری جاب کے لیے دعا کیجیے گا۔“ وہ بس بتول کے پاس ہی گیا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا جو اس وقت جائے نماز پہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ پڑھتے پڑھتے انہوں نے چہرے پہ پھونک دیا۔

”ہر دم ہر پل کرتی ہوں بیٹا۔“

”اب زیادہ کردیں۔ ایک جگہ انٹرویو ہے میرا۔“

”بیٹا دن رات کرتی ہوں۔ اب مزید کروں گی۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ چلانے لگیں۔

انٹرویو اگلے ہفتے تھا اور اس ایک ہفتے میں سب کچھ ایک طرف رکھ کر وہ انٹرویو کی چیدہ چیدہ تیاری کرنے لگا۔ اس دوران عشوہ کے چند میسجز بھی آئے تھے۔ اسے کچھ کام تھا لیکن اس نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ وہ مصروف ہے۔ عشوہ اس کی مصروفیت کی نوعیت خود ہی سمجھ گئی تھی۔

”اللہ کرے اس بار تمہاری مصروفیت رنگ لے آئے۔“ وہ دل سے اس کے لیے دعا کرنے لگی۔ آنکھ میں آیا ایک آنسو بھی آستین سے پونچھ ڈالا۔ کام کی نوعیت بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ اس کے ذہن کو منتشر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

انٹرویو والے دن وہ جلدی گھر سے نکلا تھا۔ آفس پہنچا تو وہاں اس کے علاوہ ایک ہی مزید امیدوار تھا جس سے بات چیت میں اسے پتا چلا کہ وہ پچھلے دو سال سے کہیں نوکری کررہا ہے لیکن وہ اتنی اچھی نہیں تھی۔ اب بہتر کی تلاش اسے یہاں تک لائی تھی۔

انٹرویو پینل میں دو ہی افراد تھے۔ اس کے اکیڈمک ریکارڈ اور انٹرن شپ کا سرٹیفکیٹ دیکھ کر وہ اس بات پہ حیران تھے کہ اب تک اسے کوئی معقول نوکری بھی کیوں نہیں ملی۔ کچھ سوالات اس کی فیلڈ سے متعلق پوچھے گئے جن کے اس نے درست جوابات ہی دیے تھے۔ پھر اسے شکریہ کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ وہ پرامید تھا اسی لیے اس شام سے بار بار ای میل اکاؤنٹ کھول کر دیکھتا رہا۔

اگلے دن رات تک اسے جاب سلیکشن کی ای میل آچکی تھی۔ جوں جوں وہ میل پڑھتا گیا اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

ابھی اسے ایک مہینہ پروبیشن پہ رکھا جارہا تھا جس دوران اس کی تنخواہ معقول تھی۔ لیکن اگر وہ کمپنی کی امیدوں پہ پورا اترتا تو پروبیشن کے بعد اس کی تنخواہ کمپنی بتائی جارہی تھی، وہ اس کی توقع سے زیادہ ہی تھی جبکہ یہ اس کی پہلی نوکری تھی۔ پہلی نوکری میں ہی اسے اتنی شاندار شروعات ملیں کی اس کی اس نے توقع نہیں کی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نوکری کے ملنے کے پیچھے کی کہانی کیا ہے اور نہ ہی وہ کبھی جان سکتا تھا۔

اپنی خوشی اس نے ماما سے بانٹی تو وہ اس کی بلائیں لیتی، صدقہ اتارتی، شکرانے کے نوافل پڑھنے چلی گئیں۔

وہاں سے وہ سیدھا ”رمیض ہاؤس“ گیا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے ایک کمی کا احساس ہوا تھا۔ معیز بھائی کی فیملی وہاں موجود تھی اور ان کے بچے اس کی آمد پہ چلا اٹھے۔

”موحد چاچو بھی آگئے۔“ وہ ان کے اس زبردستی کے چاچو پہ ہمیشہ جز بز ہوتا کہ جب ان کا باپ اسے بھائی سمجھتا ہی نہیں تھا تو وہ اسے کس بنیاد پہ چاچو کہتے تھے۔

ان سے ہیلو ہائے کرتا ہوا وہ اسوہ آنٹی سے سلام لینے آگے بڑھا جو وہیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کے ساتھ زمیل بھابھی بھی تھیں جن سے اس نے رسمی سی دعا سلام کی تھی۔ اسے وہ بھی معیز بھائی جیسی اکھڑ مزاج ہی لگتی تھیں حالانکہ عشوہ ان کی بہت تعریف کرتی تھی لیکن شاید وہ معیز بھائی کی ساری فیملی کو ایک ہی عینک سے دیکھتا تھا اور ایک ہی میزان پہ پرکھتا تھا۔

”یاد آگیا تمہیں لڑکے۔“ وہ کچھ خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

”زمیل! تم جاؤ بیٹا۔ یہ سب میں دیکھ لوں گی۔ بچوں کو بھی لے جاؤ اور شام کی چائے کے لیے ساجدہ کو بول دو۔ بچوں نے جو کھانا ہے، وہ بھی بنوا لو۔“ وہ اسے مکمل نظر انداز کرکے زمیل سے مخاطب تھیں جو سامنے ڈھیر کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ موحد وہیں ایک کونے میں کھڑا بکھرا سامان دیکھ رہا تھا کہ سب ہی صوفوں پہ کام والے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ نجانے یہ سب کس لیے تھا۔ شاید کسی فنکشن کی تیاریاں چل رہی تھیں۔

”اوپر کمرے میں ہی ہے عشوہ۔ چلے جاؤ۔ اس سے پوچھ لینا اگر کوئی کام رہ گیا ہو تو وہ تمہارے ساتھ مل کر پورا کرلے کیوں کہ وقت کم ہے۔“ زمیل اور بچے چلے گئے تو انہوں نے اسے دیکھ کر چیزیں یہاں سے وہاں رکھنا شروع کیں۔

”کس بات کا وقت آنٹی۔۔؟“ وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔

اسوہ آنٹی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تمہیں بتایا نہیں اس نے کہ اس ویک اینڈ پہ اس کا نکاح ہے۔۔؟“ موحد ساکت سا انہیں دیکھے گیا۔

”نکاح۔۔؟ ایک دم سے نکاح بیچ میں کہاں سے آگیا۔۔؟ ابھی ایوبیہ کے ٹرپ تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

”ٹرپ کو گزرے دو ہفتے ہو چکے ہیں بیٹا۔“

اسے واقعی احساس نہیں ہوا تھا کہ انہیں ایوبیہ سے آئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔

”عدنان کی پوسٹنگ آگئی ہے بنو عاقل کی۔ ابھی جائے گا تو پھر نجانے کب آتا ہو، اسی لیے وہ جانے سے پہلے نکاح کرنا چاہ رہے ہیں۔“ اسوہ کے سامنے کچھ کام والے جوڑے پڑے تھے۔ وہ اس میں مصروف ہوگئی تھیں۔

دروازے پہ دستک دے کر جب وہ اندر گیا تو وہ اپنی ٹانگیں گھٹنوں سے جوڑے بیڈ پہ پڑی تھی۔ اسے آتے دیکھا تو اٹھ کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی متورم نگاہیں موحد سے چھپی نہیں رہ سکیں گو کہ اس نے موحد کو دیکھتے ہی نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ اس عشوہ سے بہت مختلف لگ رہی تھی جو اس کی دوست تھی شاید اس لیے کہ اس نے لڑکیوں کے رنگ میں خود کو رنگنا شروع کردیا تھا۔ کھلا سا گھیردار کاٹن کا فراک اور دوپٹہ، بالوں کی سادہ سی چوٹی، کانوں میں ننھے منے سے ٹاپس اور گلے میں چین، آنکھوں میں کاجل۔

”ویک اینڈ پہ تمہارا نکاح ہے اور یہ بات مجھے آنٹی سے یہاں آنے پہ پتا چل رہی ہے۔ اب میں اتنا پرایا ہوچکا ہوں کہ تمہاری زندگی کی اتنی اہم بات مجھے کسی اور سے پتا چلے گی۔“ وہ اپنا غصہ چھپا نہیں سکا۔

”میں نے میسج کیا تھا لیکن تم بزی تھے کہیں۔“ موحد کو اس کا کچھ دن پہلے کا میسج یاد آیا تھا۔ وہ بے چینی سے لب کاٹنے لگا۔ کمرے میں یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے غصے کو قابو نہیں کر پارہا تھا۔ پھر اچانک رک کر اسے دیکھا۔

”تم میسج پہ ہی بتا دیتیں۔ میں سر کے بل دوڑا آتا۔“

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔" موحد نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا عشوہ نے پھر سے نظریں چرالیں اور اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی سے کھیلنے لگی۔ کبھی اسے پہنتی کبھی اتارتی۔ یہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہلے موجود نہیں تھی۔

"یہ رنگ۔؟" وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔

"ان لوگوں نے بھجوائی ہے۔" موحد نے کرب سے آنکھیں موندیں۔

"اور تم مجھے اب بتارہی ہو۔"

"بتانا چاہا تھا میں نے موحد۔ تم بزی تھے۔ تم نے کہا کہ تم بعد میں بات کروگے۔ میں منتظر رہی لیکن وہ بعد نہیں آئی۔" وہ وضاحت دیتے اسے اذیت سے دیکھ رہی تھی۔

"میں انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔ تم بتادیتیں تو میں بھاگا آتا۔"

"آکر کیا کرتے موحد۔؟" وہ حق دق اسے دیکھنے لگا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ وہ آکر کیا کرلیتا؟

"تم خوش ہو اس رشتے سے۔؟" وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کوئی چوائس ہے میرے پاس۔؟" وہ دل مسوس کر پوچھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی ابھری تھی۔

"تم کہو تو میں آنٹی سے بات کرتا ہوں۔"

"کیا بات کروگے۔؟" اسے لگا کہ وہ ان دونوں کے لیے کوئی بات کرے گا۔ شاید اسے احساس ہو گیا ہو۔

"یہی کہ وہ اس رشتے سے انکار کردیں۔" عشوہ نے جیسے ایک تھکن زدہ سانس لی۔ وہ بھی ان دونوں کے لیے نہیں سوچنے والا تھا۔ وہ خواہ مخواہ خوش فہم ہو رہی تھی۔

"پھر کیا ہوگا۔۔؟ یہاں نہیں ہوگا تو کہیں اور ہوگا۔ وہاں نہیں ہوگا تو کہیں اور ہوگا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کہہ نہیں سکی کہ جہاں بھی ہوگا تم سے تو پھر بھی نہیں ہوگا۔ موحد کا دل تڑپ اٹھا تھا۔

"میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا عشوہ۔۔ پلیز۔" سائیڈ ٹیبل سے ٹشو باکس اٹھاتے اس نے اس کی طرف بڑھایا جسے عشوہ نے تھام کر اپنا چہرہ اور ناک پونچھی۔

"اتنی پرواہ ہے میری تو مت رلاؤ نا مجھے موحد مرزا۔ مان جاؤ پھر۔ لیکن تم نہیں مانوگے کیونکہ مسئلہ یہاں تمہارے دل کا نہیں انا کا ہے۔" اس نے دل میں سوچتے، اسے دیکھتے ہوئے پہلو بدلا تھا۔

"تم کہاں بزی تھے۔؟" وہ عشوہ کے نکاح کا سن کر بھول ہی گیا تھا کہ وہ تو اپنی خوشی بانٹنے آیا تھا لیکن دل اب ایسا عجیب ہو رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی کامیابی اور خوشی محسوس ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک دم خالی ہو گیا تھا اندر سے۔

"مجھے بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔" جو جوش اس کے لہجے اور آواز میں ہونا چاہیے تھا، وہ مفقود تھا۔ اتنی اچھی جاب ملنے کی خبر وہ کتنے برے طریقے سے سنا رہا تھا۔

عشوہ مسکرائی اور خوشی خوشی اسے مبارک دی۔

"میں بہت خوش ہوں تمہارے لیے۔ میں نے کہا تھا نا ایک دن تمہیں بہت اچھی جاب مل جائے گی۔ بس ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔" وہ دل سے خوش تھی۔

"لیکن میں جو تمہارے لیے خوش نہیں ہوں کیونکہ تم خوش نہیں ہو۔" اور اس پل وہ خود سے اقرار نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ خود بھی خوش نہیں تھا۔ عشوہ نے گہری سانس بھری۔

"میں شاید وقت کے ساتھ خوش ہو جاؤں گی۔ شاید ہر لڑکی میری طرح شادی کے وقت افسردہ ہوتی ہوگی۔"

اس نے خود کو اور اسے ایک ساتھ بہلایا۔ موحد نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے آر پار سب جان لے گا۔ عشوہ نے گھبرا کر نظریں چرالیں۔ سامنے وارڈ روب پہ نظر پڑی تو ایک بھاری کامدانی سوٹ لٹک رہا تھا۔ موحد نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ۔؟" عشوہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نظریں گھمائیں۔

"یہ میرے نکاح کا جوڑا ہے جو ان کی طرف سے آیا ہے۔ بتاؤ کیسا ہے۔۔؟" موحد نے ایک نظر ہینگر میں لٹکے حسین سفید کامدانی فراک کو دیکھا اور پھر اس کی طرف۔ حسد، تکلیف، ناپسندیدگی، اذیت، کچھ ٹوٹنے کا کرب۔۔۔ بہت کچھ تھا ان نظروں میں۔

وہ جواب دیے بنا ہی تیزی سے پلٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ اتنا تیزی سے سیڑھیاں اتر کر داخلی دروازے کی طرف گیا تھا کہ اسوہ آنٹی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"اسے کیا ہوا۔؟" زیمل نے سرخ چہرہ اور سخت تاثرات لیے موحد کو جاتے دیکھ کر اسوہ سے پوچھا تو ایک مطمئن سا سانس لے کر بولیں۔

"احساس۔" زیمل نے ناسمجھی سے انھیں دیکھا تو انھوں نے ایک پراسراری مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"تم نہیں سمجھوگی۔" اتنا کہہ کر وہ اب سامنے پڑا سب سامان سمیٹنے لگیں۔

"انھیں میرے کمرے میں پہنچادو۔ اب یہ کام بعد میں کرلیں گے۔" زیمل سر ہلاتے اور بڑی بی کو ساتھ لگا کر سب اٹھانے لگیں۔

☆☆☆

"عشوہ کا نکاح ہے اس ویک اینڈ۔" کھانے کی میز پہ اس نے تنے چہرے سے یہ خبر ماما کو دی تو ان کا منہ تک نوالہ لے جاتا ہاتھ وہیں تھم گیا۔

"اتنی جلدی نکاح۔ ابھی تو بات پکی ہوئی تھی۔ اب یکدم نکاح۔" وہ سر جھکائے اپنا کھانا کھا رہا تھا۔ اپنے اندر کے تاثرات وہ ان پہ عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ شام سے وہ اپنے کمرے میں ہی بند تھا جب سے "زمیش ہاؤس" سے لوٹا تھا۔

"لڑکے کی پوسٹنگ آگئی ہے۔ اسی لیے جلدی نکاح کرنا چاہتے ہیں۔" وہ ماں کی طرف دیکھے بنا بس کھانے کو دیکھتا جواب دے رہا تھا۔ بتول نے غور سے اسے دیکھا۔

"اب تو تمہاری ایک اچھی نوکری لگ گئی ہے موحد! جلد تم مزید ترقی بھی کرلوگے۔ اس بیجر کے برابر نہ سہی، کچھ بہتر تنخواہ تو ہوگی تمہاری۔ کیا اب بھی تمہیں لگتا ہے کہ مجھے اسوہ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔؟" موحد نے چونک کر سر اٹھاتے انھیں دیکھا۔

"اس کا نکاح ہونے جا رہا ہے ماما۔"

"ہوا تو نہیں ہے۔ ابھی بہت وقت ہے۔ میں کسی بھی طرح سب ٹھیک کرلوں گی اگر تم مان جاؤ۔" موحد نے سر جھکا جیسے اسے یہ بات بالکل بے کار لگی ہو۔

"موحد! تم مان کیوں نہیں جاتے کہ عشوہ ایک دوست سے کہیں زیادہ ہے تمہارے لیے۔ کیا ہم سب اندھے ہیں جو تم دونوں کی ایک دوسرے کے لیے محبت دیکھ نہیں سکتے۔ بچپن سے تم دونوں کا نام ایک ساتھ رہا ہے۔ اسے کھو کر تم خوش نہیں رہ سکتے۔ تم کیوں اس بات کو نہیں سمجھتے۔۔؟" بتول اسے اس کی غلطی کا ادراک کروانا چاہتی تھیں۔ وہ اسی وقت کھانا چھوڑ کر اٹھا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"موحد کھانا تو کھالو۔" بتول کہتی رہ گئیں۔

"آپ کی باتوں سے پیٹ بھر گیا ماما۔"

رات گئے تک وہ اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑا اپنا سارا بچپن، لڑکپن اور جوانی سوچتا رہا تھا جو عشوہ کے ساتھ بیتا وقت تھا۔ اس کے بہت سارے دوست تھے جن کا اپنا مقام اور جگہ تھی لیکن جو عشوہ کی جگہ تھی وہ تو کوئی نہیں لے سکتا۔

وہ کیسے ہانگ دل کہا کرتا تھا۔ "عشوہ جیسا تو کوئی نہیں۔ اس کی بات ہی الگ ہے۔"

"اور عشوہ کی کیا جگہ ہے موحد مرزا۔؟" اس

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے اندر سے سوال اٹھا۔ اسی سوال کے جواب سے وہ ڈرتا تھا۔

اس سوچ کو جھٹک کر وہ اندر کمرے میں چلا آیا۔ لیپ ٹاپ آن کر کے وہ کوئی مووی دیکھنا چاہتا تھا لیکن سامنے اسکرین پہ ان دونوں کی ساتھ میں تصویر دیکھ کر بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ ان دونوں کی شاپنگ کے دوران ایک فوڈ کورٹ میں لی گئی تصویر تھی جو عشوہ کو بے حد پسند آئی تھی اسی لیے موحد نے اسے اپنے ڈیسک ٹاپ پہ لگا لیا تھا۔ کتنی دیر وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر لیپ ٹاپ بند کر کے لائٹ بجھا کر لیٹ گیا۔ نجانے کتنی دیر یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے اسے نیند آ گئی تھی۔

☆☆☆

صبح وہ اٹھ کر بالکونی میں چلا آیا جہاں سے سامنے عشوہ کا کمرہ دکھائی دیتا تھا۔ کمرے کے پردے بڑے ہوئے تھے۔ وہ اسی بالکونی میں کھڑے ہو کر اکثر اسے منایا کرتا تھا جب وہ اس سے ناراض ہوتی تھی۔ کان پکڑتا تھا، ہاتھ جوڑتا تھا۔ لیکن اب سب ختم ہوتے جا رہا تھا۔

وہ واپس اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔ کچھ دیر بعد اسے برابر والوں کے گھر سے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو چونکا۔ عشوہ اپنی گاڑی نکال رہی وہ تیزی سے نیچے بھاگا تھا۔

"عشوہ۔" گاڑی باہر نکال کر وہ گیٹ بند کر رہی تھی۔ آنکھوں پہ سن گلاسز لگائے، سادہ سے شلوار سوٹ میں، بالوں کی پونی بنائے کل جیسے حلیے میں ہی تھی۔ لیکن ہمیشہ سے زیادہ اداس۔

"کہیں جا رہی ہو۔؟"

"مارکیٹ تک جا رہی تھی۔ کچھ چیزیں لینا تھیں۔"

"میں ساتھ چلوں۔۔؟"

"کیا ضرورت ہے۔ میں خود جا سکتی ہوں۔"

موحد اسے دیکھ کر رہ گیا۔ دل کو عجیب بے چینی تھی۔ وہ جیسے اسے پانے سے ڈر رہا تھا اس سے زیادہ کھونے کی اذیت سے گزر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا سایہ بن کر ساتھ رہا تھا۔ اب کیسے اس سے جدا ہو رہا تھا۔ ٹھیک کہتی تھیں کہ وہ اس کے بنا ایک دن نہیں گزار سکتا، زندگی کیسے گزارے گا۔

"رکو عشوہ۔ تم بالکل غلط بات کر رہی ہو۔" وہ خاموشی سے سامنے ونڈ اسکرین کو دیکھتی رہی۔

موحد نے دو تین بار گہرے سانس لیتے ادھر ادھر دیکھا تا کہ خود کو نارمل کر سکے۔ پھر اسے دیکھا جو بالکل ساکت لیکن غصے میں تھی۔ بس ایک پل لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں۔

"ایک بات پوچھوں۔؟" وہ جھک کر گاڑی کے شیشے سے اندر جھانک رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

"اگر میں کہوں کہ یہ شادی نہ کرو تو۔" اس نے غصے سے موحد کو دیکھا۔

"میں پاگل ہوں کیا کہ تمہارے کہنے پہ انکار کر دوں گی۔۔؟" وہ کیوں اتنی سیدھی باتیں کر کے آج دل اسے آزما تا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ تم انکار کر دو میجر عدنان کے لیے کیوں کہ میں تم سے شادی کروں گا تو۔۔؟" عشوہ نے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا۔ بے یقینی سے وہ اسے دیکھنے لگی کیا اس کے کان بجے تھے۔

"میں معیز بھائی سے خود بات کروں گا اگر کبھی آنٹی سے بھی بات کر کے انھیں منا لوں گا۔ بس تم یہ بتا دو کہ تم اس آرمی والے اپنے بچپن کے دوست کے ساتھ گزارا کر لو گی۔۔؟" عشوہ کو لگا دھاڑیں مار مار کر رو دے گی۔ اس گدھے کو یہ سب کہنا کہاں جا کر یاد آیا تھا۔

"مجھے پہلے نہیں احساس تھا کہ تمہارا جانا مجھے اتنا بے چین کر دے گا۔ ابھی تو تم گئی بھی نہیں ہو تو یہ حال ہے، چلی گئیں تو کیا ہو گا میرا۔۔؟" سن گلاسز کے پیچھے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اسٹیئرنگ پہ رکھے ہاتھ کپکپانے لگے۔ وہ خود پہ قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو چلی تھی۔

"میں نہیں رہ سکتا عشوہ۔ سچ ہے کہ میں نہیں رہ سکوں گا۔ تمہاری اتنی عادت ہے کہ اب یہ چھوٹ نہیں سکتی۔" آنسو پھسل کر گالوں پہ بہنے لگے تھے۔

"اور تم بھی کہاں رہ پاؤ گی۔ تمہیں بھی تو ہر جگہ مجھے ڈھال بنانے کی عادت ہے۔" عشوہ نے سر اسٹیئرنگ پہ ٹکا دیا۔ موحد کی آنکھیں بھی نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"کیا صرف ہمیں عادت ہی ہے۔؟"

"مجھے تو محبت بھی ہے عشوہ۔" اور عشوہ کو لگا تھا کہ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی۔

"اتنی دیر کیوں کر دی کہنے میں موحد۔ پہلے کیوں نہیں کہا۔۔؟"

"تم جانتی ہو کہ میں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔ لیکن تم نے بھی تو مجھے نہیں روکا۔"

"میں کیسے روکتی۔ تم نے کہا۔ میں ویسی نہیں ہوں جیسی تمہیں چاہیے۔ پھر میں کیا کرتی موحد۔؟"

"مجھے تو بس تم ہی چاہیے ہو۔ کوئی ایسی ویسی کیسی نہیں۔ عشوہ تو عشوہ ہے۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

"پرسوں نکاح ہے موحد۔" اس نے یاد دلایا۔

"کچھ نہیں بگڑا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ تم ابھی اندر چلو۔ میں آنٹی سے بات کرتا ہوں اور معیز بھائی سے۔"

عشوہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ان سے میں خود بات کر لوں گی۔ ان سے ہمیشہ سے میں خود بات کرنے کے لیے تیار تھی اگر تم کہہ دیتے تو۔"

"تم سب سے بات کر سکتی تھیں، بس مجھ سے نہ کر سکیں۔"

"تم نے جو کہا تھا کہ۔" اس کی بات موحد نے بیچ میں کاٹ دی۔

"جاب بھی نہیں میری تو کس برتے پہ تمہیں کوئی امید دلاتا۔ ایک بہترین رشتہ تمہارے لیے موجود تھا، اس کے سامنے میری کیا اوقات تھی بھلا؟"

"تم کہتے تو۔ ایک بار کہتے تو۔ بچپن سے اب تک ہر بات ہم کہتے آئے ہیں اور جو کہنا تھی وہی نہ کہہ سکے۔"

موحد نے اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے نکالا۔ گاڑی لاک کی۔ اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ لاؤنج میں اسوہ آنٹی بیٹھی تھیں۔ ان دونوں کو یوں ساتھ دیکھ کر وہ ٹھٹکیں اور جیسے پھر انھیں سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔

"آنٹی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" عشوہ سر جھکائے اس کے برابر کھڑی تھی۔ نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اسوہ آنٹی نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔ سر ہلا کر بات کرنے کی اجازت دی۔

"آپ پلیز عشوہ کے اس رشتے سے انکار کر دیں۔" اسوہ نے سکون سے اس کی بات سنی۔

"میں عشوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"عشوہ کا تو نکاح ہے تمہیں بتایا تو تھا۔" وہ ذرا بن کر بولیں۔

"جانتا ہوں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ منع کر دیں۔"

"تم پہلے سوئے ہوئے تھے۔۔؟" کچھ غصہ دکھاتے ہوئے انھوں نے اسے گھر کا۔

"یہی سمجھ لیں کہ سو رہا تھا۔ اب جاگا ہوں۔" اسوہ آنٹی نے ذرا منہ بنایا۔ اتنی جلدی وہ ماننا نہیں چاہتی تھیں۔

"اب مشکل ہے۔ معیز کو کون منائے گا۔ وہ تو کبھی نہیں مانے گا۔" معیز کا نام سنتے ہی موحد خاموش ہو گیا۔

"مما! ان سے میں خود بات کر لوں گی۔" اسوہ نے چونک کر عشوہ کو دیکھا پھر مسکرا دیں۔

"بہت اچھا ہے۔ جاؤ پھر۔ وہ ڈرائنگ روم میں ہی ہے۔ بات کر لو اور اگر نہ مانے تو مجھے بلوا لینا۔" موحد نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

"مطلب آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔؟" وہ

مسکراتی رہیں۔
"میری اکلوتی بیٹی میری آنکھوں کے سامنے رہے، اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے میرے لیے۔ یوں بھی اعتراض کس بات پہ ہوگا۔ بھلا کم سے بہتر کوئی رشتہ آ سکتا ہے اس کے لیے۔۔۔؟"

"بھائی مان جائیں گے۔۔۔؟ ان کے اور صدمان کی فیملی کے زخم۔" عشوہ کچھ متذبذب تھی۔

"کون صدمان۔۔؟" اسوہ آنٹی نے یکدم کہا تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ گال پہ ایک انگلی سے دستک دیتی وہ سوچ کر توقف سے بولیں۔

"تمہارا اشارہ یقیناً صدمان کی طرف ہے شاید۔ وہی ناجس نے یہاں سے جاتے ہی اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔" دونوں کے لیے یہ جھٹکا خاصا شدید تھا۔

"انکار کر دیا۔۔؟ تو یہ سب کیا تھا۔۔؟" اسوہ آنٹی ان دونوں کو دیکھ کر ذرا مسکرائیں۔

"یہ سوانگ تھا جو میں نے رچایا۔"

"کس لیے مما۔۔؟" عشوہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ گئیں۔

"تاکہ اس سوئے ہوئے خرگوش کو جگایا جا سکے جو میری ریس میں احساس کے بغیر نیند پوری کر رہا تھا۔" موحد کے سر پہ ہلکی سی چپت لگا کر وہ ہنس دیں۔ دونوں بے یقین تھے۔

"اس نے تو جاتے ہی انکار کر دیا تھا۔ اسے موحد جیسے دوست کی تمہاری زندگی میں مداخلت نہیں بھائی تھی۔ اور یہ ہر جگہ ہی ہوتا تھا میں سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے یہ سب مجھے مجبوری میں کرنا پڑا۔"

عشوہ نے غور کیا تو واقعی جو کچھ بھی اسے بتایا جاتا رہا تھا، وہ مما ہی بتاتی تھیں۔ صدمان کو اس بات پہ اعتراض ہے وہ یہ کہتا ہے یوں کرتا ہے اس بات سے چڑتا ہے۔ ان کا یہ مطالبہ ہے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ یہ سب مما۔ بابا کو گھر کے کسی فرد نے اس سلسلے میں بھی بات ہی نہیں کی تھی کہ زیبل بھی جب سے آئی تھیں انھوں نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

"تو بھائی بھابھی کس تقریب کی تیاری کر رہے ہیں۔۔۔؟"

"زیبل کی فیملی میں کوئی شادی ہے۔ وہ سب تو اسی میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔" اسوہ نے محبت سے بیٹی کے گال چھوئے جس کا ہر سانس سانس لینے کے قابل ہو گیا تھا۔

"آپ تو بہت پہنچی ہوئی چیز ہیں آنٹی۔ میں تو آپ کا مرید ہو گیا ہوں۔" موحد کان کھجاتے ہوئے انھیں چھیڑ رہا تھا۔

"بیٹا تمہیں جو احساس نہیں تھا وہ برسوں پہلے مجھے ہو چکا تھا لیکن اس دن عشوہ کے منہ سے تمہاری طرف سے انکار سن کر میں سمجھ گئی تھی کہ تم ایک بڑی غلطی کرنے جا رہے ہو۔ اسی لیے یہ سب کرنا پڑا۔"

موحد دل سے ان کی حکمت عملی کا ممنون تھا۔

"مسئلہ تو وہی ہے کہ معیز بھائی کیسے۔۔۔؟" عشوہ ابھی تک متذبذب تھی۔

"اس سے میں بات کروں گی۔" اسوہ نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔

☆☆☆

اگلی صبح موحد جب اپنی بالکنی میں رکھی ایکسرسائز مشین پہ ایکسرسائز کرنے باہر نکلا تو سامنے لان میں معیز بھائی بھی اسی وقت ایکسرسائز کرتے دکھائی دیے۔ وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ ان کی نظر اس پہ پڑی اور انھوں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے نیچے آنے کو کہا۔

موحد ڈرتے ہوئے ان کے گھر کی طرف بڑھا۔

"کیا ضرورت ہے ایسوں سے تعلقات رکھنے کی مما۔ سوسائٹی میں اور لوگ مر گئے ہیں کیا؟" معیز بھائی آٹھ سالہ موحد کو دیکھ کر نخوت سے کہہ رہے تھے۔

موحد نے اپنا گیٹ کھولا اور باہر آیا۔

"کچھ لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ ان سے دوستی رکھی جائے، جتنی جلدی یہ بات آپ سمجھ جائیں اتنا اچھا ہے۔" موحد عشوہ کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا اور بچپن معیز کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔

سامنے لان چیئرز پہ وہ بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ موحد ان کے قریب پہنچ کر سلام کر کے نظریں جھکائے کھڑا ہو گیا۔ ایک عرصے سے اس نے معیز بھائی کا سامنا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس جگہ سے فرار ہونے کی کوشش کرتا تھا جہاں معیز بھائی موجود ہوں۔

"بیٹھو۔" سلام کا جواب دے کر انھوں نے کرسی اس کی طرف کھسکی۔ موحد خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جاب کی مبارک ہو۔ مما سے پتا چلا کہ ایک اچھی کمپنی میں تمہاری جاب ہو گئی ہے۔" پہلا پہاڑ حیرت کا تھا جو اس پہ ٹوٹا تھا۔ یہ معیز بھائی نہیں تھے۔ معیز بھائی اس سے ایسے بات نہیں کیا کرتے تھے۔

"کمپنی کا نام کیا ہے۔۔؟" اب وہ اس سے تفصیل جاننا چاہ رہے تھے۔

موحد نے تفصیلات بتانا شروع کیں تو وہ ایک دو جگہ واضح چونکے تھے لیکن پھر خاموشی سے سنتے رہے۔

"کیا تمہیں اب بھی لگتا ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے نفرت ہے اور میں تمہیں ناپسند کرتا ہوں۔۔؟"

یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ موحد کچھ نہیں بول سکا۔ وہ اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ تو بس اسی جھجک اور ڈانٹ کے لیے تیار ہو کر آیا تھا جو بچپن میں اسے معیز بھائی سے ملی تھی۔

"ماضی میں جو کچھ بھی میں نے کہا اور کیا وہ لڑکپن کی نادانی تھی یا جوانی کا زعم۔ لیکن اس سب کے لیے میں ہمیشہ پشیمان رہا ہوں۔ چھوٹوں سے معافی مانگنے کی اکثر بڑوں میں ہمت نہیں ہوتی اور میرا تو اتنا ظرف بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی بس اتنا کہوں گا کہ وہ ماضی تھا جو بیت چکا ہے۔ حال میں ایسا کچھ نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل میں ہوگا۔"

نجانے اسوہ نے ان سے کیا بات کی تھی لیکن وہ اس وقت ہمیشہ والے معیز بھائی نہیں لگ رہے تھے۔

"عشوہ میری اولاد جیسی ہے کیونکہ وہ ہماری اکلوتی بہن ہے۔ بابا کے بعد میں نے ہمیشہ کوشش کی اپنے بہن بھائیوں کا باپ بننے کی۔ شاید میں نہ بن سکا ہوں لیکن میں نے بھی کوشش ترک نہیں کی۔ اس کی خوشی مجھے مقدم ہے۔۔۔ مما اور وہ جب اس رشتے پہ خوش ہیں تو میرا اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یوں بھی تم ہر لحاظ سے اچھے لڑکے ہو۔ سو میری طرف سے بے فکر رہو اور یہ جان لو کہ میرے دل میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی شکایت،

ابن انشاء کی معروف کتابیں

آپ سے کیا پردہ	600/-	450/-
باتیں انشا جی کی	600/-	450/-
[illegible]	225/-	168/-
قصہ ایک کنوارے کا	225/-	168/-

مزید معلومات کے لئے فون کریں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32216361

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کوئی نفرت یا بغض۔ پھر بھی تمہاری تسلی نہ ہو تو۔" وہ اپنی جگہ کھڑے ہوئے تو وہ بھی تعظیم دیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ معیز بھائی نے بازو وا کر دیے۔

"بابا کا اسٹائل تھا کہ جب کسی سے ناراضی دور کرتے تو اسے گلے لگا لیتے تھے۔ میں بھی ان کے نقش قدم پہ چلنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

موحد حیرت زدہ ان کے وا ہوئے بازوؤں کی طرف بڑھا تو انھوں نے پرتپاک انداز میں اسے گلے لگا لیا۔ اس معانقے نے جیسے صدیوں کی جمی برف یوں پگھلائی کہ دلوں میں گرم لہو بن کر دوڑنے لگی۔ اس کی کمر تھپک کر انھوں نے اسے خود سے علیحدہ کیا۔

"تم کچھ نہیں کہو گے۔؟" وہ بالکل خاموش تھا۔ "میں آپ کے سامنے کبھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پایا۔" وہ اس کی بات پہ مسکرائے۔

"کیوں میں اتنا خوف ناک ہوں۔؟" موحد مسکرا دیا۔

"بچپن کا ڈر ہے۔ جاتے جاتے جائے گا۔" جو سچ تھا وہی اس نے کہا تھا۔

"موحد! عشوہ کو بہت خوش رکھنا۔" موحد کے اندر سے جیسے ایک مطمئن سی سانس خارج ہوئی تھی۔

"اتنا تو وعدہ کرتا ہوں۔" وہ جانتے تھے کہ وہ اس وعدے کو نبھائے گا۔ وہ بچپن سے عشوہ کی ڈھال بنا رہا تھا۔ ہمیشہ بنا رہے گا۔

وہ اندر کی جانب پلٹ گئے۔

"معیز بھائی۔" بے اختیاری میں وہ پکار بیٹھا۔ وہ ادیبہ باجی کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ جملے معافی کے، کچھ الفاظ تلافی کے۔ وہ مڑے تو اسے لگا کہ یہ عبث تھا۔ وہ ماضی کو دفن کر چکے تھے۔ اس نے نرم سی مسکراہٹ میں نفی میں سر ہلایا کہ اسے کچھ نہیں کہنا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھ کر واپس مڑ گئے۔

☆☆☆

نکاح اسی ویک اینڈ پہ ہوا تھا۔ عشوہ اور معیز عدنان کا نہیں، عشوہ اور موحد کا۔

نکاح کی تقریب میں عشوہ نے وہی سفید کامدانی فراک پہنا تھا جو اس روز موحد نے اس کی وارڈ روب میں لٹکا دیکھا تھا۔

نکاح کے بعد سامنے سے آتی عشوہ پہ جب اس کی پہلی نظر پڑی تو بڑی دیر تک رہی حتیٰ کہ صوفی کو اسے چھیڑنا پڑا۔ پہلی بار تھی کہ موحد نے اسے اس قدر تیار دیکھا تھا۔

"مجھے آج پتا چلا کہ تمہارا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا ہے۔" تصاویر بناتے ہوئے وہ سامنے دیکھتے اس کے کان کے قریب بولا تو عشوہ مسکرا دی۔

"کیوں اس سے پہلے تم نے نظر کا چشمہ نہیں لگایا تھا۔؟" وہ ایسے بول رہی تھی کہ اس کے لب ساکت دکھائی دیتے تھے لیکن آواز آ رہی تھی۔

"اس سے پہلے تم نے میک اپ نہیں کیا تھا اس لیے۔" دونوں بے ساختہ ہنسے تھے۔

تقریب کے دوران ادیبہ باجی بہت بے کل اور بے چین نظر آئی تھیں۔ کھانے کے بعد معیز بھائی موبائل لیے لان کے ایک کونے میں گئے تو ادیبہ باجی بھی ان کے پیچھے گئی تھیں موحد نے دیکھا تو وہ تیزی سے ان کے پاس گیا۔

ادیبہ باجی اسے سامنے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ موحد نے سر دائیں بائیں نفی میں ہلایا۔

"موحد! باجی کی آنکھوں میں آنسو گئے، میں اس سے ایک بار معافی مانگنا چاہتی ہوں۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں۔ وہ اس سب سے آگے نکل چکے ہیں۔"

ادیبہ باجی کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں پھر اس سے لپٹ کر رو دیں۔ موحد ان کا سر تھپکنے لگا۔

وہ اپنا آپ سنبھال کر واپس لوٹیں تو موحد بھی ان کے ساتھ تھا۔

کسی باڑھ کے پیچھے سے ایک سایہ تیزی سے پرے سرکا تھا کچھ بھرم قائم ہی رہنا چاہیے۔

وہ مطمئن تھے کہ کسی وقت پر ایک صحیح فیصلے نے ان کو پچھتاوؤں سے بچا لیا تھا۔

☆☆

قارئین بہنوں کے لیے خوش خبری

خواتین ڈائجسٹ گروپ آف پبلیکشنز
کے تمام پرچے آن لائن پڑھیں
قارئین بہنیں اب خواتین ڈائجسٹ، ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن
کے شمارے آن لائن بھی پڑھ سکتی ہیں
اس کے علاوہ مشہور مصنفین کے ان پرچوں میں چھپنے والے
تمام ناولز بھی آن لائن پڑھیں
قارئین خواتین ڈائجسٹ گروپ کی ویب سائٹ

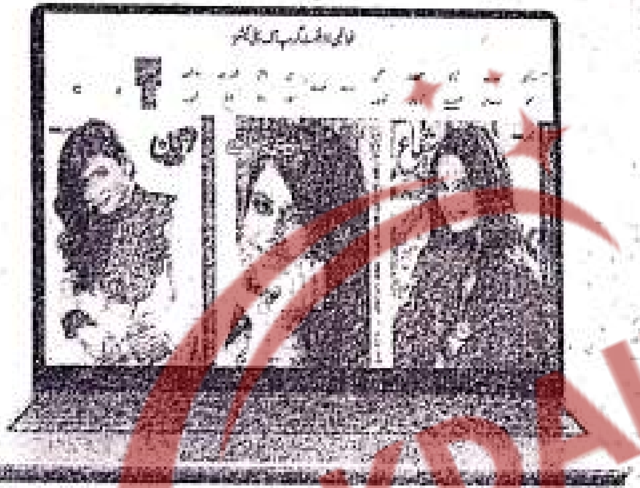

www.khawateendigest.com
پر جا کر تمام مشہور مصنفین کے ناولز، افسانے اور سلسلے پڑھ سکتے ہیں

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نگہت سیما

جھیلیں آئینے اور سائے

قاسم ملک لندن میں ایک انڈین لڑکی سے شادی کرلیتے ہیں ان کا ایک بیٹا ہے۔ وہ اپنے بیٹے عثمان کو پاکستان اپنے بڑے بھائی بھاوج سے ملوانے لاتے ہیں جہاں بھابھی کی بھانجی ماہی جوان کی منہ بولی بیٹی بھی ہے سے اس کا رشتہ کردیا جاتا ہے۔ لندن واپس آکر ملک قاسم کینسر کا شکار ہوکر انتقال کرجاتے ہیں۔ ان کی بیگم سلمیٰ ان کی میت پاکستان نہیں بھیجنا چاہتیں لیکن عثمان میت پاکستان اپنے تایا ہاشم ملک کے پاس لے جاتا ہے۔ سلمیٰ عثمان کی شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی ہیں لیکن عثمان انہیں ماہی کے بارے میں بتاتا ہے وہ انکار کردیتی ہیں۔

دوسری اور آخری قسط

"وقت آنے پر دیکھا جائے گا اس وقت میں تھک چکا ہوں اور سونے جا رہا ہوں۔" وہ اس وقت مزید بات نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔

"وہ لڑکی کوئی جادوگرنی ہے یا ساحرہ۔" وہ چلائیں تو ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ نمودار ہوئی۔

"جب آپ میری شادی پر پاکستان جائیں گی تو دیکھ لیجیے گا کیسی ہے وہ جادوگرنی۔"

"اس خیال میں مت رہنا عثمان، کہ میں تمہاری شادی میں شریک ہوں گی۔" ماتھے پر بل ڈالے وہ غصے سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"پہلے وہ وقت تو آئے مام! پھر دیکھا جائے گا۔ شادی تو مجھے بہر حال ماہی سے ہی کرنی ہے۔" تحمل سے کہتا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ابھی اس نے اپنی تعلیم مکمل کرنی تھی پھر اچھی سی جاب اور پھر کہیں جا کر وہ خود کو اس قابل سمجھے گا کہ ماہی کو اپنی زندگی میں شامل کرلے۔ شاید اس میں دو سال سے کچھ زیادہ وقت لگ جائے۔

ایک روز اس نے ہاشم ملک سے کہا تھا۔

کرلیا ہے۔ سوچ رہا ہوں اسے گریجویشن کے لیے شہر میں کسی کالج میں داخل کروادوں۔ تاکہ شہروں میں رہنے کے رنگ ڈھنگ سیکھ لے اور پھر اسے ہم سے دور رہنے کی عادت بھی ہوجائے ایک دم تمہارے ساتھ اتنی دور جا کر وہ پریشان نہ ہوجائے ایڈجسٹ ہی نہ کرسکے۔"

"لیکن اسے تو شہر سے ڈر لگتا ہے بابا۔" وہ بے اختیاری کہہ بیٹھا تھا۔

"ہاں...... وہ تو یہ ہی کہتی ہے لیکن ریگولر ایجوکیشن اور پرائیویٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گو تمہاری بڑی اماں نے بہت محنت سے پڑھایا۔ میٹرک بھی اچھے لیے ہیں اس نے لیکن میری خواہش ہے وہ کسی اچھے کالج سے گریجویشن کرلے۔"

وہ خود کالج میں پڑھاتے تھے صالحہ آپا اور ناہید آپا نے بھی شہر کے ہوسٹل میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی تھی سو ماہی کے لیے بھی وہ ایسا ہی چاہتے تھے لیکن وہ سدا کی ڈرپوک اس نے صاف انکار کردیا تھا شہر جانے سے۔ پھر پتا نہیں کیسے وہ راضی ہوگئی تھی۔

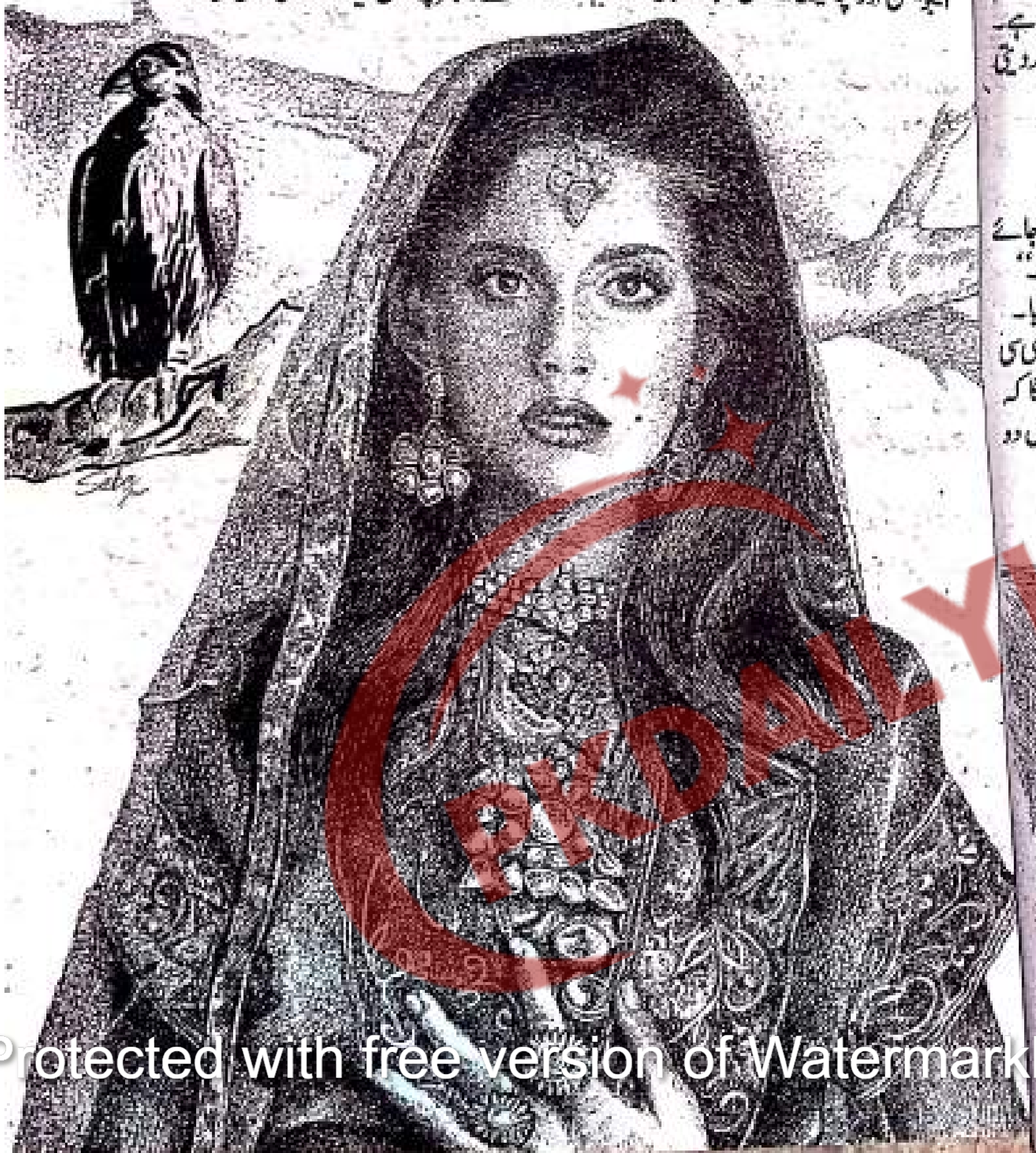

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بہت سارے دن جب اس کی ماہی سے بات نہ ہوئی تو اس کے پوچھنے پر بڑی اماں نے بتایا کہ وہ شہر چلی گئی ہے پڑھنے۔

"چلو اچھا ہے۔ بابا کی خواہش تھی کہ وہ ریگولر بی اے کرلے۔"

☆☆☆

وقت اسی انداز میں گزر رہا تھا اس کی مصروفیات اور ماما کی وہی سرگرمیاں۔ پھر اس نے تعلیم بھی مکمل کرلی اور شان دار جاب بھی مل گئی لیکن اپنے بے حد مصروف شب روز میں اسے احساس ہی نہ ہوا کہ ہاشم ملک اب بہت مختصر بات کرتے تھے۔ بڑی اماں بھی بس ہوں ہاں ہی کرلی تھیں کو وہ اس طرح ہفتہ دس دن بعد انہیں فون کرتا تھا اور اگر کبھی اسے تاخیر ہو جاتی تو ہاشم ملک فون کرکے اس کی خیریت معلوم کرلیتے تھے لیکن ماہی کی آواز سننے کو تو وہ ترس ہی گیا تھا۔

ایسا عجیب اتفاق تھا کہ جب کبھی وہ ماہی کے متعلق پوچھتا بڑی اماں جیں۔

"اس ویک اینڈ پر وہ صادق کی طرف چلی گئی ہے۔ گاؤں آئی ہی نہیں۔"

کبھی پتا چلتا کہ آئی تو تھی بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی نکلی ہے شہر کے لیے۔ اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے اس کی ماہی سے بات ہی نہ ہوسکی۔ خیر وہاں جاکر خوب باتیں کروں گا۔ اس نے چھٹی کے لیے اپلائی کرتے ہوئے سوچا تھا۔

جس روز اس کی چھٹی منظور ہوئی۔ اس روز ماما نے اسے بتایا کہ وہ دسمبر کی چھٹیوں میں اپنی فرینڈز کے ساتھ گھومنے جارہی ہیں فرانس۔

"لیکن ماما میں نے دسمبر کی چھٹیوں کے ساتھ ملا کر تین ہفتے کی مزید چھٹیاں لی ہیں۔ جب سے میں انتظار کر رہا تھا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں پاکستان جائیں اور اپنی چھٹیاں ملا کر ہمارے پاس وہاں رہنے کے لیے زیادہ وقت ہوگا۔ آپ اپنی فرینڈز کے ساتھ تو جاتی ہی رہتی ہیں۔ اس بار آپ کو میرے ساتھ پاکستان چلنا ہے۔"

"تمہاری شادی میں شرکت کے لیے۔"

"ظاہر ہے میں اسی لیے پاکستان جا رہا ہوں ڈیڈ کو رخصت ہوئے تین برس ہو گئے ہیں اور میں نے تایا جان سے کہا تھا کہ دو برس۔"

"اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے تمہاری شادی میں شرکت نہیں کرنا اور نہ ہی پاکستان جانا ہے کہ مجھے ماہی کے ساتھ تمہاری شادی منظور نہیں۔" ماما نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"یہ آپ کا حتمی فیصلہ ہے ماما؟"

وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"لیس...... یوں بھی ہم نے بکنگ کروالی ہے ہر جگہ۔ ہاں اگر ماہی کے ساتھ شادی کرنے کا تمہارا ارادہ بدل جائے تو مجھے بتا دینا۔ بہت دھوم دھام سے تمہاری شادی کروں گی ماہی کے علاوہ کوئی بھی لڑکی۔"

بھلا ماہی سے ماما کو اتنی نفرت کیوں ہے حالانکہ نہ وہ کبھی اس سے ملیں نہ کبھی دیکھا۔ بس بلاوجہ کی ضد۔

وہ اداسی سے سوچتا رہا لیکن اس نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جانتا تھا انہوں نے جو کہہ دیا ہے وہ ایسا ہی کریں گی۔

خفگی کے جانے کے بعد اس نے بھی پاکستان کے لیے سیٹ بک کروالی۔ ہاشم ملک کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ سرپرائز دینا چاہتا تھا بس وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ماما کے نہ آنے کا سن کر بابا اسے منع ہی نہ کردیں کہ ماما کو راضی کیے بغیر نہ آنا۔ وہ جانتا تھا کہ ماما کبھی راضی نہیں ہوں گی۔ وہ ان کے روبرو بیٹھ کر اپنا موقف سمجھانا چاہتا تھا کہ ماما کی اپنی زندگی ہے اور انہیں حقیقت میں اس کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

بابا اور بڑی اماں کی سوچ روایتی تھی، وہ یقیناً ماما کی شمولیت کو ضروری سمجھیں گے جبکہ ڈیڈ بھی نہیں تھے لیکن وہ اس سے اتنی محبت کرتے تھے کہ وہ انہیں قائل کرے گا، اگر انہوں نے چاہا تو وہ وہاں پاکستان میں ہی کہیں جاب کرے گا۔

اس نے ایئرپورٹ سے ٹیکسی لے لی تھی۔ پھر ایئرپورٹ سے گاؤں تک کے تین چار گھنٹے مختلف سوچوں میں گزر گئے۔

ماہی تو اب گریجویشن کرکے واپس آگئی ہوگی۔ لیکن پھر اس نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔ شاید بڑی اماں نے اسے میرے اور اس کے رشتے کے متعلق بتا دیا ہو اسی لیے وہ مجھ سے بات نہیں کرتی۔ مشرقی لڑکیاں شادی سے پہلے اپنے منگیتر سے بات نہیں کرتیں، وہ شالی بھی تو منگیتر کے نام پر ہی شرما جاتی تھی اور وہ بھی مجھے دیکھ کر شرما جائے گی۔ بھاگ کر کمرے میں چھپ جائے گی۔

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ گھر کے گیٹ تک وہ مختلف کیفیات میں گھر رہا تھا۔ کبھی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور کبھی پتا نہیں کیوں یک دم دل ڈوبنے لگتا اور جب کندھے پر بیگ ڈالے بڑا سا ٹرالی بیگ گھسیٹتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔

ہاشم ملک کے گھر کا دروازہ صبح سے شام تک اندر سے لاک نہیں ہوتا تھا۔ بڑی اماں کے پاس گاؤں کی عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سامنے ہی خورشیداں صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ خورشیداں کو سے ہوئی ہوئی اس کی نظر برآمدے پر پڑی، برآمدہ ویران پڑا تھا۔ حالانکہ اس وقت بڑی اماں تخت پر بیٹھی کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہوتیں اور پاس ہی ماہی بیٹھی ہوتی۔

"عثمان بابو۔"

خورشیداں نے اسے دیکھتے ہی جھاڑو پھینک دی تھی اور بلند آواز میں بولی تھی۔

"ملک صاحب! بی بی جی! عثمان بابو آئے ہیں۔" اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ یقیناً اندر کمرے تک گئی تھی کہ تب ہی ہاشم ملک کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلے اس سے پہلے کہ وہ خورشیداں سے کچھ پوچھتے وہ ٹرالی اور شولڈر بیگ صحن میں ہی پھینک کر برآمدے کی طرف لپکا۔

"بابا"

لمحہ بھر کی حیرانی کے بعد ہاشم ملک بھی بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ ان کے گلے لگا ہوا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچے کھڑے رہے اور ان کے آنسو اس کے کندھوں پر گرتے رہے۔

"بس کریں ملک صاحب! اچھا تھکا ہوا اتنا لمبا سفر کرکے آیا ہے۔" بڑی اماں نے جوان کے پیچھے ہی کمرے سے نکلی تھیں، ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومی۔

"تم اچانک بغیر اطلاع کے آگئے۔ اپنی آمد کی اطلاع دے دیتے تو ایئرپورٹ پر لینے آجاتا۔"

"سرپرائز کے چکر میں اطلاع نہیں دی ہوگی۔"

اس کے بجائے بڑی اماں نے جواب دیا تو وہ اطمینان کا سانس لے کر ان کے سامنے جھک گیا۔ انہوں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر پیار کیا اور کمرے میں چل کر آرام سے بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے متلاشی نظروں سے پہلے کچن اور پھر کمروں کے بند دروازوں کی طرف دیکھا کہ یقیناً ماہی کسی دروازے یا کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھ رہی ہوگی۔ خود بخود ہی ایک مدھم سی مسکراہٹ آکر اس کے لبوں پر ٹھہر گئی اور اسے یقین ہوگیا کہ ماہی اس کے اور اپنے رشتے کے متعلق جان چکی ہے ورنہ بے تکلفی سے آکر ملتی۔ ہاشم ملک اسے اپنے بازو کے حلقے میں لیے ہوئے کمرے میں آئے اور بڑی اماں خورشیداں کو ہدایت دینے لگیں۔

"صحن سے عثمان کا سامان اٹھا کر کمرے میں رکھواؤ اور پھر ناشتا بناؤ۔"

وہ خورشیداں کو ناشتے کے متعلق ہدایات دے کر کمرے میں آئیں تو ہاشم ملک نم آنکھوں سے اسے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دیکھ رہے تھے۔

"قاسم تمہاری عمر کا تھا تو بالکل تمہاری طرح لگتا تھا۔ پچھلی بار جب تم آئے تو ذرا دبلے پتلے سے تھے لیکن اب تمہارا جسم کچھ بھر گیا ہے تو بالکل قاسم کی طرح لگنے لگے ہو۔ تم قاسم سے بہت مشابہ ہو عثمان ویسے ہی گھنگھریالے بال ویسی ہی آنکھیں اور ویسا ہی قد بت تمہیں دیکھتا ہوں تو نظروں کے سامنے قاسم آجاتا ہے۔"

"بھابھی سلمیٰ کیسی ہیں عثمان!" بڑی اماں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"مام تو ان دنوں فرانس گئی ہوئی ہیں۔ دراصل ان کا پہلے سے اپنی فرینڈز کے ساتھ پروگرام تھا۔ بکنگ وغیرہ کروا رکھی تھی۔ میں نے چھٹیوں کے لیے اپلائی کر رکھا تھا تو بس پھر جیسے ہی چھٹی ملی میں نے سیٹ بک کروالی۔ پہلے ہی تاخیر ہوگئی تھی۔ دو سال بعد آنے کا وعدہ کیا تھا اور"

اس نے نظریں جھکالیں۔

"جیسے اللہ کی رضا ہو جب جس وقت جہاں کا دانہ پانی لکھا ہو، ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ انسان کے اختیار میں تو کچھ نہیں ہے۔"

بڑی اماں کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اب جلدی سے فریش ہوجاؤ میں نے تمہارے واش روم میں دھلا ہوا تولیہ بھجوا دیا ہے۔ کپڑے نکال کر دے دو۔ پریس کروا کر دیتی ہوں۔ خورشیداں ناشتا تیار کر رہی ہے۔ تم نے بھی یقیناً قاسم کی طرح جہاز میں کچھ نہیں کھایا ہوگا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اٹھا اور پھر باہر جاتے جاتے رک کر ہاشم ملک کی طرف دیکھنے لگا۔

"عبدالرحمٰن کیسا ہے کیا کر رہا ہے؟"

وہ ماہی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن جھجک گیا۔

"عبدالرحمٰن لاہور چلا گیا تھا پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا اور اب ایم فل کر رہا ہے فزکس میں۔"

ہاشم ملک اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"اور ماسٹر صاحب ان کے گھر والے؟"

"سب ٹھیک ہیں اللہ کا شکر ہے۔ شمائل کی شادی ہوگئی ہے۔ اور وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی گئی ہے۔ چھ سات مہینے بعد چکر لگتا ہے اس کا۔"

"ماہی تو بہت اداس ہوگی اپنی اکلوتی سہیلی کے اتنے دور جانے پر۔" بالآخر اسے ماہی کے متعلق بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"ہوں!" مدھم آواز میں سر ہلاتے ہوئے ہاشم ملک نے نظریں چرائیں تو وہ کچھ الجھا الجھا سا باہر آیا۔ لیکن خود اسے اپنی الجھن کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

برآمدے میں رک کر اس نے ماہی کو دیکھنے کے لیے چاروں طرف نظر دوڑائی باورچی خانے کے کھلے دروازے سے خورشیداں پراٹھے بیلتی نظر آرہی تھی۔ ماہی کچن میں نہیں تھی۔ اسے وہاں ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہمیشہ وہ بڑی اماں یا خورشیداں کی مدد کے لیے کچن میں موجود ہوتی تھی۔ پھر وہ کہاں تھی۔ وہ الجھا الجھا سا اس کمرے کی طرف چل دیا جو مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔

پچھلی بار بھی وہ اسی کمرے میں ٹھہرا تھا اور جب بابا کے ساتھ آیا تھا تب بھی اسی کمرے کے ساتھ ٹھہرا تھا تب بھی تھا۔ بڑی اماں ایک چھوٹی لڑکی کے ساتھ کمرے میں کھڑی بیڈ شیٹس تبدیل کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔

"جلدی سے فریش ہو کر اپنے تایا جان کے کمرے میں آجانا ناشتا وہاں ہی لگوائی ہوں۔" اور وہ بڑی اماں سے پھر ماہی کے متعلق پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ ماہی کہاں ہے۔ وہ نظر کیوں نہیں آرہی اس سوال کا جواب اسے ناشتے کے بعد ملا تھا۔

"ماہی کو اس کے والد اپنے ساتھ لے گئے ہیں عثمان!"

ہاشم ملک اس کی متلاشی نظروں کا مطلب سمجھ رہے تھے لیکن ناشتے کے بعد انہوں نے بتایا۔

"لیکن کیوں بابا!" وہ بے حد حیران ہوا تھا۔

"باپ ہے اس کا ماہی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اسے کسی جواز کی ضرورت نہیں تھی عثمان۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"لیکن آپ نے بتایا تھا کہ وہ گریجویشن کے لیے۔" وہ ابھی تک حیران تھا۔

"ہاں۔ تمہارے بابا چاہتے تھے وہ کسی اچھے کالج سے گریجویشن کرلے۔ وہ اس چھوٹے سے گاؤں سے کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔ تمہارے بابا کو لگتا تھا کہ یک دم یہاں سے نکل کر تمہارے ساتھ ایک دوسرے ملک کے بڑے شہر میں اسے ایڈجسٹ ہونے میں مشکل ہوگی۔ ہاسٹل میں رہ کر۔ کالج میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے سے اس کے اندر اعتماد پیدا ہوگا اور ابھی اسے شہر گئے دو تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کا باپ آگیا اسے لینے اس روز وہ ویک اینڈ پر گھر آئی ہوئی تھی۔"

بڑی اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"لیکن بڑی اماں! وہ آپ کی بیٹی تھی۔ آپ نے اسے پالا تھا۔ آپ نے اسے کیوں جانے دیا۔" وہ بے چین سا پوچھ رہا تھا۔

"ہاں بیٹی کی طرح ہی تھی۔ صالحہ، ناہید سے زیادہ پیاری تھی مجھے لیکن سگی بیٹی نہیں تھی۔ وہ اس کا باپ تھا۔ اس کا حق تھا۔" ان کے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔

"کیا آپ کا کوئی حق نہیں تھا بڑی اماں کہ آپ اسے روک لیتیں۔" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

بڑی اماں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بس ان کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے تھے۔

"وہ کبھی کبھی ملنے تو آتی ہوگی نا۔" وہ نگاہوں میں ایک آس لیے انہیں دیکھنے لگا۔

"نہیں۔" بڑی اماں نے نفی میں سر ہلایا۔

"دو سال ہونے والے ہیں اس سے بچھڑے، کوئی چھ ماہ پہلے صالحہ کے گھر دس پندرہ منٹ کے لیے آئی تھی وہ میں نے تو جی بھر کر اسے دیکھا ہی نہیں اور وہ چلی گئی۔"

انہوں نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔ ذکر تک نہیں کیا۔"

اس نے گلہ کرتی نظروں سے ہاشم ملک اور بڑی اماں کی طرف دیکھا "تنہا اس دکھ کو جھیلتے رہے۔"

"تمہارے اپنے بہت مسائل تھے عثمان! قاسم کے بعد تمہیں سروائیو کرنے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ پڑھائی، جاب گھر کی ذمہ داری، میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔" ہاشم ملک نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"ہم نے سوچا تھا تم اپنی زندگی میں سیٹ ہو کر جب یہاں آنے کا پروگرام بناؤ گے تو ہم تمہیں بتا دیں گے لیکن۔"

بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے پھر سر جھکا لیا تھا۔

"عثمان!" بڑی اماں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی کی خواہش تھی کہ تمہاری ماہی کے ساتھ شادی ہو۔ شاید اس طرح وہ تمہیں ہم لوگوں سے جوڑے رکھنا چاہتے تھے۔ گو ہمارے لیے ماہی کو اتنی دور بھیجنا مشکل تھا۔ لیکن تمہارے بابا قاسم کو انکار نہیں کرسکتے تھے۔ ہم تو بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب تم آؤ گے تو ہم اپنی ماہی کی شادی دھوم دھام سے کریں گے لیکن۔"

"آپ نے انہیں بتایا نہیں۔ ماہی کے والد کو کہ آپ ماہی کا رشتہ طے کرچکے ہیں۔"

اس نے بے چینی سے بڑی اماں سے پوچھا جو بات کرتے کرتے یک دم خاموش ہوگئی تھیں۔

"بتایا تھا کہا تھا کہ آپ کی بیٹی ہے، آپ کا حق ہے کہ آپ بھی اسے اپنے ساتھ رکھیں لیکن یہ آپ

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے پاس ہماری امانت ہے۔ اس کا رشتہ میرے بھتیجے کے ساتھ طے پا چکا ہے۔ اور بہت جلد ہم اس کی رخصتی کی تاریخ لینے آپ کے پاس حاضر ہوں گے۔"

ہاشم ملک نے جو اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے بولے بڑی اماں اب چپ چاپ نگاہیں جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں اور پھر وہ یوں ہی نگاہیں جھکائے جھکائے بولیں۔

"ماہی جو رو رہی تھی، پریشان سی بھی مجھے اور کبھی تمہارے بابا کو دیکھتی تھی یک دم اس کی آنکھوں میں پہلے حیرانی سی نظر آئی اور پھر ان میں جگنو سے چمکنے لگے۔ وہ بے اختیار ہی میرے گلے لگ گئی تھی اور میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ٹھیک ہے بڑی اماں، ان سے کہیے گا جلد آئیں قاسم چاچو کی طرح سال نہ لگا دیں۔"

میں نے اس کی پیشانی چومی تھی۔ اور اسے یقین دلایا تھا کہ ان شاء اللہ بہت جلد ہم اسے دھوم دھام سے بیاہ کرلے آئیں گے۔ لیکن ہم انسان..... اور ہمارے فیصلے۔"

انہوں نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

"مقدر کے لکھے کے آگے ہار جاتے ہیں عثمان! ہم تمہیں فون کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہم نے سنا کہ اس کے باپ نے اس کا رشتہ اس کی سوتیلی اماں کے بھانجے سے طے کر دیا ہے کہ سگے باپ کے ہوتے ہم کون ہوتے ہیں اس کا رشتہ طے کرنے والے پھر بھی ہم گئے تھے اس کے باپ کے پاس لیکن اس نے ہماری ایک نہ سنی اور ماہی کی شادی کر دی۔"

"نہیں۔" اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بالکل خالی ہو گیا ہو۔ ویران، صحرا جیسا جہاں دھول اڑتی ہو۔ کچھ دیر پہلے تک یہ دل کتنا آباد تھا، کتنی رونق تھی وہاں ماہی کی رفاقت کے تصور نے کتنے رنگ پھیلا دیے تھے۔ ملنے والی رفاقتوں اور محبتوں کے رنگ لیکن اب اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔ اب کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔ وہ جو مسلسل تین برس سے اس کے دل کی دنیا آباد کیے ہوئے تھی۔ اب کسی اور کے شبستان میں روشنی بن کر دمک رہی ہوگی۔

ہاشم ملک نے اس کی کھوجتی نظروں کو بھی دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں بجھتی روشنیوں کو بھی اور جب کبھی فون پر وہ ماہی کے متعلق پوچھتا تو اس کے لہجے سے چھلکتے اشتیاق اور محبت کو بھی محسوس کرتے تھے وہ خوش ہوتے تھے کہ اس نے اس رشتے کو، پورے خلوص اور محبت کے ساتھ قبول کیا ہے اب اس کی آنکھوں کی بجھتی روشنیاں دیکھ کر دل میں ایک احساس ندامت جاگ اٹھا تھا۔ وہ کیسے دل گرفتہ سا سر جھکائے کسی ایسے ہارے ہوئے شخص کی طرح بیٹھا تھا جس کا سارا سفر رائیگاں گیا ہو۔ کیا تھا اگر قاسم نے اس کے لیے ماہی کو نہ مانگا ہوتا اور اگر قاسم نے ایسی کوئی خواہش ظاہر کی ہی تھی تو انہوں نے اس سے اس کا ذکر نہ کیا ہوتا۔ اس نے تو شاید ماہی کے حوالے سے ایسا کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ یہ تو وہ تھے جنہوں نے اس کے دل میں ماہی کا خیال پیدا کیا تھا۔

انہوں نے بے اختیار اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"عثمان..... بیٹا! مجھے معاف کر دینا کاش میں نے تم سے ماہی کی شادی کی بات نہ کی ہوتی تو آج تم اتنی اذیت میں نہ ہوتے۔"

"ایسا مت کہیں بابا۔ یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں آپ کا اس میں بھلا کیا قصور۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت تھک گیا ہوں کچھ دیر آرام کروں گا۔"

"ہاں بیٹا! سفر بھی تو بہت لمبا تھا۔ کچھ دیر آرام کرلو۔" بڑی اماں بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

اور وہ بڑی اماں اور ہاشم ملک سے نظریں چراتا ہوا ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ آنکھیں جل رہی تھیں لیکن اندر کہیں جل تھل ہو رہا تھا اور آنسو بھل بھل بہتے تھے یہ کیا ہو گیا تھا۔

وہ سارے سپنے محبتوں کے رفاقتوں کے بکھر گئے تھے۔

مہمانوں والے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ پل بھر کو برآمدے میں رکا اور اس کی نظروں نے جیسے اب بھی اسے چاروں اور کھوجا تھا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ جو ایک چاندنی رات میں چپکے سے اس کے دل میں آ کر براجمان ہو گئی تھی۔

وہ جس کی آنکھیں سیاہ جھیلیں تھیں۔

سیاہ جھیلیں۔ جن میں کتنی خزانے چھپے تھے۔

وہ تھکا ہارا الٹا ہوا سا بیڈ پر آ کر گر گیا اور تکیے پر سر رکھتے ہی آنکھوں سے گرم سیال بہہ نکلا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کب وہ ماہی سے اتنی محبت کرنے لگا تھا کہ اسے کھو دینے کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا کبھی لیٹ جاتا۔ کبھی آنکھیں یوں جلنے لگتیں جیسے ان میں دور تک پانی کی بوند تک نہ ہو اور کبھی یک دم برسات امڈ آتی۔ بہت دیر اسی بے چین سی کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے تکیے پر سر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا کہ ایک تو سفر کی تھکاوٹ تھی اور پھر پچھلی دو راتوں میں وہ ٹھیک سے سو ہی نہیں سکا تھا۔ اس لیے کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ سو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بڑی اماں باہر تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔

"تم جاگ گئے بیٹا! دو بار تمہارے کمرے میں گئی تم گہری نیند سو رہے تھے۔ چادر نہیں سرکنے دی تھی اس لیے کھانے کے لیے نہیں جگایا اب کھانا لگواتی ہوں۔"

وہ اٹھنے لگیں تو اس نے انہیں منع کر دیا۔

"نہیں۔ اس وقت صرف چائے پیوں گا۔"

بڑی اماں نے خورشیداں کو جو سامنے صحن میں کچھ کام کرتی نظر آ رہی تھی آواز دے کر چائے کے لیے کہا۔

"بابا کمرے میں ہیں کیا؟"

"نہیں وہ عصر کی نماز کے لیے گئے تھے۔ ابھی تک آئے نہیں۔ شاید کوئی راستے میں مل گیا ہوگا یا پھر قبرستان چلے گئے ہوں۔"

"چائے پی کر میں بھی قبرستان جاؤں گا۔"

"تمہارے بابا باقاعدگی سے ہر صبح قبرستان جاتے ہیں کسی روز نہ جا سکیں تو شام کو چلے جاتے ہیں۔"

اس نے بڑی اماں کی بات سن کر سر ہلایا اور سامنے صحن میں دیوار کے ساتھ بنی کیاریوں میں بھوری چڑیوں کو پھدکتے دیکھنے لگا۔ پورے گھر میں خاموشی تھی اور اگر ماہی ہوتی تو رونق لگائے رکھتی تھی۔ صرف ایک ماہی کے نہ ہونے سے اس گھر کے اندر زندگی کتنی خاموش اور ساکت سی لگ رہی تھی۔ اس کے ہونے سے کتنی ہلچل ہنگامہ اور رونق کا احساس ہوتا تھا کتنے ہی خاموش لمحے دبے پاؤں گزر گئے۔ بڑی اماں تسبیح کے دانے نیچے گراتی رہیں اور وہ صحن میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھتا رہا تب ہی خورشیداں نے چائے تخت کے سامنے رکھی پلاسٹک کی ٹیبل پر رکھی۔

"وہ خوش تو ہے نا بڑی اماں۔" اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"خوش!" بڑی اماں نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔ "کاش وہ خوش ہوتی تو ہم صبر کر کے اس کی جدائی سہہ لیتے کہ بیٹیوں کو تو ایک دن جدا ہونا ہی ہوتا ہے یہ ہجر تو ازل سے لکھا ہے۔ لیکن وہ خوش نہیں ہے عثمان بیٹا، بالکل بھی خوش نہیں ہے۔ ہم تو دل کو تسلی دیے بیٹھے تھے کہ باپ نے دیکھ بھال کر ہی رشتہ کیا ہوگا ہمارے عثمان کا نصیب نہیں تھی جس کا بھی نصیب بنی ہو۔ اس کے گھر میں اس کے دم سے چراغاں رہے۔ لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ ہماری ایک بھی دعا قبول نہیں ہوئی اور ہماری ماہی وہاں کتنی تکلیف اور اذیت میں ہے۔" انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے رخساروں پر بہہ آنے والے آنسوؤں کو پونچھا۔

"آپ..... آپ کو کس نے بتایا وہ تکلیف میں ہے۔" وہ پریشان سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

"سات آٹھ ماہ پہلے صالحہ کے پڑوس میں نئے کرایہ دار آئے اور یہ نئے کرایہ دار کوئی اور نہیں ماہی کے سسرال والے تھے۔ اتفاق سے اس روز میں

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

صالحہ کے ہاں ہی گئی ہوئی تھی۔ صالحہ نے بتایا کہ پڑوس میں نئے کرائے دار آئے ہیں۔ صبح ملازمہ کے ہاتھ میں نے کھانا بھجوایا تھا کہ گھر وغیرہ سیٹ کر رہے ہوں گے کہاں کھانا پکائیں گے سوچ رہی ہوں شام کو خود جا کر سلام دعا کر آؤں اور پوچھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

"میں نے کہا ضرور جاؤ بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" ابھی ہم باتیں کر رہی رہے تھے کہ وہ آگئی۔ وہ برتن واپس کرنے آئی تھی۔ ماہی...... لیکن عثمان، وہ میری ماہی تو نہیں تھی وہ تو کوئی اور تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، رنگت زرد، دائیں رخسار پر نیل، میں نے تڑپ کر اسے گلے لگایا۔

"ماہی میری بچی...... یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

لیکن اس نے تو زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا بس آنسو بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر صالحہ سے التجا کی کہ ان لوگوں کو ہمارے رشتے کا پتا نہ چلے۔ پھر وہ صالحہ کے روکنے پر بھی نہیں رکی۔ اور اس کے آنسو، وہ آنسو جو اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے تھے یہاں۔" انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ "یہاں میرے دل میں منجمد ہو گئے ہیں عثمان!" ان کی آنکھیں پھر چھلکنے لگی تھیں۔

"اس کے سسرال والے کسی سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتے۔ ماہی تو کہیں پڑوس میں آتی جاتی نہیں لیکن اس کی ساس بھی کبھار کہیں کسی کے ہاں چلی جاتی ہے۔ صالحہ نے چھت پر سے اسے اپنے گھر کے صحن میں جھاڑو لگاتے اور برتن دھوتے ایک دوبار دیکھا۔ لیکن اس روز کے بعد وہ صالحہ کے گھر آئی ہی نہیں۔

صالحہ بھی ادھر گئی لیکن ادھر ادھر سے پتا چلا کہ اس کا شوہر کوئی کام وغیرہ نہیں کرتا نشے کی بھی عادت ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی بات پر ماہی کو مارتا ہے۔ گھر میں اس کی ماں اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ یہ اس کی دوسری شادی ہے۔"

"اور آپ نے اس کے والد سے کوئی بات نہیں کی۔ پوچھا نہیں کہ یہ ظلم کیوں کیا انہوں نے؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ دل جیسے ماہی کی تکلیف کے خیال سے پھٹا جاتا تھا۔

"تمہارے بابا گئے تھے لیکن الٹا اس کی سوتیلی ماں ہمیں ہی الزام دینے لگی کہ ہم نے اس کی صحیح تربیت نہیں کی۔ وہ زبان چلاتی ہو گی تب ہی مار کھاتی ہے اور یہ کہ اس کے بھانجے کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ باپ کی چار دکانیں ہیں جن کا کرایہ آتا ہے۔ آہ کیسی بے بسی ہے عثمان، میری پھول جیسی بچی جسے شہزادیوں کی طرح پالا تھا میں نے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

وہ بے بسی سے اپنے نچلے لب کو دانتوں سے کچلتا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ کیسی اذیت تھی جو رگوں کو کاٹتی تھی۔

"میری ماہی نے تو کبھی کسی کا دل بھی نہیں دکھایا تھا کبھی کسی سے بلند آواز میں بات نہیں کی پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟"

انہوں نے روتے روتے اس سے پوچھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا کہتا ایسا کیوں ہوا۔ وہ تو جب سے آیا تھا خود سے بھی بار بار پوچھ رہا تھا۔ کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ سارے خواب جیسے مٹی میں مل گئے تھے۔ اس نے بے بسی سے اماں کی طرف دیکھا اور تیز تیز چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر تک وہ ڈیڈ کی قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ بالکل خالی الذہن سا ان کی قبر کی مٹی کو تکتا رہا۔ یہاں تک کہ مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر یا مسجد جانے کے بجائے وہ کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا بس چلتا جا رہا تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ بڑی اماں اور بابا پریشان ہو رہے ہوں گے اور ایسا ہی تھا۔ بابا اسے پریشان سے گلی کا موڑ مڑتے ہی نظر آئے تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے بیٹا! ہم پریشان ہو گئے

تھے۔" قریب آتے ہی انہوں نے بے چینی سے پوچھا تو وہ نادم ہو گیا۔

"سوری بابا! یونہی بے دھیانی میں دور نکل گیا تھا۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ یوں پکڑ لیا جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو۔

"عثمان! بیٹا بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں ان کا دکھ ان کا کرب اپنی جگہ پر لیکن ہمیں اللہ کے فیصلوں پر سر جھکانا پڑتا ہے۔"

وہ گھر کی طرف جاتے ہوئے ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

"ہم انسان اپنی تقدیر سے بے خبر بڑے بڑے فیصلے کرتے ہیں۔ پلان بناتے ہیں لیکن ہوتا تو وہی ہے جو روز ازل کتاب میں لکھ دیا گیا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں بابا! میں نے تقدیر کے لکھے کو قبول کر لیا ہے۔ کتاب میں ایسا ہی لکھا تھا بابا! ایسا ہی ہونا تھا۔"

اس نے ان کا بازو تھپتھپا کر انہیں تسلی دی۔ انہوں نے ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈال کر سر جھکا لیا۔

بڑی اماں بھی پریشان سی برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ ہاشم ملک کے ساتھ اسے آتے دیکھ کر بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

اور ساتھ ہی انہوں نے خورشیداں کو آواز دی۔

"خورشیداں جلدی سے روٹیاں پکا کر کھانا لگا دے۔ عثمان نے دن کو بھی کھانا نہیں کھایا۔"

گو اس کا اب بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن بڑی اماں اور بابا کی خاطر وہ کھانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ کچھ دیر ہاشم ملک اور بڑی اماں کے پاس بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ شاید تینوں ہی اپنی اپنی جگہ اس بے بسی کا شکار تھے کہ کیا بات کریں، جیسے بات کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی موضوع نہ تھا اور کمرے میں آ کر بھی وہ کچھ دیر یوں ہی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اپنے بیگ سے کتاب نکالی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر کتاب کھولی۔

وہ ہمیشہ سفر میں دو تین کتابیں رکھتا تھا تاکہ دوران سفر بوریت نہ ہو۔ یا اگر کہیں قیام کرنا پڑے تو بھی کتابوں کی معیت میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ یہ عادت اس نے اپنے ڈیڈ اور اپنے دوسرے یونی ورسٹی فیلوز سے اپنائی تھی۔ لیکن اس وقت وہ کتاب کی طرف توجہ مبذول نہیں کر پا رہا تھا۔ ذہن بار بار بھٹک جاتا۔ کبھی کتاب کے صفحوں سے ڈیڈ جھانکنے لگتے کبھی ماہی کی خوب صورت آنکھیں صفحات پر چھا جاتی تھیں۔

اب وہ یہاں رہ کر کیا کرے گا جس مقصد کے لیے وہ آیا تھا وہ تو ختم ہو گیا تھا۔ تو پھر کل ہی جا کر واپسی کی تاریخ تبدیل کروا لیتا ہوں۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے اس نے صفحہ پلٹا۔

"عثمان!" کتاب کے صفحوں پر ایک بار پھر ایک منظر اجاگر ہو گیا تھا اسپتال کے بستر پر لیٹے قاسم ملک اس کا ہاتھ تھامے پرامید نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"وعدہ کرو، بیٹا ہاشم بھائی اور بھابھی جان سے ہمیشہ رابطے میں رہو گے۔ اور ان سے کبھی کبھار ملتے جاتے رہو گے۔ تم میں وہ مجھے دیکھیں گے عثمان۔"

پچھلے تین سال اس کے لیے بہت جدوجہد کے تھے لیکن وہ ان سے رابطے میں تھا۔ ڈیڈ کے ساتھ کیے وعدے کو ماہی کی محبت کی زنجیریں مضبوط کرتی تھیں اور اب وہ آ کر یوں فوراً چلا جائے گا تو بابا اور بڑی اماں کو کتنا دکھ ہو گا پھر جانے کبھی وہ آ سکے گا یا نہیں یہ شفیق ہستیاں دوبارہ دیکھ بھی سکے گا یا نہیں اسے اتنی جلدی واپس نہیں جانا چاہیے۔

ماہی کے جانے سے وہ کتنے تنہا اور اکیلے ہو گئے ہیں۔ کاش ڈیڈ زندہ ہوتے تو ماہی کی جدائی کا دکھ برداشت کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔

اور اس نے سوچا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کر سکتا لیکن کچھ دن یہاں رہ کر انہیں تھوڑی سی خوشی تو دے سکتا ہے۔

☆☆☆

اس نے اپنی دو تین ہفتے کی چھٹیاں یہاں ہی گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہاں بھی جا کر کیا کرتا۔ ماما تو اپنی چھٹیاں گزارنے کے لیے فرانس گئی ہوئی تھیں، اور اگر وہاں ہوتیں تو بھی ان کی اپنی سرگرمیاں اور اپنی مصروفیات تھیں۔ اس کے لیے تو ان کے پاس کبھی وقت نہیں ہوتا تھا جب ڈیڈی تھے تب بھی نہیں اور ان کے بعد بھی نہیں۔

یہاں بڑی اماں اور بابا کے ساتھ اس کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا اور ان کی رفاقت میں ماہی کا دکھ سہنا آسان ہو گیا تھا۔ یہ ایک مشترکہ دکھ تھا وہ ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے اور دل بہلائے رکھتے تھے۔

بابا صبح اپنے کالج چلے جاتے کہ ابھی ان کی ریٹائرمنٹ میں کچھ وقت تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بڑی اماں اور ماسی خورشیداں سے باتیں کرتا۔

ہاشم ملک آجاتے تو باقی کا سارا وقت وہ ان کے ساتھ گزارتا۔ کبھی وہ اپنی زندگی کے تجربات اپنے ماضی کی باتیں اور اپنے شاگردوں کے قصے سناتے کبھی وہ ان کے ساتھ ڈیرے پر چلا جاتا اور وہاں جو بھی ان سے ملنے آتا، اس کی باتیں دلچسپی سے سنتا باتیں جو ان کی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا نچوڑ تھیں۔

یہ زندگی اس زندگی سے بالکل مختلف تھی جو وہ وہاں گزار رہا تھا۔ اس میں کھو کر وہ وقتی طور پر بھول جاتا کہ وہ تین سالوں سے جن جھیل جیسی آنکھوں والی کی رفاقت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا نصیب نہیں تھیں۔ رات کو جب بستر پر لیٹا تو ماہی کا دکھ اسے رلاتا۔ بے شک وہ اس کا نصیب نہیں تھی لیکن جس کا نصیب تھی اس کے ساتھ خوش ہوتی۔ زندگی اس کے لیے اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی جتنی اب تھی۔

وہ بے چین ہو جاتا تو بابا کے کمرے سے لائی ہوئی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا، پہلی بار اس نے بڑی اماں کی تحریریں بھی پڑھی تھیں اور حیران ہوا تھا۔ ایک انوکھی، ایسی دل میں اتر جانے والی تحریر تھی ان کی پچھلے تین سالوں میں اس نے اردو لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھا تھا ایک بار ماہی نے کہا تھا کہ بے شک وہ لندن میں پلا بڑھا ہے لیکن اس کی اپنی قومی زبان تو اردو ہے اور اسے اردو لکھنا پڑھنا ضرور آنا چاہیے۔

اس نے ان دنوں ان کی تقریباً سب ہی تحریریں پڑھ ڈالی تھیں اور حیران ہوا تھا کہ انہوں نے اب لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب نہ ہر روز ڈاک میں ان کے لیے ڈھیروں خط آتے تھے نہ ہی ان کے فون۔

"اس لکھنے نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے عثمان!" اس کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا۔

"اگر میں لکھاری نہ ہوتی تو اتنی ہرٹ نہ ہوتی۔ سو میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اب کم از کم اس حوالے سے تکلیف نہیں ہوتی مجھے۔ اور بھی بہت غم ہیں جو یہ روگ بھی لگا لیا جائے کہ فلاں نے میری کہانی کا آئیڈیا لے لیا۔ فلاں نے ذرا سے ردوبدل سے میری ہی کہانی لکھ دی۔ نوآموز اگر ایسا کریں تو دکھ نہیں ہوتا لیکن ہم عصر رائٹر، جو خود بھی بہترین لکھاری ہوں وہ آپ کی کسی کہانی کی ناولٹ کے کردار اور پلاٹ لے کر پورا ناول لکھ دیں۔ یا ڈراما بنا دیں تو دکھ تو ہوتا ہے نا تو بس میں نے اس دکھ سے خود کو بچا لیا ہے۔" وہ ہنسی تھیں۔

"لیکن آپ کو لکھنا چاہیے بڑی اماں! اللہ نے آپ کو یہ صلاحیت عطا کی ہے تو اسے ضائع نہ کریں۔"

اس نے کتنی ہی بار اصرار کیا تھا لیکن ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو جاتی۔ کبھی کبھی ایسے زاویے سے چوٹ لگتی ہے جو عمر بھر مندمل نہیں ہوتی۔ شاید بڑی اماں کے دل پر بھی کوئی ایسی ہی چوٹ لگی تھی جو مندمل ہونے والی نہیں تھی۔

شاید اس کے دل پر لگا زخم بھی کبھی مندمل نہیں ہوگا۔ ماہی کے بعد شاید ہی کبھی کسی کے لیے اس کے ایسا جذبہ پیدا نہ ہو۔ وہ کبھی کسی کو دل میں وہ جگہ نہ دے پائے جو ماہی نے خود بخود ہی اس کے دل میں بنالی تھی۔

بڑی اماں اور ماسی خورشیداں سے باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی وہ ادھر ادھر یوں دیکھنے لگتا جیسے ابھی وہ کہیں کسی کمرے سے نکل آئے گی، بڑی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے کانوں میں کچھ کہے گی اور ماسی خورشیداں کے ساتھ مل کر کچن سمیٹنے لگے گی۔ لیکن اس کی کھوجتی نظریں مایوس لوٹ آتیں دل اسے دیکھنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتا کاش ایک بار جانے سے پہلے ایک بار اسے دیکھ لے۔

بے چین ہو کر وہ ایک دو بار صالحہ آپا کی طرف گیا کہ شاید گھر میں سے نکلتے، گلی میں سے گزرتے، وہ اسے نظر آجائے پتا نہیں ان تینوں سالوں میں کیسی ہو گئی ہوگی زیادہ خوب صورت، زیادہ حسین۔

لیکن صالحہ آپا نے بتایا تھا کہ وہ تو کبھی گھر سے نکلتی ہی نہیں شاید اس کے شوہر نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ ہاں اس کی ساس کبھی خوشی محلے کے گھروں میں آتی جاتی رہتی ہے۔ اس کے ہاں بھی ایک دو بار آئی تھی۔ بچے پاس ہوئے تو مبارک باد دینے اور ایک بار یوں ہی خیریت دریافت کرنے۔

☆☆☆

جانے کس امید پر اس روز وہ اپنی سیٹ کنفرم کروا کے نکلا تو اس کے قدم صالحہ کے گھر کی طرف اٹھ گئے دل نے شدت سے خواہش کی کہ آج وہ اسے دیکھ لے۔ یہ شاید اس کی خواہش کی شدت تھی کہ ابھی وہ آ کر بیٹھا ہی تھا اور صالحہ کو اپنے جانے کا بتا رہا تھا کہ وہ لاؤنج کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ صالحہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ملازمہ نے دروازہ کھولا اور کب وہ اندر آگئی۔

"ماہی! میری جان، کیسی ہو؟" صالحہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

"یہ۔" اس نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا جو اس نے اٹھائی ہوئی تھی۔ "اماں نے بھیجی ہے۔ ان کا نواسا پیدا ہوا ہے۔"

"اچھا میری طرف سے مبارک باد دینا۔ میں شام کو آؤں گی۔"

صالحہ نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومی۔

"میری جان آؤ بیٹھو۔"

"اماں نے کہا تھا جلدی آنا۔"

وہ مڑنا چاہتی تھی لیکن صالحہ اس کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی وہ ساکت بیٹھا تھا۔ خواہشیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں اس طرح بھی۔

"کیا وہ ماہی تھی۔ نہیں یہ ماہی تو نہیں تھی۔"

اس نے بڑی اماں کی طرح سوچا تھا۔

ماہی جس کی آنکھیں سیاہ جھیلیں تھیں اور جن میں ہر وقت قندیلیں سی جلتی رہتی تھیں۔ یہ تو کوئی اور تھی۔ جس کی آنکھیں شکستہ آئینے تھیں اور جو بے بسی سے صالحہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جیسے کرچیاں بکھری تھیں۔

نہیں بھلا یہ ماہی کیسے ہو سکتی ہے اتنی تھکی ہوئی اتنی نڈھال اور کمزور...... لیکن وہ ماہی ہی تھی۔ ماہ درخشاں۔

"ماہی! یہ عثمان۔"

صالحہ نے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ نہیں یہ آنکھیں ماہی کی تو نہیں تھیں۔ اس کی آنکھیں تو سیاہ جھیلیں تھیں جن کی تہہ میں ہیرے، موتی اور جواہرات تھے۔

ان میں تو دھول اڑتی تھی۔

ویران صحراؤں جیسی۔

وہ آنکھیں جن میں اسے دیکھ کر قمقمے سے جل اٹھتے تھے اس وقت، بجھی ہوئی اور تاریک تھیں۔

اس نے آہستہ سے صالحہ سے ہاتھ چھڑایا اور واپس مڑ گئی۔

وہ اسے بلانا چاہتا تھا روکنا چاہتا تھا لیکن اس

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کے ہونٹ صرف لرز کر رہ گئے۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ چلی گئی اور اسے لگا جیسے اس کی وہ زخمی نظر اور اس کی آنکھوں میں بکھری کرچیاں اس کے وجود میں اتر گئی ہیں۔ ساکت بیٹھا لاؤنج کے دروازے کو دیکھتا رہا اور آنکھوں کے سامنے رابرٹ بروگ کی نظم کا دوسرا بند آ رہا تھا۔

تیری آنکھیں شکستہ آئینے ہیں
اوران ٹوٹے آئینوں کی کرچیاں
میرے دل میں اتر گئی ہیں
اور میرا پور اوجود لہو لہو ہو رہا ہے
اف میری طرف نہ دیکھو
شکستہ آئینے میرے وجود کو
کرچی کرچی کرتے ہیں
تیری آنکھیں تو سیاہ جھیلیں تھیں
پر اب ...... آہ ...... افسوس اب
تیسرا باب

''تیری آنکھیں سایے ہیں
تیری آنکھیں خاموش سایہ ہیں
جو دل کی پہاڑیوں میں چھپکے پھر رہا ہے
آہ میں جانتا ہوں تراند عا کیا ہے
تو خون کرنا چاہتا ہے
دل کی گھاٹی میں چھپی ہوئی ناکام سسکتی ہوئی
آرزوؤں کا خون
لیکن میں ایک بار پھر ان آنکھوں میں
جگنوؤں کے قافلے اترتے دیکھتا ہوں
آنکھیں جو سیاہ جھیلیں تھیں

وہ منڈیر پہ کہنیاں ٹکے سامنے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے شفق کی سرخی کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر میں شفق کی سرخی میں سے سورج آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہو جاتا۔ یہ منظر اسے بہت اچھا لگتا تھا جب پہلی بار وہ چودہ سال کی عمر میں ڈیڈ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے ڈیڈ کے ساتھ یہاں کھڑے ہو کر پہلی بار سورج کو درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے آہستہ آہستہ بلند ہوتے دیکھا تھا اور مبہوت سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بیٹا؟''
ہاشم ملک نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مڑا وہ اتنا محو تھا کہ اسے ان کے اوپر آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

''سورج کو طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ منظر بہت خوب صورت لگتا ہے۔ لیکن آپ اوپر کیوں آئے۔ ڈاکٹر نے آپ کو سیڑھیاں چڑھنے سے منع کیا ہے۔''

''یوں ہی دل گھبرا رہا تھا۔ میں سمجھا تم نماز پڑھ کر سو گئے ہو گے لیکن خورشیداں نے بتایا کہ تم چھت پہ ہو تو میں بھی چلا آیا کہ چلو کچھ دیر اوپر کھلی فضا میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔''

وہ بھی اس کے قریب آکر کھڑے ہو گئے تب ہی گرد کا ایک طوفان سا اٹھا آگے پیچھے دو ٹرک ایک اینٹوں سے بھرا اور ایک سریے اور بجری سے لدا ان کے گھر کے سامنے کچے راستے سے شور مچاتے گزر گئے۔

''کیا آگے دوسرے گاؤں میں کہیں کنسٹرکشن ہو رہی ہے۔'' اس نے ہاشم ملک کی طرف دیکھا۔
''ہاں!'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
''چار سالوں میں یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے بابا۔ چار سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا تب کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی راستے کے اطراف میں دھریک اور ٹاہلی کے درختوں کی قطاریں تھیں اور درختوں سے پہلے وہ پرانا کنواں اور پیپل کا وہ بوڑھا درخت بھی تھا جہاں ڈیڈ اپنے بچپن میں کھیلتے تھے اور کنویں سے پانی بھرتی عورتیں دیکھ کر میں حیران ہوا تھا۔

جب پہلی بار ڈیڈ کے ساتھ آیا تھا تب ڈیڈ نے کہا تھا۔ میرا گاؤں ویسے کا ویسا ہی ہے جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ سرسبز و شاداب، وہی دھریک کے کاسنی پھولوں کی مست کر دینے والی خوشبو، وہی ٹاہلی (شیشم) کے درخت، پیپل کا گھنا، بوڑھا درخت پھر

جب چار سال پہلے میں آیا تھا تو کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ٹاہلی کے درخت خال خال رہ گئے تھے لیکن سفیدے کے درختوں کا اضافہ ہوا تھا۔ کنواں سوکھ گیا تھا اور کنویں کے پاس پانی بھرتی لڑکیاں نہیں تھیں لیکن باقی سب کچھ تو ویسا ہی تھا لیکن اب تو نہ وہ درختوں کی قطاریں ہیں نہ کھیت جو گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتے تھے۔ جگہ جگہ اینٹوں اور بجری کے ڈھیر مکمل نامکمل عمارتیں، مزدوروں کا ہجوم۔''

''ہاں!'' ہاشم ملک نے ٹھنڈی سانس لی۔
''گاؤں کے آغاز میں چوہدری اکبر اور ملک اسلم کی زمینیں تھیں انہوں نے فروخت کر دیں۔ یہ درخت بھی ان کی ہی زمین پہ تھے۔ ادھر ایک نئی کالونی بن رہی ہے اور ادھر شہر کے نزدیک جو پلازہ بنا ہے۔ وہ عبدالرحمن کے والد کی زمین تھی۔ بہت زرخیز زمین تھی۔ بہت اچھی فصل دیتی تھی لیکن فضل الرحمن بھائی نے فروخت کر دی کھیتوں کھلیانوں کی جگہ پلازوں اور عمارتوں نے لے لی ہے۔''

''لیکن کیوں بابا؟'' اس نے تاسف سے انہیں دیکھا۔ ''وہاں یورپ میں تو کسی کو زرعی زمین فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ گھر کے کسی ایک فرد کو ضرور زراعت سے وابستہ ہونا پڑتا ہے۔ گر ایسا نہ ہو تو پھر حکومت لے لیتی ہے۔''

''لیکن یہاں تو ایسا کوئی قانون نہیں ہے بیٹا۔ لوگ دھڑا دھڑ زرعی زمینیں فروخت کر رہے ہیں۔ آج سے کہیں کئی سالوں سے نئی کالونیاں، نئے ٹاؤن آباد ہو رہے ہیں۔ صرف لاہور شہر کے گرد ہی نہ جانے کتنی زرعی زمینیں ختم کر کے ان کی جگہ پلازوں اور کالونیوں نے لے لی ہے۔ یہ بحریہ ٹاؤن، یہ ڈی ایچ اے، وغیرہ سب زرعی زمینوں کے بیچنے پر ہی تو بنے ہیں۔''

وہ بھی جیسے افسردہ ہو گئے تھے۔
''لیکن اس طرح تو غذائی قلت ہو جائے گی بابا!'' وہ حیران ہی نہیں پریشان بھی ہوا تھا۔

''ماہی بھی یہ ہی کہتی ہے کہ اگر ایسے ہی زرعی زمینوں پہ پلازے اور کالونیاں بنتی رہیں تو ایک دن نوبت کیپسول کھانے پر آ جائے گی۔ جیسے خلا میں جانے والے خوراک کے طور پر کھاتے ہیں۔''
ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ نمودار ہوئی اور ماہی کا نام سن کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ تاہم اندر کے دکھ کو نظر انداز کر کے اس نے ہاشم ملک کی طرف دیکھا۔
ان کے لبوں پہ مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''اس پہ پھر بات کریں گے۔ نیچے چلتے ہیں۔ ناشتا بن گیا ہوگا۔''
''جی!'' اس نے ایک نظر درختوں کے جھنڈ پہ ڈالی جن کے پیچھے سے سورج جھانک رہا تھا اور ان کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔
برآمدے میں رک کر اس نے غیر ارادی طور پہ کچن کی طرف دیکھا دروازہ نیم وا تھا۔ اندر سے خورشیداں کی آواز آ رہی تھی وہ یقیناً ماہی سے ہی بات کر رہی تھی تب ہی بڑی اماں۔ ہاشم ملک کے کمرے سے باہر آئیں۔
''ادھر ہی آ جائیں میں نے ناشتا ادھر ہی لگوا دیا ہے۔''
اور وہ ہاشم ملک کے ساتھ چلتا ہوا ان کے کمرے میں آ گیا ٹیبل پر ناشتے کے برتن لگے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی خورشیداں گرم گرم پراٹھے آملیٹ اور بھنا ہوا قیمہ لے آئی۔
''چائے کچھ دیر بعد لے آنا۔'' بڑی اماں بھی اس کے ساتھ ہی آئی تھیں۔
ناشتے کے بعد بڑی اماں تو خورشیداں کے ساتھ ہی برتن اٹھوا کر چلی گئیں۔ اس نے ہاشم ملک کو ان کی دوا نکال دی۔
''جب سوچتا ہوں کچھ دنوں تک تم چلے جاؤ گے تو دل گھبرانے لگتا ہے۔'' دوا لے کر انہوں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔
''ابھی تو میں ادھر ہی ہوں نا بابا! آپ کو ابھی

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سے میرے جانے کی فکر پڑ گئی ہے۔ ابھی تو میں آیا ہوں۔"

اس نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر میبل پر رکھا۔ ان کا تکیہ درست کیا۔

"بس اب آپ لیٹ جائیں پتا ہے نا ڈاکٹر نے آپ کو کچھ دن کے لیے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔"

"نہیں مجھے بھلا تمہارے جانے کی کیوں فکر ہوگی بس میرا دل چاہتا ہے میری چارپائی کو کندھے دینے والوں میں کوئی تو ہو میرا اپنا میرا خون، میں غیروں کے کندھوں پر سوار ہو کر قبرستان نہ جاؤں۔"

ان کی آنکھوں کی سطح گیلی ہوگئی تھی۔

"بابا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کو کچھ نہیں ہونے والا اور بے فکر رہیں میں یہاں ہی ہوں جب تک آپ بالکل صحت مند نہیں ہو جاتے اور اپنی اکیڈمی میں جانا شروع نہیں کر دیتے۔"

اس نے ان کا بازو تھپتھپایا تو انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"عثمان بیٹا! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ کاش میں نے تمہیں ماہی سے شادی کے لیے نہ کہا ہوتا۔"

"بابا!" اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔ "اگر آپ نے پھر ایسی بات کی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ اور یہ ڈیڈی کی خواہش تھی آپ کیوں بھول جاتے ہیں انہوں نے آپ سے کہا تھا۔"

"ہاں لیکن تم شادی کر لیتے تو یہ ندامت کم ہو جاتی۔ شادی کر لو عثمان۔ تم سے ہی تو ہمارے باپ دادا کی نسل چلنی ہے۔ تمہاری ماں کی بھی تو خواہش ہوگی کہ اس کے اکلوتے بیٹے کا گھر آباد ہو۔" ان کی نظروں میں التجا تھی۔

"بڑی اماں نے اس سے بات کی۔"

اس کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں۔

"وہ نہیں مانتی بیٹا! کہتی ہے وہ تمہارے قابل نہیں ہے تمہیں ڈیزرو نہیں کرتی۔" وہ افسردہ ہوئے۔

"یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ وہ مجھے ڈیزرو کرتی ہے یا نہیں اور میں جانتا ہوں کہ جس لڑکی کو میرے ڈیڈ اور میرے بابا نے میرے لیے منتخب کیا ہے اس سے بہتر کوئی اور لڑکی نہیں ہو سکتی۔" وہ جھنجلایا۔

"وہ اپنے متعلق کب سے خود فیصلے کرنے لگی ہے۔ آپ اور بڑی اماں کو حق ہے کہ آپ اس کے متعلق فیصلہ کریں کیا وہ نہیں جانتی کہ آپ اس کے لیے بہتر فیصلہ کریں گے چاہے وہ میرے حق میں ہو یا کسی اور کے۔"

بڑی اماں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے لیے دو تین اور رشتے بھی آئے ہیں۔

"ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے عثمان۔" انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ٹوٹی ہوئی ہے اس نے بہت مشکل وقت دیکھا ہے اور بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ شاید اسے سنبھلنے میں بہت وقت لگے گا عثمان اور تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ تمہاری ماں کا بھی تو حق ہے کہ وہ تمہاری خوشیاں دیکھے۔ تمہارے بچوں کو گود میں کھلائے۔"

"مام" اس کے اندر تلخی سی گھل گئی۔

"میری زندگی میں ہی کوئی فیصلہ کر لو عثمان۔ یہ ندامت کہ میں نے تمہیں ماہی کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ میری آخری سانسوں کو بھی مشکل بنا دے گی۔ ماہی کے ساتھ تمہاری وابستگی کی مدت اتنی زیادہ تو نہیں تھی بیٹا کہ تم چار سالوں میں بھی خود کو سنبھال نہیں سکے۔"

ان کی آواز غنودہ سی ہو رہی تھی کہ ان کی دواؤں میں تھوڑی بہت نیند کی دوا بھی تھی کہ عموماً وہ کھانے کے بعد سو جاتے تھے۔

"اگر پاکستان میں شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہاری بہنیں تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھیں۔ تم......"

اور ان کی آنکھیں ہولے ہولے بند ہو گئیں۔

بعض اوقات طویل رفاقت بھی اثر انداز نہیں ہوتی اور بعض اوقات چند لمحوں کا ساتھ عمر بھر کے لیے اسیر کر لیتا ہے۔ ڈیڈی کی طویل رفاقت کو بھول کر مام

نے چند ماہ بھی نہیں لگائے تھے بلکہ چند دن اور وہ چار سالوں میں ماہی کو بھلا ہی نہیں سکا تھا۔ اس کا دل کسی اور کے ساتھ راضی ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے ہاشم ملک کی طرف دیکھا وہ سو گئے تھے۔ اس نے ہاتھ ان کے بازو سے ہٹا لیا۔ چار سال پہلے وہ بہت دل شکستہ اور دل گرفتہ سا واپس لندن لوٹ گیا تھا حالانکہ ابھی اس کی چھٹیاں ختم نہیں ہوئی تھیں اور اس کے واپس آنے کے چند دن بعد سلمٰی واپس آئی تھیں۔

"ارے تم آگئے پاکستان سے۔" اپنے پاس موجود چابی سے لاک کھول کر وہ اندر آئی تھیں اور اسے لاؤنج میں دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔

"آپ آ گئیں۔" وہ جو ٹی وی کا ریموٹ لینے کے لیے اٹھا تھا چونک کر مڑا۔

"وہ کہاں ہے۔ تمہاری دلہن، تمہارے تایا کی نام نہاد بیٹی...... جس سے شادی رچانے گئے تھے۔"

اس کا جواب سنے بغیر وہ اس کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئیں وہ ریموٹ اٹھا کر واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"بھئی تمہارے روم میں تو کسی دلہن کے آثار نہیں ہیں۔" وہ فوراً ہی واپس آ گئی تھیں۔

"کہیں میرا بیڈ روم تو اس کے حوالے نہیں کر دیا۔ ٹھیک ہے میرا بیڈ روم تمہارے روم کے مقابلے میں کشادہ ہے لیکن میں نہیں دینے والی اپنا بیڈ روم کسی ایسی لڑکی کو جو میری مرضی کے بغیر اس گھر میں آئی ہو۔"

وہ تیزی سے اپنے روم کی طرف بڑھ گئیں اور اس نے ٹی وی آن کیا۔

"اوہ...... ہاں تو عثمان! کیا تم پاکستان نہیں گئے۔" بہت تیز تیز چلتی ہوئی اپنے روم سے باہر آئی تھیں۔

"مجھے پتا تھا میرا بیٹا مجھے ناراض کر کے میری مرضی کے بغیر بھی شادی نہیں کرے گا۔"

وہ خوش خوش سی اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں اور اس نے تردید کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ پھر فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ تو اب کسی اور کا نصیب تھی۔

"میں اب خود تمہاری شادی کرواؤں گی۔ دیکھنا کتنی خوب صورت اور ایجوکیٹڈ لڑکی ڈھونڈوں گی تمہارے لیے۔ اور ہاں جب تم پاکستان نہیں گئے تھے تو بتا دیتے مجھے اور فرانس ہی آ جاتے۔ یہاں بور ہوتے رہے ہوں گے۔"

"آپ نے فون ریسیو ہی نہیں کیا۔ ایک دو بار کیا تو تھا۔" اس نے چینل سرچ کرتے ہوئے پاس بیٹھی سلمٰی بیگم کی طرف ذرا کی ذرا دیکھا تھا۔

"اوہ ہاں!" وہ ذرا سی نادم ہوئیں۔

"میں ناراض تھی نا تم سے۔"

"آپ بتائیں آپ کا وقت کیسا گزرا۔ انجوائے کیا؟"

"میں نے بہت انجوائے کیا۔ وہاں ہمارے ہی ہوٹل میں جلیل سیٹھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں لندن میں ہی رہتے ہیں۔ وہ بھی چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ بہت دلچسپ آدمی ہیں ابھی انہیں کوئی کام تھا وہاں دو دن بعد آئیں گے تو تم سے بھی ملواؤں گی۔ تمہارے ڈیڈی کی طرح بور نہیں ہیں اور"

جوش و خروش سے بولتی ہوئی وہ یک دم چپ ہو گئی تھیں۔

یہاں بھلا ڈیڈی کا کیا ذکر۔ وہ حیران ہوا تھا لیکن سلمٰی بیگم سے کچھ کہے بغیر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"بہت سخت بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو ہے تو لاؤ۔"

لحہ بھر اسے دیکھنے کے بعد سلمٰی بیگم نے کہا تو وہ نادم ہوا۔

"گھر میں تو کچھ خاص نہیں، میں آرڈر کر دیتا ہوں آپ اتنے میں فریش ہو جائیں۔ ہاں کافی کا موڈ ہو تو ابھی بنا لاتا ہوں۔"

"کافی کھانے کے بعد۔"

وہ کھڑی ہو گئی تھیں اور وہ فون اٹھا کر آرڈر کرنے لگا اور پھر کھانا کھاتے ہوئے بھی مسلسل وہ یا تو جلیل سیٹھی کا ذکر کرتی رہی تھیں یا پھر اسے مختلف لڑکیوں کے متعلق

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بتاتی رہیں جو ان کی فرینڈز کی عزیز رشتہ دار تھیں۔
یہ صرف اس دن کی بات نہیں تھی اس کے بعد بھی وہ شادی کے لیے اصرار کرتی رہی تھیں لیکن مام کے بے حد اصرار کے باوجود وہ خود کو شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں کر سکا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ مام اس کے ساتھ ڈیڈی کی باتیں کریں۔ ڈیڈ کے ساتھ بیتے دنوں کی یادیں اس کے ساتھ شیئر کریں۔ لیکن جب بھی وہ گھر پر ہوتیں تو ان کے پاس گفتگو کے لیے صرف دو ہی موضوع ہوتے تھے اس کی شادی اور جلیل سیٹھی۔
اور یہ شخص جلیل سیٹھی اسے ذرا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر اسے انتہائی ناگوار لگا تھا۔ شاید ان آنکھوں میں ہوس تھی۔ لالچ تھا یا پتا نہیں کیا۔ وہ ایک بار کے بعد پھر اس سے نہیں ملا تھا لیکن ماما اکثر ویک اینڈ پر اس کے ساتھ گھومنے چلی جاتی تھیں، کبھی وہ ڈنر یا لنچ اکٹھا کرتے۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ مام کے دوستوں کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ان کی اپنی چوائس تھی جسے چاہیں دوست بنا لیں۔
"تم اگر شادی کر لیتے تو میں بھی ریلیکس ہو جاتی کہ تم اکیلے نہیں ہو۔"
ایک روز ناشتے کی ٹیبل پر ماما نے کہا تو وہ حیران ہوا۔
"تم ایسا کرو پاکستان چلے جاؤ اور اپنے تایا کی اس حسنہ بولی بیٹی سے ہی شادی کر لو جس سے کرنا چاہتے تھے۔"
وہ مزید حیران ہوا تھا۔ مام نے اس سے پہلے تو کبھی اس کے اکیلے پن کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی وہ اپنی کسی دوست کے ساتھ اسکاٹ لینڈ گئی ہوئی تھیں۔ جاب اب بھی وہ ہفتے میں تین دن ہی کرتی تھیں۔
"آپ فکر نہ کریں مام! مجھے تنہائی یا اکیلا پن محسوس نہیں ہوتا۔ عادی ہوں اس کا۔"
"لیکن شادی تو ضروری ہے اور نکاح سنت ہے۔" ماما کی بات نے ایک بار پھر اسے حیران کیا تھا۔
"تمہیں ضرور شادی کر لینی چاہیے عثمان! تم ینگ ہو۔ ساری عمر یوں بغیر ساتھی کے تنہا نہیں گزر سکتی۔ اب مجھے دیکھو تمہارے ڈیڈ کے بعد کتنی تنہائی اور اکیلا پن محسوس کرتی ہوں حالانکہ میرے پاس تم بھی ہو۔ پھر بھی میری فرینڈز اور آپا سبھی مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے کسی اچھے بندے سے۔"
مام نے ڈیڈ کے بعد پہلی بار انہیں یاد کیا تھا لیکن ان کی اگلی بات سے اسے شاک سا لگا تھا۔ تو کیا وہ شادی کرنا چاہتی ہیں تو یہ ساری تمہید اس لیے تھی۔
"ہمارے مذہب میں بھی بیوہ کی جلد شادی کر دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ تمہیں علم ہے نا؟"
وہ اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔
وہ جانتا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہیں۔ پاکستان سے آنے کے بعد اس نے ایک اسلامک سینٹر جوائن کر لیا تھا۔ وہ اپنے مذہب کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا اس لیے مذہب کے حوالے سے کتابیں اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔
اس نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا، وہ اعتراض نہیں کر سکتا تھا کہ بہر حال وہ صحیح کہہ رہی تھیں لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ مذہب کے کسی بھی حکم پر عمل نہ کرنے والے اپنے مطلب کے وقت کیسے مذہب کا حوالہ ڈھونڈ لاتے ہیں۔
"جلیل سیٹھی نے بھی مجھ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی ہے۔ میرا خیال ہے وہ اچھا آدمی ہے مجھے اس پر غور کرنا چاہیے۔" اب وہ یقیناً اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتی تھیں۔ "تم... تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
"جی نہیں۔ آپ اگر ایسا چاہتی ہیں تو جو مناسب سمجھیں۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔
☆☆☆
اور پھر ماما نے جلیل سیٹھی سے شادی کر لی اور جلیل کے فلیٹ میں چلی گئیں۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ نکاح تو ان کے فرانس سے آنے کے فوراً بعد ہو گیا تھا۔ لیکن جلیل نکاح کے بعد کچھ عرصہ کے لیے انڈیا چلا گیا تھا۔ اس لیے ماما اپنے گھر میں ہی رہ رہی تھیں۔
ماما کے جانے کے بعد اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا تھا۔ لیکن پھر بھی جب بستر پر لیٹتا ماہی چھم سے اس کے تصور میں چلی آتی۔ وہ اسے چار سالوں میں بھلا نہیں سکا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ اسے کبھی بھلا نہیں سکے گا۔ اس لیے تو جب بھی مام اس سے ملنے آتیں یا فون کرتیں اور شادی کے لیے کہتیں تو وہ ٹال دیتا۔ وہ بہت کم فون کرتی تھیں اور بہت کم ملنے آتی تھیں۔
شروع شروع میں وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھیں اور زیادہ وقت جلیل سیٹھی کی باتیں کرتی رہتی تھیں لیکن پھر ہولے ہولے ان کی باتوں میں جلیل کا ذکر کم ہونے لگا۔ وہ اب پندرہ بیس دن بعد کبھی سنڈے کو ملنے آ جاتی تھیں۔ لیکن وہ اسے تھکی تھکی اور نڈھال سی لگی تھیں۔
"کیا آپ کچھ بیمار ہیں؟"
ایک روز اس نے پوچھا تو وہ خاموش رہی تھیں۔
"کیا ڈاکٹر کے پاس آپ گئیں۔"
اس نے پوچھا تھا۔ بے شک وہ اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں لیکن بہر حال وہ اس کی ماں تھیں۔
"میں ٹھیک ہوں بیمار نہیں ہوں۔ بس یوں ہی اگر اجازت دو تو آج یہاں رک جاؤں؟"
ماما نے لجاجت سے پوچھا تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھیں وہ تو بہت تنک مزاج اور مغرور سی تھیں۔ اس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔
"آپ کا اپنا گھر ہے مام! جب تک دل چاہے رہیں۔"
"تم بہت اچھے ہو عثمان، بالکل اپنے ڈیڈ کی طرح نرم دل۔"
اور اس روز اسے لگا تھا کہ مام کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔ جلیل سیٹھی نے یقیناً کچھ برا کیا ہے۔ شاید وہ مام کو مارتا پیٹتا بھی ہے کیونکہ ایک دو بار اس نے ان کے چہرے اور بازو پر نیل دیکھے تھے اور پھر بہت جلد اسے پتا چل گیا کہ اس کا خیال ٹھیک تھا۔
خالہ نے اسے بتایا تھا کہ نہ صرف وہ انہیں مارتا ہے بلکہ ان کے اکاؤنٹ میں موجود ساری رقم وہ بہانے بہانے سے ان سے لے چکا ہے۔ وہ اکثر انہیں گھر میں بند کر کے چلا جاتا ہے اور ایک دو دن بعد واپس آتا ہے جبکہ گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا۔
"آپ اگر چاہیں تو جلیل سے ڈائیورس لے لیں اور واپس آ جائیں۔"
اس نے مام سے کہا تھا لیکن وہ پتا نہیں کیوں ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ جب بھی آتیں، وہ کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیتا۔ جاتے ہوئے زبردستی ان کے ہینڈ بیگ میں رقم رکھ دیتا۔ اور وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی چلی جاتیں۔
"میں تمہارے لیے بہت دعا کرتی ہوں عثمان کہ وہ جو تمہارے دل کی خواہش تھی، وہ تمہیں مل جائے۔"
ایک روز وہ آئیں تو انہوں نے دل گرفتگی سے کہا۔
"اب تک تو اس کی شادی بھی ہو گئی ہوگی مام آپ کی دعا کا کیا فائدہ۔"
وہ بہت کم اپنے دل کی بات ان سے کرتا تھا لیکن اس روز بے اختیار ہی منہ سے نکل گیا تھا۔
"لیکن میں پھر بھی دعا کرتی رہوں گی۔ تم اپنے تایا جان سے بات کرتے ہو تا کیا انہوں نے تمہیں بتایا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔"
اس کی ان سے بات ہوتی رہتی تھی لیکن وہ ان چار سالوں میں بڑی اماں اور ہاشم ملک سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا تھا کہ ماہی کیسی ہے۔ اس کے گھر کے حالات ٹھیک ہوئے یا نہیں اور انہوں نے بھی اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ دکھی ہو گا۔
"اب اگر فون کرو تو اس کا پوچھنا اور اگر اب تک اس کی شادی نہ ہوئی ہو تو مجھے بتانا میں خود بات کروں گی تمہارے تایا جان سے۔"
اس نے محض سر ہلا دیا تھا۔ وہ ان سے زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس نے ماہی کی شادی کا بتایا تھا۔ وہ اسے تاکید کر کے چلی گئی تھیں اور اسی روز بڑی اماں کا فون آ گیا تھا۔

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

☆☆☆

"عثمان! تمہارے بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں عثمان سے کہو۔ میرے مرنے سے پہلے ایک بار مجھے مل جائے۔"

"عثمان!" وہ رونے لگی تھیں۔ "ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ان شاء اللہ بابا کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں پہلی دستیاب فلائٹ سے آرہا ہوں۔"

اور وہ آ گیا تھا۔ ہاشم ملک ابھی ہاسپٹل میں ہی تھے گو۔ آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ ایئرپورٹ سے سیدھا ہاسپتال ہی آیا تھا اور وہاں کمرے میں بڑی اماں کے ساتھ ماہی کو دیکھ حیران ہوا تھا۔ ہاشم ملک دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ بڑی اماں سے مل کر اس نے ماہی کی طرف دیکھا تھا۔

"کیسی ہو ماہی؟"

"ٹھیک ہوں۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھائی تھیں بے رنگ، ویران آنکھیں جیسے ڈھلتی شام کے سایوں نے ان آنکھوں میں بسیرا کر رکھا ہو۔ پھر وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ کیا وہ اس کے لیے اتنا اجنبی تھا کہ وہ اجنبیوں کی طرح اس کی طرف دیکھے بغیر باہر چلی گئی تھی۔ اس کا دل کرلایا تھا۔

وہ بغیر پوچھے بھی جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ لیکن کیا اس کے شوہر نے اسے یہاں آنے کی اجازت دے دی ہے۔ کیا اس کے حالات بہتر ہو گئے ہیں؟

اس نے خود سے سوال کیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں پھیلے وہ اندھیرے، اس کے چہرے کے گرد اداسی کا ہالہ۔

ہاں وہ اب بھی خوش نہیں تھی۔ اور تین دن بعد جب ڈاکٹر نے ہاشم ملک کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ گھر آئے تو اسے اپنے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔

بڑی اماں نے اسے بتایا تھا کہ ظلم حد سے بڑھ گیا تھا اور اس کے شوہر نے ایک رات اسے بانجھ کہہ کر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ صالحہ کا گھر نزدیک تھا۔ وہ ادھر چلی گئی بس پھر ہم اسے گھر لے آئے اور خلع لے لی کہ طلاق دینے کو تو تیار ہی نہ تھا۔

"اور یہ کب کی بات ہے بڑی اماں!" ماہی کا دکھ اس کے دل میں اتر آیا تھا۔

"سال ہونے والا ہے۔"

"اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" انہوں نے بتایا تو وہ بے اختیار شکوہ کر بیٹھا۔

"ماہی نے منع کر دیا تھا عثمان! ورنہ کتنی بار جی چاہا تم سے کہوں۔ ہمارے بعد ہماری ماہی بے آسرا ہو جائے گی۔ لیکن ماہی نے سختی سے منع کر دیا اور تمہارے بابا نے کہا۔ ماہی نے بہت دکھ سہے ہیں۔ بہت زخم لگے ہیں اسے، انہیں بھرنے میں وقت لگے گا۔ سنبھل جائے تو پھر عثمان سے بات کریں گے کہ اگر اس کے دل میں اب بھی ماہی کے لیے گنجائش ہو تو۔ بس ہم ماہی کے سنبھلنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ایک دو رشتے بھی آئے ہیں لیکن وہ مانتی ہی نہیں۔"

"اور میں...... مجھے کیوں بھول گئیں آپ۔ ڈیڈ نے تو سب سے پہلے آپ سے بات کی تھی نا؟" اس نے گلہ کیا تو بڑی اماں کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"تمہیں بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں عثمان۔ بس یونہی سا خیال تھا کہ شاید تم اب۔ ایسا نہ چاہو۔ اب تم نے کہا ہے تو بات کروں گی اس سے۔"

لیکن ماہی نے انکار کر دیا تھا۔ ان چھ دنوں میں وہ ایک بار بھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔

سوتے میں ہاشم ملک بڑبڑائے تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ پھر گہری نیند میں چلے گئے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے سوچا وہ بڑی اماں سے کہتا ہے کہ وہ ایک بار ماہی سے بات کریں اسے سمجھائیں۔ وہ بنا آہٹ کیے دبے قدموں چلتا ہوا باہر آیا۔

بڑی اماں تخت پر بیٹھی بچی ہوئی روٹی کے چڑیوں کو ڈالنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گیا۔

"تم خود اس سے بات کیوں نہیں کرتے عثمان!" اس کی بات سن کر انہوں نے کہا۔

"میں نے اور تمہارے بابا نے بہت سمجھایا کہ ہم نے سدا نہیں رہنا لیکن اس کی ایک ہی بات کہ وہ اب خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتی، وہ کمرے میں ہوگی چلے جاؤ کیا خبر تمہاری بات مان لے۔ ہو سکتا ہے اس وقت اسے تمہارے یقین کی ضرورت ہو۔"

"جی!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں تھے۔ نہ اس نے کبھی اسے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا نہ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ بابا نے منع کیا تھا اور وہ تو اسے یہ بھی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اس کی رفاقت کا خواب لے کر جا رہا ہے اور ایک روز اسے ہمیشہ کے لیے اپنانے آئے گا لیکن وہ جا چکی تھی۔ پہلے نہ سہی لیکن بڑی اماں نے اسے بتایا تھا جب وہ اپنے بابا کے ساتھ جا رہی تھی۔

وہ دستک دے کر کمرے میں گیا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ بیڈ پر کتابیں اور کاپیاں پڑی تھیں اس نے ایک کتاب اٹھائی۔ یہ بی اے کی کتاب تھی۔ بڑی اماں نے اسے بتایا تو تھا کہ وہ ہاشم ملک کے اصرار پر اب بی اے کی پرائیویٹ تیاری کر رہی تھی۔ کتاب رکھ کر اس نے نوٹ بک اٹھائی پہلے صفحہ پر بڑی خوب صورت لکھائی میں لکھا تھا۔

جن لوگوں کا رستہ تکتے عمریں رزق خاک ہوئیں
اب وہ لوگ اور ان کے سپنے دیکھنے والی آنکھیں راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے زندہ خواب

تب ہی ماہی نے کمرے میں قدم رکھا اور پھر ٹھٹک کر رک گئی۔ آہٹ پر وہ یونہی نوٹ بک ہاتھ میں لیے مڑا۔

"آ جاؤ ماہی!"

وہ گیلے چہرے کے ساتھ گھبرائی سی کھڑی تھی شاید منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی۔

"مجھے آئے کتنے دن ہو گئے ہیں اور تم مجھ سے چھپتی پھر رہی ہو۔ کیا کوئی ناراضی ہے مجھ سے۔"

اس کی پلکیں لرزنے لگی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے مروڑ رہی تھیں۔

"ماہی! تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔ مت کرو ایسا۔" وہ دو قدم بڑھا کر اس کے قریب آیا تھا۔

"یاد ہے تمہیں جب میں ڈیڈ کو لے کر آیا تھا تو ہمارے درمیان دوستی ہو گئی تھی۔ تم مجھ سے کتنی باتیں کرتی تھیں اور میں نے بھی اپنی ہر بات تم سے شیئر کی تھی۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔ تم خود کو اس بات کی سزا کیوں دے رہی ہو جس کے لیے تم قصوروار نہیں ہو۔ مجھ سے پہلے کی طرح باتیں کرو کچھ میری سنو کچھ اپنی سناؤ۔ تمہیں یاد ہے۔ ہم سات سالوں بعد یوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہیں۔ چار سال پہلے جب میں آیا تھا تم یہاں سے جا چکی تھیں۔ بس صالحہ آپا کے گھر ذرا سی جھلک دکھائی دی تھی۔ اب تمہیں دیکھا یہاں تو سوچا تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا لیکن تم۔" اس نے ایک شکوہ بھری نظر اس پر ڈالی۔ وہ یونہی سر جھکائے مضطرب سی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"میں چند دن یہاں ہوں پھر چلا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے پھر بھی نہ آسکوں۔ یا کبھی آؤں تو چار سال پہلے کی طرح تم یہاں نہ ہو۔ یا ڈیڈی کی طرح کوئی میرے بے جان وجود کو تابوت میں بند کر کے لائے اور تب۔"

"نہیں۔" اس نے تڑپ کر نگاہیں اٹھائی تھیں اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے ہوئے پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لبوں سے سسکی سی نکلی تھی۔ شاید وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک پر نظر ڈالی۔

راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے زندہ خواب
خوابوں کی اس راکھ کو لیکن چھیڑے کون
جس رستے پر چھاؤں نہ پائی
اس پر پیڑ لگائے کون
جس مٹی میں ریت ملی ہو اس میں باغ لگائیں کیسے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مدھم لہجے میں پڑھتے ہوئے اس نے نوٹ بک بیڈ پر رکھ دی۔ اور مڑ کر اسے دیکھا اور یونہی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی اور وقفے وقفے سے اس کے لبوں سے سسکی نکل جاتی تھی۔

”محبتوں کے پانی سے بنجر زمینیں بھی زرخیز ہوجاتی ہیں اور ان میں بھی پھول اگائے جاسکتے ہیں۔ اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی تم اگر کسی کو اجازت دو تو کوئی ساری زندگی ان دھوپ بھری زمینوں پر ڈیرے ڈالنے کو اپنی خوش نصیبی سمجھے گا۔“

زیر لب کہتے ہوئے اس نے ماہی کی طرف دیکھا وہ اسی طرح سر جھکائے ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”او کے تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں تو۔“ بات ادھوری چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔

وہ چاہتا تھا پہلے ان کے درمیان جو جھجک، تکلف اور اجنبیت در آئی ہے وہ دور ہوجائے اس کے بعد ہی وہ دل کی بات کرے گا اور اس کے لیے اس نے یہ چھوٹی سی کوشش کی تھی اور ناکام نہیں ہوا تھا۔

دن بھر اس نے چھپنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ اسے ادھر ادھر جاتے اور کام کرتے دیکھتا رہا تھا۔ رات کو اس نے سب کے کھانا ساتھ کھایا تھا۔ اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔ بڑی اماں اور بابا بھی خوش لگ رہے تھے۔ گو وہ خاموش سر جھکائے بیٹھی کھانا کھاتی رہی تھی۔

بڑی اماں کی کسی بات پر اس نے ایک دوبار نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ ہیرے کی سی دمکتی آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ بجھی بجھی راکھ سی آنکھوں میں تلخیے سے اندھیرے تھے لیکن اسے یقین تھا ایک روز یہ آنکھیں پھر سے روشن ہوں گی۔ اس کا یہ یقین غلط بھی نہیں تھا۔ ماہی نے روشن راستوں پر پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ گو وہ خود اس سے بے خبر تھی۔

اگلے دو دن بھی وہ اسے یونہی کام کرتے ادھر ادھر جاتے کھانا ساتھ کھاتے دیکھتا رہا۔ گو ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہورہی تھی اس نے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ جانتا تھا ایک روز اجنبیت کی یہ دیوار ڈھے جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

اس روز بڑی اماں کا بی پی لو ہوگیا تھا اور وہ دوڑتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی تھی۔

”بڑی اماں...... وہ بڑی اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ جلدی آئیں۔“

اور وہ اسے تسلی دیتا ہوا فوراً ہی اس کے ساتھ بڑی اماں کے کمرے میں آیا تھا۔ پھر بڑی اماں کا بی پی چیک کرتے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہوئے اور ان کی دوائیوں اور پرہیز کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے خود بخود ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور گزرتے دنوں کے ساتھ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

شالی کی شادی کے قصے صالحہ آپا اور ناہید آپا کے بچوں کی شرارتیں، اپنی پڑھائی، مستقبل کے پلان وہ سب کچھ اس سے شیئر کرنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ بھی اپنی ذاتی باتیں۔ اپنے آفس کی، ڈیڈ کے ساتھ گزرے دنوں کی باتیں اس سے کرتا۔ بابا اور بڑی اماں بھی یوں اسے کھل مل کر اس سے باتیں کرتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

اس نے کبھی اس کی شادی اور اس کے سسرال کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے ہوئے کبھی اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے کوئی پرچھائیں سی لہراتی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح پھر ہو جاتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی ڈھلتی شاموں کا ملگجا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

وہ چاہتا تھا وہ خود اس المیے پر اس سے بات کرے اور کھل کر رو لے تاکہ آنکھوں اور دل پر چھایا غبار دھل جائے۔

اس رات کھانے کے بعد وہ دیر تک ہاشم ملک کے کمرے میں بیٹھے رہے انہوں نے پتا نہیں کہاں سے ایک پرانی البم ڈھونڈ نکالی تھی جس میں ان کی اور ڈیڈ کے بچپن کی تصویریں۔ دادا جان، دادی، فاروق

اور صالحہ آپا، ناہید آپا کے بچپن کی۔ زیادہ بلیک اینڈ وائٹ اور کچھ رنگین، ہر تصویر کے ساتھ کوئی یاد وابستہ تھی۔ تصویریں دیکھتے بابا کی باتیں سنتے کئی بار آنکھیں نم ہوئیں اور کئی بار لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ سہرا باندھے دولہا بنے گھوڑے پر بیٹھے بابا کو دیکھ کر ماہی بے اختیار ہی ہنس پڑی تھی۔

”یہ آپ ہیں بابا!“

اور کتنے دنوں بعد وہ اس طرح ہنسی تھی۔ وہی جل ترنگ سی بجاتی ہنسی۔ دل و روح کے تار ہلاتی۔ نگاہوں نے بے اختیار اس کے چہرے کا طواف کیا تھا اور یہ اس کی نظروں کی تپش ہی تھی کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اب جاؤں بڑی اماں اینڈ آرہی ہے۔“

اس نے جھک کر بڑی اماں اور بابا سے پیار لیا اور شب بخیر کہہ کر باہر نکل گئی۔

”بیٹا بہت رات ہوگئی ہے تم بھی اب جا کر آرام کرو۔“

میں سوچ رہا ہوں کل ڈاکٹر سے چیک کروا کے اکیڈمی جانا شروع کردوں۔

”میرا خیال ہے ابھی دو تین دن اور ریسٹ کرلیں۔“

وہ بھی شب بخیر کہتا ہوا ماہی کے پیچھے ہی باہر نکلا صحن میں چاروں طرف چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ بے اختیار ہی وہ صحن کی طرف بڑھا تھا۔ ماہی برآمدے کی سیڑھیوں پر گھٹنوں پر تھوڑی رکھے بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اوپر آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ فضا میں ہر طرف پھولوں کی باس تھی۔ مارچ کا وسط تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب ہی سیڑھی پر آکر بیٹھ گیا۔

دونوں کو ہی ایک پرانا منظر یاد آیا اور بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی کسی فسوں کے زیر اثر ساکت بیٹھے تھے۔

”ماہی...... ماہ درخشاں!“ وہ چند لمحوں بعد جیسے اس فسوں سے آزاد ہوا۔ ”ماہی ادھر دیکھو میری طرف! اور جھیل جیسی گہری آنکھوں اور ان کی جھلملاہٹوں نے گمبھیر جذبات سے لبریز آواز۔

”تمہیں پتا ہے۔ تم جانتی ہو۔ ڈیڈی کی خواہش تھی کہ تم میری شریک سفر ہو۔ انہوں نے تمہیں بچپن میں دیکھا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ تم سے بہتر میرے لیے کوئی اور لڑکی نہیں ہوسکتی۔ اور میں...... میں نے بھی دل کی گہرائیوں سے تمہاری رفاقت کی تمنا کی لیکن اس سے پہلے کہ تم میری رفیق سفر بنتیں وہ ہوگیا جس کے متعلق ہم میں سے کسی نے سوچا تک نہ تھا۔ لیکن ماہی جو کچھ ہوا اس میں نہ تم قصور وار ہو نہ میں پھر تم خود کو اور مجھے سزا کیوں دے رہی ہو؟“

اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے نگاہیں ان پر جمائے بیٹھی تھی۔

”زندگی کبھی کبھی انسان کو یوں ہی آزماتی ہے ماہی۔ وہ ایک مشکل وقت تھا جو گزر گیا۔ تم نے خود کو اسی وقت میں کیوں قید کر رکھا ہے۔ ذرا آنکھیں اٹھا کر دیکھو۔ آگے رستے روشن اور پھولوں بھرے ہیں کانٹوں بھرا راستہ تم طے کر آئی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اب کوئی خار تمہارے پاؤں زخمی نہیں کرے گا۔ میں تمہاری راہ میں آنے والے سارے کانٹے چن لوں گا تم میرا اعتبار تو کرو ماہی۔“ اس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”تم ڈیڈ اور بابا کی خواہش تھیں ماہی لیکن اس چاندنی رات میں تم سے باتیں کرتے مجھے لگا تھا جیسے تم میرے دل کی بھی آرزو بن چکی کب کیسے تم نے دل کی مسند پر قبضہ جمالیا مجھے پتا ہی نہیں چلا ماہی، لیکن میں بھی تم سے اپنے دل کا حال نہ کہہ سکا کہ بابا چاہتے تھے کہ ابھی تمہیں میرے اور اپنے درمیان طے پاجانے والے رشتے کا پتا نہ چلے کہ کئی مشکلیں تھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم ڈسٹرب ہو۔ شاید ان کے دل میں یہ خوف بھی ہو کہ میں جا کر نہیں پھر واپس آؤں گا بھی یا نہیں۔ اور شاید تمہاری کم عمری۔ سو میں تمہیں بتا نہ سکا کہ تمہاری ان لانبی پلکوں اور جھیل جیسی گہری آنکھوں اور ان کی جھلملاہٹوں نے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مجھے اسیر کرلیا ہے۔ اور وہاں جا کر بھی تمہاری ان خوب صورت سحر انگیز آنکھوں کا پہرہ میرے گرد رہا۔ اور تین سالوں بعد جب میں آیا تو۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

ماہی کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں اور ان کے لرزتے سائے رخساروں پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔ وہ چند لمحے یوں ہی اسے دیکھتا رہا۔

"میرا یقین کرو ماہی! میں تمہارے سارے درد چن لوں گا۔ تم نے اگر اس سرد ملک میں نہ رہنا چاہا تو میں یہاں ہی آجاؤں گا۔ تم نے کہا تھا ناں کہ اگر اسے تم سے پیار ہوا تو تمہاری خاطر وہ یہاں ہی آبسے گا تو میں۔ مجھے بھی تم سے محبت ہے ماہی۔"

اس کے ہاتھ کے نیچے دبا اس کا ہاتھ پسینے میں بھیگ گیا تھا اور آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچا تو اس نے اسے اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔

"یہ ہاتھ اب مجھے کبھی نہیں چھوڑنا ماہی۔ اپنی آخری سانس تک۔"

اور اس کا دل جیسے پگھل کر پانی ہوا تھا۔ اور مدتوں سے خشک آنکھیں برس پڑی تھیں۔ ایک ہاتھ میں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لیے۔

"یہ آنسو بہت قیمتی ہیں ماہی! آج جتنے آنسو بہانے ہیں بہا لو پھر کبھی نہ رونا۔" اور اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"ماہی! ادھر دیکھو اوپر چاند کی طرف وہ کتنا روشن کتنا بڑا اور خوب صورت لگ رہا ہے۔ ہم چاندنی راتوں میں ہمیشہ یہاں بیٹھ کر چاند کو دیکھا کریں گے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں یہاں ہی آجاؤں گا ہمیشہ کے لیے ہم بابا اور بڑی اماں کو اس عمر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ میں یہاں شہر میں ہی جاب کرلوں گا۔"

"اور آپ کی ماما؟" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"وہ میری شادی پر آئیں گی۔" اس کے دل میں یک دم ہزاروں پھول کھل اٹھے تھے اقرار کا ایک لفظ بھی کہے بغیر اس کے ساتھ عمر گزارنے کا اقرار کرچکی تھی۔

دو دن پہلے ہی اس کی ماما سے بات ہوئی تھی جلیل سیٹھی میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہیں وہاں، کبھی کبھی ہم انہیں ملنے چلے جایا کریں گے۔"

وہ آنکھوں میں اشتیاق لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں رخساروں پر شفق کھل اٹھی تھی۔

"ماہی!" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور ہاتھ پکڑے پکڑے وہ سیڑھیاں اتر کر صحن میں آگیا۔ اب وہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"ماہی! میری طرف دیکھو، یوں نظریں نہ جھکاؤ۔" اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی سیاہ جھیل جیسی آنکھوں میں جیسے کسی نے مٹھی بھر جگنو چھوڑ دیے ہوں۔ یا پھر سیاہ پانیوں میں منت کے دیے تیرتے ہوں۔

وہ آنکھیں جن میں اماوس کی سیاہ راتوں کے اندھیرے اتر آئے تھے اور دو حلقی شاموں کے سایوں نے انہیں اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اب جگ مگ جگ مگ کررہی تھیں۔

وہ چاندنی میں نہائی کھڑی تھی اور وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اور رابرٹ بروک کی نظم کے آخری بند کی لائنیں

تیری آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں
جن میں چاند اس وقت چمک رہا ہے
معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر ایک روشن ستارا گر پڑا ہو۔

تاریک رات کے پہلو میں خون آلود زخم ہے۔
اور کنارے پہ کھلی خوب صورت جھاڑیاں اشارے سے کہہ رہی ہیں کہ ٹھہرو اور میں ٹھہر گیا ہوں۔
تمہاری ان سیاہ جھیل جیسی آنکھوں کی تہہ میں چھپے خزانے کھوجنے کے لیے۔

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتے ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بنا پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بینک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج سکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقے سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ" اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030 الائیڈ بینک لمیٹڈ، بوشن مارکیٹ برانچ، کراچی۔ آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030 کریں۔ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/21000 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/24000 روپے

کسی بھی معلومات اور آرڈر کے لیے اس واٹس ایپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس ایپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مکمل ناول

جب وہ فلم دیکھ سکتے ہیں تو پڑھنا کیوں چاہیں گے؟" وہ اس آمد اور ذکر دونوں سے خوش نہیں تھا۔

"اس دن راہ دھیکا نے کیا کہا تھا یاد نہیں؟" امن دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹا۔

آسیہ رئیس خان

آسطور

"ایجنسی سے ٹرانسلیٹر آئی ہیں، بھیج دوں؟" اس کے منیجر امن نے خریدی گئی املاک کے کاغذات وہیں چھوڑ کر میز سے آج کی ڈاک اٹھائی جو وہ دیکھ چکا تھا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ! یہ میٹنگ آج تھی۔ اب موڈ نہیں ہے یار۔"

الحیب نے سستی سے پہیوں والی کرسی پیچھے کر کے دونوں ہاتھ سر سے اوپر سیدھے کرتے ہوئے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ اگر وہ نہ ہوتی تو کسی بہانے ملتوی کر دیتا تھا، جیسا اس سے پہلے کر چکا تھا۔

"تم اس سے پہلے بھی تین دفعہ کینسل کر چکے ہو شاید، اسی لیے وہ آج دو گھنٹہ پہلے سے موجود ہیں۔"

"کیا! دو گھنٹہ؟" وہ ایک دم ہاتھ گرا کر سیدھا ہوا۔

"ہاں جی اور میں اسے اندر بھیج رہا ہوں۔"

"جب میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے 'اے چینڈ تک گڈبائے' کا ٹرانسلیشن کروانا ہی نہیں تو پھر بات یہاں تک پہنچنا ہی نہیں چاہیے تھی۔ نیٹ فلکس اور ایمازون پرائم کے دور میں لوگ سست ہو گئے ہیں،

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اطیب نے ابرو اچکاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک سال کی کوششوں کے بعد بالآخر وہ کوئنس ہو گئی ہیں اور اب لگتا ہے تم بھی اس بے چاری کو سال بھر لٹکاؤ گے۔"

"تم دیکھ لو پلیز۔" اس نے منت کی۔

"سوری۔ میں بھیج رہا ہوں۔" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے کہا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے باہر نکل گیا۔

وہ پورا ارادہ کیے بے زار سا بیٹھا تھا کہ اسے جلد فارغ کر دے گا۔ ویسے بھی معاہدے کی رو سے اس کی اجازت کے بغیر ناول کا ترجمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ناول اس کے دل کے قریب تھا بلکہ وہ ناول نہیں اس کا دل تھا اور لگتا تھا کوئی بھی ان احساسات کو دوسری زبان میں اس طرح بیان نہیں کر سکتا جیسے اس نے لکھے تھے اور فلم بن جانے کے بعد اس کا مقصد بھی پورا ہو گیا تھا۔

اس کے بقیہ ناولوں کے دیگر زبانوں میں تراجم ہو چکے تھے لیکن وہ اس ناول کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔

ہلکی سی دستک کی آواز پر اس نے پشت سیدھی کرتے ہوئے کرسی درست کی۔

"کم ان پلیز۔" اس نے نرمی سے کہا۔

چوں کہ اختتام میں پیشکش رد ہونا تھی، اس لیے آغاز نہایت شائستہ کیا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے لیپ ٹاپ پر نظریں جما دیں۔ دروازہ کھلا اور ہیل کی مخصوص آواز ابھری جو قریب آتی جا رہی تھی۔ ان دیکھا سایہ سامیز کے طرف بڑھ رہا تھا۔ جب اس کے اندازے کے مطابق آنے والا کمرے کے وسط میں تھا۔

وہ کرسی ذرا سی پیچھے دھکیل کر سیدھا ہوا اور اسی لمحے کائنات ساکت ہو گئی، سوائے قدم قدم آگے بڑھتی اس لڑکی کے ساری آوازیں معدوم ہو گئیں سوائے ہیل کی ٹک ٹک کے سارے لفظ دھواں دھواں ہو کے اڑ گئے سوائے 'اے چینڈ لنگ گڈبائے' کے۔

چند سیکنڈ گزرے تھے، جب فرش کو دیکھتی وہ میز کی دوسری طرف پہنچ کر ٹھہر گئی اور ان چند لمحوں میں اطیب کی نگاہوں کے سامنے اگست دو ہزار چودہ کے وہ چند دن اپنی پوری جزئیات کے ساتھ کسی فلم کی طرح گزر کر اس منظر پر ٹھہر گئے تھے۔ آج دنیا کی سب سے اچھی بات اس کے پبلشنگ ہاؤس میں ہوئی تھی، دنیا کا سب سے خاص انسان اس کے دفتر میں موجود تھا۔ نوع انسانی کی تاریخ میں یہ لمحہ کہیں درج ہو رہا تھا کہ دنیا میں کسی کی مراد بر آنے پر ہونے والی سب سے زیادہ خوشی اس ایک لمحے میں تھی۔ یہ اتنی تھی کہ اس خوشی سے ساری دنیا کو بھرا جا سکتا تھا، سب کو بانٹنے کے بعد بھی ہاتھ خالی نہیں ہوتے تھے کہ اس خوشی میں صبر اور انتظار کی برکت تھی۔

اس کی آنکھوں میں شناسائی کی روشنی دیکھنے میں اس کی سیاہ فریم والی عینک رکاوٹ تھی۔ وہاں آشنائی کی رمق ہوتی بھی کیسے۔

وہ آج پہلی بار اس سے مل رہی تھی۔ بلیو جینز گھٹنوں کو چھوتا سفید انڈو ویسٹرن اسٹائل کرتا، جس کی آستینیں آٹھ سال قبل والے شب خوابی کے لباسوں جیسی پوری تھیں، سفید اور بلیو امتزاج کا بڑا سا دوپٹا، گلے میں ڈھیلا سا پھندا بنانے کے بعد جس کے دونوں سرے آگے جھول رہے تھے۔ بال سمیٹ کر گردن سے اوپر لپیٹے گئے تھے اور کان کے پیچھے سے جھانک رہی لٹوں کو اس قید سے اختلاف تھا۔ ایک ہاتھ کے سہارے سے اس نے ٹیبلیٹ سینے سے لگا رکھا تھا۔ دائیں شانے پر بڑا سا بیگ جھول رہا تھا۔

آٹھ سال پہلے اس نے اسے کچھ دن دیکھا تھا۔ اس کے پاس اس کی چند تصویریں تھیں لیکن ان میں ایک بھی واضح نہیں تھی کہ وہ سب فاصلے سے اور چوری سے کھینچی گئی تھیں۔ اگر وہ نہ بھی ہوتیں تو اسے اس کے خدوخال یاد تھے۔ ان برسوں میں کوئی شب ایسی نہیں گزری تھی کہ آنکھیں بند کرتے ہی یہ چہرہ نہ ابھرا ہو۔ اب وہ چھبیس ستائیس برس کی تھی اور چہرے پر پختگی تھی۔ وہ خوب صورت تھی، بہت خوب صورت یا ماورائی حسن رکھتی تھی، اس نے تب بھی غور نہیں کیا تھا کہ حسن کا درجہ

اچھی لگی تھی، لے کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا وہ اسے اچھی لگی تھی۔ بہت اچھی اتنی کہ اس کے بعد کوئی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی دنیا کا حسن تھی۔ وہ چہرہ تھا۔ وہ پیشانی، آنکھیں، ناک، رخسار، ہونٹ، اس کی گردن، ٹھوڑی، بال، کوئی ایک نقش بھی دھندلایا نہیں تھا۔

"ہیلو۔"

مسکراتے ہوئے اس نے سر کے ساتھ ساتھ کر بھی ذرا سی خم کی۔ دیگر ملاقاتیوں کی طرح اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے نہیں کیا تھا۔ وہ بھی اس کیفیت میں تھا کہ خود ہاتھ آگے نہ بڑھا سکا۔

"میں شاہین سعید۔" وہ جھجکتے لہجے میں دستور کے مطابق اپنا باضابطہ تعارف کروا رہی تھی اور اطیب نے پہلی بار اس کا نام سنا۔ وہ تو اس کے لیے شین تھی، الف کی شین۔

وہ اپنی بات ختم کر کے اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ اطیب اپنے اندر کی دنیا سے کمرے میں واپس لوٹا۔

اسے کوئی کام کرنا تھا نہ نوکری، اسے ڈگری نہیں چاہیے تھی، اس کا کوئی ہدف نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ بنا مقصد زندگی میں خوش رہنا چاہتی تھی لیکن وہ کتابیں بہت پڑھتی تھی اور اس وقت ملک کے صف اول کے ادبی ادارے کی طرف سے آئی تھی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، اس بات سے انجان کہ جس بیسٹ سیلر ناول کے ترجمے کے لیے وہ یہاں موجود تھی، اس کا مرکزی کردار وہ خود ہے۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" اس نے انگریزی میں کہا، پورے جذب سے، پورے دل سے۔ آج سے پہلے تک تکلف اور وضع داری نبھانے والا یہ جملہ ہمیشہ رسم ہوتا تھا مگر اس پل اس کی زندگی کا یہ سب سے بڑا سچ تھا۔

اس کے لیے یہ رسمی جملہ تھا سو وہ رسمی سے تبسم کے ساتھ مہمان کے لیے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ پر اعتماد تو تب بھی ہوا کرتی تھی لیکن یہ رکھ رکھاؤ، دنیا داری کے تقاضے اسے نبھانے نہیں آتے تھے۔ یہ سب اسے منظور نہ تھا، دوسروں کے لیے یہ زبردستی، یہ بناوٹ۔ وہ دوسروں کے لیے خود کو 'ریفائن' کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

"مجھے رادھیکا نے بتایا آپ اس ناول کا ترجمہ نہیں کرنا چاہتے، اس کی کوئی خاص وجہ؟"

اطیب اندر چلتی ہلچل کو مطمئن کرتے ہوئے مستعد ہوا لیکن اب لاکھ کوشش کے باوجود وہ رسمی اور پیشہ ورانہ انداز نہیں اپنا پا رہا تھا۔

"چوں کہ یہ میرا پہلا ناول تھا، میرے لیے خاص ہے اور مجھے نہیں اعتبار کہ کوئی ترجمہ کرتے ہوئے اس کی روح تک پہنچ پائے گا یا انصاف کر پائے گا اور اس پر فلم بن جانے کے بعد لوگ پڑھنے کے بجائے فلم ہی دیکھیں گے۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"دوسرا اعتراض تو ہونا نہیں چاہیے۔" اس نے کہا۔ اسے تھا بھی نہیں اس نے بس کہہ دیا تھا۔

"دنیا میں کتنے ہی ناولز ہیں جن پر فلمیں اور سیریز بن چکی ہیں لیکن ان کے نئے ایڈیشنز اب بھی شائع ہوتے ہیں۔ رہی پہلی بات تو یہ تحفظات تو ہر تخلیق کار کو ہوتے ہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرائی اور ٹیبلیٹ آن کیا۔

"کچھ اقتباسات کا ترجمہ آپ کو ای میل کر رہی ہوں، آپ دیکھ لیں، پھر رائے دیں۔" اس کی انگلیاں ٹیب کی اسکرین پر متحرک تھیں۔

"اگر یہ ناول پڑھ چکی ہے تو۔" اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ "تو کیا وہ وقت آ گیا ہے؟"

اس نے ای میل بھیجنے کے بعد سر اوپر اٹھایا تو وہ اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔

"چہرے سے لگ تو نہیں رہا کہ اسے ناول پڑھنے کے بعد کچھ یاد آیا ہے۔" سینے کا شور اداسی میں ڈھل گیا۔

"آپ مکمل نہیں ہوتے اور بیادھورا پن عزیز تر ہوتا ہے۔" اطیب کے آس پاس اس کی آواز گونجی، وہی جو اس نے آٹھ سال پہلے سنی تھی۔

"میں چیک کر کے آپ کو انفارم کرتا ہوں۔" وہ اس کے سامنے اس کے الفاظ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائے گا۔

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس جملے کو وہ اب آپ جا سکتی ہیں۔" کا اشارہ سمجھ کے کھڑی ہو گئی۔

"یہ بہت خوبصورت ناول ہے۔ مجھے یقین ہے اردو داں طبقے میں اسے بہت پذیرائی ملے گی اور امید ہے آپ کو میرا ترجمہ انصاف کرتا محسوس ہو گا۔" اس نے پھر سر کو ذرا سا خم کیا۔

"آئی ہوپ ہم جلد ترجمے پر کام شروع کریں گے۔" وہ بس مسکرا سکا۔

وہ الوداعی کلمات کہہ کر پلٹ گئی۔ اس کی ہیل کی ٹک ٹک دور ہوتے ہوئے معدوم ہو گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی اطیب کھڑا ہوا، گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں اور بے ارادہ ہی کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"شین۔ تو تم شاہین ہو یہ کیسا اتفاق ہے؟ کیا یہ واقعی اتفاق ہے؟ ہمیں اس طرح تو نہیں ملنا تھا، ہمیں تو شاید ملنا ہی نہیں تھا۔ کیوں نہیں ملنا تھا۔؟ تم نے یہ وقت اور قسمت پر چھوڑا تھا، اب فیس کروان کا فیصلہ۔ ہاں ہمیں ملنا تو تھا لیکن یہ تو نہیں سوچا تھا ہمارے درمیان ایسی اجنبیت حائل ہو گی۔" دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سرعت سے مڑا۔ امن اندر آ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ انکار کر دیا؟"

"نہیں۔" اس نے خود کو سنبھالا اور آگے آ کر لیپ ٹاپ اٹھایا۔ "اس نے مجھے ای میل کیا ہے وہ دیکھتا ہوں۔"

"تمہارا ارادہ بدل گیا۔" امن کی آنکھیں پھٹ رہ گئیں۔

"یہ تو نہیں کہا میں نے۔"

"وہ ایگریشن نہیں اب تمہاری بات میں۔ دادا کوئی پہنچی ہوئی چیز ہے مس شاہین سعید پہلے راضی کا اور اب تم۔"

"میں روم میں ہوں، دیکھوں، کیا ترجمہ کیا ہے۔"

"وہ لیپ ٹاپ لے باہر نکل گیا۔ دوسرا جملہ امن کو جتانے کے لیے تھا کہ اس کا ارادہ بدلا نہیں ہے۔

جس عمارت میں اس کے والدین اور بھائی مقیم تھے وہیں وہ بتیسویں منزل پر پینٹ ہاؤس میں رہتا تھا، یہیں اس کا آفس بھی تھا۔ امن بھی کبھار اس کے پاس ٹھہر جاتا تھا۔ وہ پہلے اس کی ایجنسی 'دوات' میں بطور لٹریری ایجنٹ کام کرتا تھا لیکن پچھلے دو سالوں سے وہ صرف اس کا منیجر تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے دروازہ مقفل کیا اور تیزی سے ای میل کھولا۔ ایک ہاتھ میں لیپ ٹاپ لیے وہ پلنگ کے کنارے ٹک گیا۔

باب 3

سرگوشیاں

"امید کا رنگین آنچل اوڑھے خواب کے آنگن دریچے پر دستک دینے کا کوئی طے شدہ وقت ہے نہ عمر۔ اس کی آمد کے راستے میں زندگی کی ناہموار یاں کبھی رکاوٹ نہیں بنتیں۔ الف کی آنکھیں بھی بنجر نہیں رہی تھیں۔ ایک خواب وہاں چپکے سے تمنا بو گیا تھا۔ اس سے کونپلیں پھوٹیں تو منظر بدل گئے۔ الف کی آنکھوں کی زمین زرخیز تھی اور اس نے بچے ارادوں سے اس تمنا کی آبیاری کی۔

یقین کے الفاظ کیوں اس کا مقصد بن گئے تھے، اس نے سوچا نہیں تھا، وہ اسے کوئی نام بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے یہ خیال ہی اچھا لگا تھا کہ وہ اس کی زباں سے نکلی بات پورا کر سکتا ہے۔ اس نے سوچا، احساس جس صورت دل کو چھوتا ہے، اسے ویسا ہی ان چھوا اور معصوم رہنے دینا چاہیے۔

محبت اور عشق ہی کو کیوں جذبات اور احساسات کی معراج مانا جائے، کچھ اس سے آگے بھی ہو سکتا ہے۔ نشہ۔ یہ پرستش نہیں تھی، عبادت تو معبود اور عبد کا تعلق ہے، یہ دو انسانوں کا ہو ہی نہیں سکتا اور اسے لگنے لگا تھا اس کا یقین سے تعلق محبت اور عشق سے آگے ہے۔ یہ خیال ہی اسے گدگدا رہا تھا کہ وہ اس احساس کے لیے آدم تھا یعنی پہلا انسان۔"

اطیب نے دوبار پڑھا۔ اس کے الفاظ پڑھ کر اس وقت وہ ان ہی احساسات سے دوچار تھا جن سے یہ سب پہلی بار لکھتے وقت ہوا تھا۔

"کیا وہ واقعی سب بھول گئی ہے؟ یہ ممکن ہے۔" سوچتے ہوئے اس نے دوسرا اقتباس پڑھنا شروع کیا۔

"محبت ایک لمحہ ہے، ایک نام ہے، ایک چہرہ اور وہ مجھے لمحوں مل گیا تھا۔ یہ چہرہ، یہ نام میرے لیے محبت بن گیا تھا۔ اسی پل فیصلہ ہو گیا تھا، میری باقی ماندہ زندگی اسی لمحے میں بسر ہونا تھی۔ یہ ایک لمحہ بڑا غنی تھا، اس لمحے کو میں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی احساس دان کیا تھا اور اس نے میرا دل اس قدر بھر دیا کہ پھر گنجائش ہی نہیں بچی۔ چاہت بڑی قانع ہوتی ہے، اتنی بڑی کائنات سے اسے کچھ لینا دینا نہیں رہ جاتا، سارے تقاضے بس ایک چہرے سے جڑ جاتے ہیں۔ لمحوں میں، میں محبت کا ماہر ہو گیا تھا لیکن ان سب کا احساس مجھے اس وقت نہیں بعد میں ہوا تھا۔" الف نے کہا تھا۔

لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر وہ بستر پر گر گیا۔ وہ اس وقت اگست دو ہزار چودہ میں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

میں ان دنوں بے حد بے زار تھا۔ بزنس اسکول آف لندن سے ڈگری لے کر لوٹنے کے بعد ڈیڈی مجھے روز اپنے ساتھ دفتر لے جانے لگے تھے۔ میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب مجھے یہ کرنا ہی ہو گا مگر اب جب وہ وقت آ گیا تھا تو میں کچھ دن اور اس سے بچنا چاہتا تھا۔

ڈیڈی کی فارماسوٹیکل کمپنی تھی جو ان کے دادا نے شروع کی تھی اور اب وہ ملک کی پہلی دس فارما کمپنیوں میں شمار ہوتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے ان سب میں دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کے علاوہ کیا کرنا چاہیے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں آج تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا تھا کہ میری دلچسپی کس چیز میں ہے۔

ایسے میں بھائی کے جگری دوست دانیال کی شادی کا کارڈ ملا۔ ہمارے فیملی فرینڈز تھے لیکن میں دانیال کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔ یہ شادی 'ڈیسٹینیشن ویڈنگ' تھی۔ پورے ہفتے کی تقاریب کی ترتیب 'ڈریس کوڈ اور تھیم' کے ساتھ کارڈ میں درج تھی۔ ممی ڈیڈی تو وقت پر شامل ہونے والے تھے لیکن بھائی ایک ہفتہ پہلے ہی جا رہے تھے۔ آفس سے فرار کے لیے میں بھی ان کے ساتھ نکل گیا۔

دانیال کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ وہ سب تو دو پشتوں سے ممبئی میں تھے لیکن ان کی کافی املاک اب بھی اتر پردیش اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں تھیں۔ رسکن بونڈ کے مسوری کے قریب کہیں پہاڑوں کے بیچ ان کی حویلی تھی۔ شادی وہیں تھی، ہمالیہ کے دامن میں۔

ممبئی سے دہرادون ائرپورٹ پر اترنے کے بعد سڑک سے ایک لمبا اور تھکا دینے والا سفر کر کے ہم وہاں پہنچے تھے۔ یہ پورا علاقہ دانیال کی فیملی کی ملکیت تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہونے کے پانچ منٹ بعد ہماری کار عمارت کے سامنے رکی تھی۔ حویلی کیا تھی، وہ تین منزلہ محل تھا۔ دور دور تک کوئی اور گھر یا بستی نہیں تھی۔

"اسے ہیریٹیج ہوٹل میں تبدیل کیوں نہیں کر دیتے؟" بھائی نے دیکھتے ہی دانیال سے کہا۔ ان کا دماغ بڑا 'بنیا' قسم کا تھا۔

"دادی کو جانتے تو ہو تم، وہ نہیں کرنے دیتیں۔ وہ اب بھی سال کے چند مہینے یہاں اسپینڈ کرتی ہیں، کہتی ہیں، میرے مرنے کے بعد جو چاہے کرنا، وہ ایموشنلی اٹیچڈ ہیں اس جگہ سے، ذرا اپنی یہ رائے پیش کرنا ان کے سامنے پھر خود دیکھ جاؤ گے۔" دانیال نے کہا۔

"واؤ! عام دنوں میں تو یہ ہارر فلم کی لوکیشن لگتی ہو گی۔" میں نے تین منزلہ حویلی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ آزادی سے پہلے تعمیر ہوئی عمارت تھی۔ پتھروں کی دیواریں، اونچے اور وزنی دروازے، پتھریلی روش، محرابیں، فوارے، لان کے درمیان حوض میں دو فنسوں کے بڑے سے مجسمے، سب مجھے بڑے حسین اور پر اسرار لگے تھے۔ لان کی آرائش اور ہریالی بتا رہی تھی کہ عمارت کا خیال رکھا جاتا ہے۔

"دادا کے دو چاچا اور تھے جو پارٹیشن کے دوران پاکستان چلے گئے تھے، گریٹ گرینڈ ڈیڈ نہیں

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گئے اور ان دو بھائیوں کی پراپرٹیز بھی ان کے حصے میں آ گئیں سو وہ اس وقت اس علاقے کے سب سے امیر اور پاورفل انسان تھے۔" دانیال انھیں اپنے خاندان کی تاریخ بتا رہا تھا۔

"زیادہ تر پراپرٹیز کمرشل بزنس میں بدل گئی ہیں لیکن دادی اس حویلی کو بزنس بنانے کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔"

شام ہو چکی تھی اور سفر کی تھکان بھی تھی، اس لیے میں کھانے کے بعد کمرے میں آ کر سو گیا۔ باقی سب دیر رات تک جاگتے رہے تھے۔ مجھے ہمیشہ گھپ اندھیرے کا اگلے دن میں ڈھلنے کا سفر بڑا دلفریب لگتا تھا۔ اس تغیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش میں میں کمرے سے باہر نکلا تھا۔ یہاں طلوع آفتاب جلد ہوتا تھا۔ میرا ارادہ باہر کھلی جگہ سے سن رائز دیکھنا اور پرندوں کی آواز میں موسیقی سنتے ہوئے کتاب پڑھنے کا تھا۔ لمبی سی راہداری کے دونوں طرف کمرے تھے۔ زیادہ مہمان اوپر کے تھے۔

نیچے رہائشی کمرے کم تھے۔ یہاں ایک بڑا ہال اور کھانے کا کمرہ تھا۔ راہداری کے آخری سرے پر کھلے صحن میں اوپر جاتا زینہ دیکھ کر میں لان میں جانے کے بجائے اوپر چلا آیا۔

پہلی منزل پر کمروں کے علاوہ دائیں طرف بڑا سا دروازہ تھا۔ یہاں بھی شاید ہال تھا۔ میں زینے چڑھتا اوپر آیا۔ دوسری منزل پر بھی خاموشی تھی۔ یہاں بھی سب سو رہے تھے۔

تیسری منزل استعمال میں نہیں تھی۔ صاف صفائی کی گئی تھی لیکن وہاں کوئی ٹھہرا نہیں تھا۔ میں چھت پر آیا۔ چھت بھی کسی میدان سے کم نہ تھی۔ گھوم کر چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے میں عمارت کے پیچھے کا منظر دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ ویسے تو چاروں طرف ہی پہاڑی سلسلہ تھا لیکن عقب میں وہ کچھ قریب تھے۔ سرمئی سے اجالے میں تاج کی طرح ان کے سر پر تیرتے سفید کالی ابر کے ٹکڑے جہاں انھیں نرم دل، مہربان اور شفیق بزرگ کا تاثر دے رہے تھے جس نے اپنی باہوں کے گھیرے میں حویلی کو قید کر رکھا ہے، ساتھ ہی ان کی وسعت اور جسامت اس قدر مغلوب کرنے والی تھی کہ دوسرے پل ایسا لگا جیسے وہ اس حویلی کے دربان ہیں جو اونچائی سے نگاہ رکھے ہیں یا وہ محافظ دستہ جو حویلی کو ہر سرد و گرم اور دشمن سے بچانے کے لیے اسے اپنے گھیرے میں لیے کھڑا ہے۔ جس نے بھی تعمیر کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا میں نے اسے دل ہی دل میں داد دی۔ پہاڑوں کی بناوٹ، ان کے نشیب و فراز اور آسمان کو چھوتی ان کی چوٹیاں، کبھی اتنی دل کش نہیں لگی تھیں جتنی اس وقت محسوس ہو رہی تھیں۔

میں چلتا ہوا دیوار تک آیا۔ یہ دیوار بھی چھت کے کنارے والی عام حفاظتی دیوار نہیں تھی۔ درمیانی حصے کی اونچائی تقریباً ساڑھے تین یا چار فٹ ہوگی اور دائیں بائیں طرف کا حصہ اس سے اونچا تھا، شاید دس بارہ فٹ زیادہ اور یہ اضافی حصہ ترشے گئے پتھروں کا چیک بورڈ سا تھا۔ دو پتھروں کے بعد ایک پتھر کی جگہ خالی تھی، اس طرح کہ وہاں چھوٹی محرابی کھڑکی سی بن گئی تھی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا 'لی چائلڈ' کا ناول 'نیور گو بیک' نیچے رکھا اور ٹریک پینٹ کی جیب سے فون نکال کر تصویریں بنانے لگا۔ نیچے جھانکا تو وہاں دوسری منزل کے پچھلے حصے کی چھت تھی۔ یہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ تیسری منزل کی چھت کے مقابلے میں یہ بس ایک پٹی سی بنی تھی۔ اس کے اختتام پر بھی تین ساڑھے تین فٹ کی حفاظتی دیوار تھی۔ اس کی سیڑھیاں بھی الگ، عمارت کے عقب سے تھیں۔

پہلی اور دوسری منزل کا یہ پچھلا حصہ شاید باورچی خانہ تھا یا ملازموں کے زیر استعمال تھا۔ وہاں ایک پرانی کرسی اور عمر رسیدہ سی تپائی بھی رکھی تھی۔ شاید یہاں کے ملازمین چھت پر آتے جاتے ہوں گے۔

"یہاں بھی ایک کرسی کی ضرورت ہے۔" میں نے سوچا۔

پہاڑوں کی اوٹ سے نمودار ہوتے سورج کے ساتھ مطالعے کا اپنا ہی چارم ہے۔ فون واپس جیب میں رکھ کر میں اتنی کھڑکیوں والی دیوار کی بناوٹ کا ستائشی معائنہ کر رہا تھا کہ دوسری منزل کی چھت پر آہٹ ہوئی۔

میں نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ سیڑھیوں سے چھت پر آرہی وہ لڑکی پاجامے اور پوری آستینوں والے شرٹ پر مشتمل نائٹ سوٹ میں ملبوس تھی، جس کی گلابی زمین پر بنی سیاہ تتلیوں کا خاکہ یہاں سے بھی واضح تھا۔ سیاہ بالوں سے پشت ڈھکی تھی۔ اس کا بھرا بھرا چہرہ ابھی ابھی رخصت ہوئی نیند کی غمازی کر رہا تھا۔ سورج ابھی اپنی کھوہ سے نکلا نہیں تھا لیکن اس نے انگڑائی لے کر اپنی کرنیں آگے بھیج دی تھیں۔ ان کی سنہری روشنی میں وہ صورت بھی سنہری ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شاید موبائل تھا۔ وہ آگے دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی میری طرح سامنے کا منظر دیکھ کر مبہوت تھی۔ اس نے بھی میری طرح بہت ساری تصویریں کھینچیں۔ میں ابھی سوچ رہا تھا، اسے متوجہ کروں، آواز دے کر بات شروع کروں کہ اس کی آواز ابھری۔

"سیکنڈ اگست فورٹین، فائیو تھرٹی مارننگ حویلی آغا جان۔" میں نے متوجہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"میری ڈیجیٹل ڈائری کا پہلا دن۔ کل دوپہر ہم یہاں فیضان انکل کے بیٹے اور داؤد انکل کی بیٹی کی شادی کے لیے آئے ہیں۔ سب ہیں، پاس اور قریب کے رشتے دار اور دوست احباب بس جن کا پیسہ خرچ ہو رہا ہے، وہ اس کی بھرپائی میں لگے ہیں یعنی دونوں انکل نکاح سے ایک دن پہلے آئیں گے۔"

ظاہر ہے میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ میں سب بھول کر پوری طرح ادھر متوجہ تھا۔

"بڑی دادی ابھی تو بہت خوش ہیں کہ حویلی میں شادی ہو رہی ہے لیکن جب بیچلرز پارٹی، برائیڈل شاور، مہندی اور سنگیت جیسی خرافات ہوں گی تو کاش میں ان کے ری ایکشن کی ویڈیو بنا سکوں یا ان کا انٹرویو ہی لے لوں۔

"تو خاندان کی روایت کو ٹھکرتا دیکھ کر جھول آپ کے اس بے خیالی کے بیچ کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟"

اس نے نیوز اینکروں کے انداز میں کہا تھا۔ وہ پیچھے مڑی اور چلتے ہوئے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ فون اس نے ہاتھ میں یوں پکڑ رکھا تھا کہ مائیکروفون کا رخ منہ کی طرف تھا۔ وہ ریکارڈ کر رہی تھی۔

"یہ جگہ مجھے پسند آئی۔ کل شام یہاں چھت پر آتے ہی میں نے سوچا، کاش میں ہمیشہ کے لیے یہاں رہ سکتی! یہ حویلی، یہ چھت، ڈھیر ساری کتابیں، فرائز اور میں۔ کوئی دھاڑ سے دروازہ کھول کر کمرے میں آئے، نہ صبح کالج جانے کی فکر، نہ لوگوں کے چہرے نہ باتیں نہ سوال، آئیڈیل لائف۔ ابھی کل ہی روبی آنٹی نے دیکھتے ہی کہا۔ شادی میں آئی ہو، بال ہی ڈائی کر لیتیں۔" اس نے ان آنٹی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے جملہ ادا کیا تھا۔

"میں نے بھی پوچھ لیا تو کیا واپس چلی جاؤں؟ گناہ تو نہیں ہوگا اور نیچرل رنگ سے شرکت کر لوں تو؟ بس سامنے وہیں لکھنوی انداز میں عزت افزائی کر دی۔ خیر یہ تو شروعات ہے۔ ویسے مجھے لگتا ہے، سب اب میرا موقف سمجھنے لگی ہیں کہ میں میک اپ کروں گی، بال بھی ڈائی ہوں گے، ڈیزائنر پیس بھی پہنوں گی لیکن اس وقت جب میرا دل چاہے گا، اس لیے نہیں کہ باقی دنیا کر رہی ہے، دوسرے یہ ایکسپیکٹ کرتے ہیں، یہ فلاں فنکشن کے لیے لازمی ہے بلا بلا بلا۔ تھینک یو۔" اس نے چہرہ آسمان کی سمت کیا۔

"اتنی انڈراسٹینڈنگ اماں دینے کے لیے۔"

کچھ دیر رک کر اس نے شاید اگلی بات سوچی۔

"میں آج بس فون لے کر اوپر آ گئی، کتاب لائی ساتھ نہ لیپ ٹاپ۔ سورج نے اپنا منہ دکھا دیا ہے۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جگہ سے کسی خاتون کو اس کے سر پر پہنچ کر اسے تاڑ بھی
انداز میں کچھ کہتے دیکھا۔ آخر وہ ہاتھ اٹھا کر صلح جو
انداز میں کچھ کہتی چلی گئی، جیسے صبح کہا تھا ''او کے
بڑے آ رہی ہوں۔'' وہ خاتون شاید اس کی والدہ
تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو لباس تبدیل کیا تھا۔ کریم کلر کی فراک اور چوڑی دار پر اس سے میچنگ نہیں رہا، ایسا طویل و عریض گہرا سبز دوپٹا تھا۔ جس کے موتی نگینے زری اور جانے کیا کیا، دور سے جھلمل کر رہے تھے۔ اس کی ساری تیاری لپ اسٹک اور کھلے بال تھے۔ اس نے ہال میں آکر کسی کو تلاش کیا اور پھر سب کو چیرتی ان کی طرف بڑھی۔ وہ وہی خاتون یعنی اس کی ماما تھیں جنھیں وہ ان کے حکم کی تعمیل کا ثبوت دینے گئی تھی۔

اس کے بعد وہ ایک گوشہ پکڑ کر بیٹھ گئی اور میں جانتا تھا وہ سب کو دیکھ کر مزے لے رہی ہے۔ مجھے اس کی نگاہوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہال میں اس کی ہر مسکراہٹ، ماتھے کی تیوری، ہونٹوں کی جنبش، زیر لب تبسم کی وجہ کھوجنے میں مزہ آ رہا تھا۔

اسے میری مسلسل نظروں کا احساس شاید اس لیے بھی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے آس پاس کی پروا نہیں تھی، اس کی اپنی دنیا تھی اور وہ اس میں مگن تھی۔ وہ لاعلم تھی کہ کوئی اور بھی اس کی دنیا میں شامل ہو گیا ہے۔ گاہے گاہے کوئی اس کے پاس آکر بیٹھتا اور بات کر لیتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ تنک چڑھی یا مغرور قسم کی لگ رہی تھی جو بدمزگی یا بے عزتی کے خوف سے اس کے پاس جانے سے کتراتا یا میں شرمیلا تھا جو اسے اپروچ کرتے ہوئے جھجکتا بلکہ سچ یہ تھا کہ مجھے اسے یوں دور سے دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

وہ دلچسپ کتاب تھی جسے میں ورق ورق پڑھ رہا تھا۔ اگلے صفحے پر کیا سرپرائز ہوگا یہ خیال مجھے جلد بازی سے روک رہا تھا اور اسے جاننے کا تجسس بڑا دلچسپ تھا۔ آہستہ آہستہ لفظ لفظ کو اندر اتارتے ہوئے پڑھنا مجھے ہمیشہ پسند تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح اوپر جاتے ہوئے میں نے تیاری کی تھی۔ تیسری منزل سے ایک اسٹول ساتھ لے لیا تھا اور فون سائلینٹ موڈ پر تھا، میرے ہاتھ میں کتاب بھی نہیں تھی۔ آج وہ دیر سے آئی تھی۔ تیزی سے زینے پھلانگ کر وہ دیوار کے پاس بھاگی۔ آج بال ہیئر بینڈ میں قید تھے۔ کل جیسا ہی شب خوابی کا لباس تھا مگر رنگ ہلکا پرپل تھا جس پر ذرا گہرے شیڈ کے شاید ننھے ننھے پھول پرنٹ تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر فون منہ کے قریب کیا۔

''تھرڈ اگست فورٹین، فائیو ففٹی ون، حویلی آغا جان۔

آج مجھے دیر ہو گئی۔ سورج طلوع ہو چکا ہے اور سامنے کا نظارہ بہت خوبصورت ہے۔ یہ شفق شام کی شفق سے زیادہ پیاری ہوتی ہے شاید اس لیے کہ وہ ڈوبنے کی سرخی ہوتی ہے اور یہ ابھرنے کے رنگ۔ اسے دیکھ کر روح تازہ دم ہو جاتی ہے، دل میں بیٹھی اچھے گمان اور امیدیں جاگ اٹھتی ہیں، جیسے ابھی میرا کل رات سے آف موڈ ٹھیک ہو گیا ہے۔''

کچھ دیر ٹھہر کر وہ پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کل پہلا دن تھا اور میں سوچ رہی تھی اگر یہ ٹیرس اور ویو دریافت نہ کیا ہوتا تو میں بھاگ جاتی یہاں سے یا گر سوچ ڈوچ کا ڈراما کر کے کمرے میں بند رہتی۔ اب مجھے نہیں پسند لوگ ہجوم میں تو میری کیا خطا۔؟ اس میں لوگوں کا قصور ہے، وہ ایسی باتیں اور حرکتیں کرتے ہیں جو مجھے اچھی نہیں لگتیں پھر بھی میں تو اخلاق نبھاتی ہوں، کوشش کرتی ہوں، ان سے دور رہتی ہوں، انھیں دیکھ کر مسکراتی بھی ہوں، ان کے منہ پر کہہ نہیں دیتی کہ سنو بہن اس میک اپ اور ڈائیڈ بالوں کو جھٹکتے ہوئے مصنوعی ہیلیٹ کے ساتھ امریکن کزن سے بات کرتے ہوئے تم مجھے بالکل فش مارکیٹ کی وہ آنٹی لگ رہی ہو جو دو دن باسی مچھلی بیچنے کے لیے اس کے تازہ ہونے کے جھوٹے دعوے پیش کرتی ہیں، اب گلی ولی کیا ابھی تو منظر بہت خوبصورت ہے، پہاڑوں کو پہلی بار اتنا قریب سے دیکھا ہے اور مجھے نہیں معلوم تھا، یہ اتنے خوبصورت بھی لگ سکتے ہیں، اپنی طرف بلاتے، کچھ کہتے، شانت سے بھی اور شور کرنے کو بے چین لگتے بھی، بے حد دل نشین۔''

میں نے اس سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھا۔ واقعی دم بخود کرنے والا نظارہ تھا۔

''سچ ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''قدرت نے ہمیں فرحت اور مسرت دینے کے اتنے انتظام کر رکھے ہیں اور ہم ان کے بجائے فرحت اور مسرت کے لیے پیسے خرچ کرتے ہیں پھر ان پیسوں کو کمانے کے لیے اپنی ساری توانائی اور وقت بھی اور پھر ایسی کتنی سو کر گزارتے ہیں۔ شانو بی بی یہ گیان اس لیے دے رہی ہو کہ تمہارے آبا و اجداد کے پاس پیسے تھے اور پیسوں والوں سے تعلقات بھی جو حویلی بنا سکے اور تمہارے والد تمھیں یہاں لا سکے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ اور استہزائیہ تھا۔

''ہاں تو بس اتنا کافی ہے وہ لوگ یہاں بیٹھ کر اس منظر کو انجوائے نہ کر سکے تو مزید پیسوں کا کیا کریں گے۔ اور چار حویلیاں بنا بھی لیں تو کیا فائدہ اگر اس جگہ سے یہ سن رائز نہ دیکھ سکے آج کے لیے اتنا ہی، اب میں خاموشی سے اس جگہ کو انجوائے کروں گی۔''

اس نے ریکارڈنگ بند کی اور فون تپائی پر رکھ دیا۔ بال سمیٹ کر دو تین بار دائرے میں گھما کر جوڑا سا بنایا اور کلائی پر چڑھا ہیئر بینڈ کھینچ کر بالوں کے گرد لپیٹ دیا۔ اب ہم دونوں خاموشی سے سامنے دیکھ رہے تھے جہاں نیا دن جلوہ افروز ہو رہا تھا۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہیلو۔ اس ویرانے میں کہاں جاؤں گی۔ نہیں ماما! باہر نہیں نکلی، یہیں ہوں۔ ہاں بلڈنگ میں ہی، آپ سو جائیں ساڑھے سات تک آ رہی ہوں۔''

بات ختم کر کے وہ کھڑی ہو گئی۔ پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور کسی کی موجودگی سے باخبر ہوئے بنا سیڑھیاں اتر گئی۔

میں اونچی دیوار سے ہٹ کر درمیانے حصے میں آیا۔ پتا نہیں چھپ کر اسے دیکھنا اور سننا غیر اخلاقی حرکت تھی یا غیر ارادی مگر میں کل دوبارہ یہاں آکر ارادی اور غیر اخلاقی طور پر پھر یہی کرنے کی ٹھان چکا تھا۔

واپس نیچے آیا تو سب سو رہے تھے۔ ملازم جاگ کر اپنے کاموں سے لگ چکے تھے۔ شادی کے انتظامات پروفیشنل ایونٹ مینجمنٹ فرم کے سپرد تھے اور یہاں ان ہی کا عملہ مستعد تھا۔ ناشتہ، کھانا اور سب کچھ تکلف ہی تھا چوں کہ میرے لیے سب اجنبی تھے اس لیے میں الگ تھلگ پڑ گیا تھا۔ صبح والی اتفاقی ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میں گھلنے ملنے کی اور دوستی کرنے کی کوشش کرتا لیکن اب مجھے ایک جستجو لاحق تھی۔

مجھے فرصت تھی نہ اکتاہٹ کا احساس تھا۔ میری نظریں اسی کی تلاش میں تھیں۔ ناشتے کے وقت وہ سب سے پہلے آئی تھی۔ اس وقت میں دور بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہلکے زرد رنگ کا کرتا اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ سفید دوپٹا گلے میں تھا، گیلے بال کھلے تھے۔ اس وقت اس کے کان میں بڑی بڑی بالیاں تھیں جو صبح نہیں تھیں۔

وہ ادھر ادھر دیکھے بنا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ انتخاب مشکل بنانے والے ڈھیروں لوازمات میں سے اس نے ایک ابلا انڈا پلیٹ میں رکھا، اسے کھایا پھر ٹوسٹ پر مکھن لگا کر اس کے ساتھ چائے پی اور اٹھتے ہوئے سیب ساتھ لے گئی تھی۔ میری طرف کیا اس نے ادھر ادھر اور کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں دیگر لڑکوں کے ساتھ ساری دوپہر حویلی سے باہر تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے شام میں نظر آئی۔ اس وقت کوئی تقریب تھی سب تیار شیار تھے لیکن وہ اسی صبح والے حلیے میں تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میں نے صادق بھائی سے نہیں کہا کہ آپ ہر گفتگو میں کہیں نہ کہیں سے اپنی امپورٹڈ کار اس طرح گھسیڑتے ہیں جیسے اسٹریٹ فوڈ والے ہر چیز میں مایونیز اور چیز۔"

اس نے فون دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

"مجھ سے زیادہ تہذیب دیکھنے والا دور دور تک کوئی نہیں پھر بھی کل آپی کہہ رہی تھیں، تم آدم بیزار اور اَن مینرڈ ہو گئی ہو۔ اب انہیں کون بتائے یہ آدم اسپیشلی اس گھر کے آدم زاد تو میری تفریح اور دلچسپی کا سامان ہیں۔" وہ بڑے دل سے ہنسی تھی۔

"تھینک یو اللہ پاک! ایسے نمونوں کے بیچ بھیجا۔ وہ مجھ سے بور ہوتے ہیں، میں ان سے بور نہیں ہوتی۔ بس یہ مجھ سے دور رہیں، میرے پاس آ کر سوال جواب اور بات چیت نہ شروع کریں تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ایمان سے ان کو دیکھتے ہوئے دن کب گزرتا ہے پتا ہی نہیں چلتا۔ بس اللہ انہیں مجھ سے بیزار کر دے تاکہ کوئی میرے پاس پھٹکے نہیں۔"

مجھے احساس ہوا، میں کب سے مسکرا رہا ہوں۔

وہ پتا نہیں کس کی طرف سے شامل تھی۔ مجھے بھائی سے جو معلومات ملی تھیں۔ اس کے مطابق دولہا دلہن آپس میں رشتے دار تھے۔ ان کا خوب پھیلا ہوا اور بڑا خاندان تھا۔

ہمارے یہاں ڈیڈی اور ممی دونوں کی طرف گنے چنے افراد تھے اور ان کے بچے اس سے بھی کم۔ ایک پھوپھو تھیں جو جرمنی میں بسی تھیں، ایک خالہ جن کے دو بچے تھے اور ایک ماموں جن کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ان کے علاوہ جو رشتے دار تھے، میں ان سے واقف نہیں تھا۔ تقریبات میں ملاقات ہو بھی تو میں کسی کو پہچان نہیں پاتا تھا۔

میں نے پتا کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کس کی جانب سے ہے اور کیا رشتہ ہے مگر ناکام رہا۔ اس دن وہ مجھے ایک بار رات میں نظر آئی تھی۔ اتنے لوگوں میں وہ مجھ سے گم بھی ہو جاتی تھی۔ سارا وقت اسے نگاہ میں رکھنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

تقریب کی تھیم فیری ٹیلز تھی اور وہاں ڈزنی مووئیز کے سارے کردار چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ سینڈریلا، الہ دین، سنو وائٹ سے لے کر مرمیڈ، ایلسا اور میلیفیسنٹ جیسے ولن بھی موجود تھے۔ وہ ویسے ہی ایک گوشہ سنبھالے سب کو دیکھتے ہوئے اپنی دنیا میں گم تھی۔ کاش اس وقت میں اس کے ذہن میں چل رہی باتیں سن سکتا تھا۔

☆☆☆

آج وہ میرے آنے کے دو چار منٹ بعد ہی آ گئی۔ آج اس کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تھا جو اس نے تپائی پر رکھ دیا تھا۔ ذرا دیر ٹہلنے کے بعد اس نے جیب سے فون نکالا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"فورتھ آف اگست فورٹین، فائیو تھرٹی فائیو، حویلی آغا جان۔

آج میں وقت پر آئی ہوں ابھی سورج نے پوری آنکھیں نہیں کھولی ہیں۔ اس کے نکلنے اور ساری دنیا پر چھانے سے ذرا پہلے کا یہ نظارہ بھی خوبصورت ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد سٹی میں پھر کہاں مجھے ایسا سن رائز دیکھنے ملے گا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے یہ جگہ اور یہاں کی ہر چیز اٹریکٹ کر رہی ہے کہ میں نے نیچر کو اتنا قریب سے بہت کم دیکھا ہے۔ کاش میں کسی ایسی جگہ پر ہمیشہ رہ سکوں!" اس نے ذرا سا وقفہ لیا۔

"میری خواہشیں کچھ یوں ہیں کہ مجھے بی اے کے بعد کوئی آگے پڑھنے کو نہ کہے، کریئر چوز کرنے تو بالکل نہیں، کتابیں پڑھنے سے کوئی نہ روکے، نان فکشن اور سیلف ہیلپ موٹیویشنل ٹاپکس کی کتاب کوئی گفٹ نہ کرے، میں جتنے فرائز کھاؤں کبھی موٹی نہ ہوں اور کل کے فنکشن کے بعد میں چاہتی ہوں، میری اپنی ایک فیری ٹیل ہو، میری پرسنل، ذاتی فیری ٹیل۔"

وہ یوں سرہلا رہی تھی جیسے خود کو یقین دلا رہی ہو کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔

"میں کیوں کسی اور کی کہانی کا کردار بنوں، میرا دل نہیں کیا اور میں نے مما کا لایا ڈریس بھی نہیں پہنا۔ انہوں نے میرے لیے ریڈ رائڈنگ ہوڈ والا کاسٹیوم بنایا تھا۔ وہ اس بات پر تھوڑا ناراض بھی ہیں۔ ویسے ان فیری ٹیلز کے لیے سوتیلی ماں، ظلم، قید، آزمائشیں، بددعائیں، شراپ وغیرہ وغیرہ لازمی شرائط کیوں ہے بھلا۔ فیری ٹیلز میں ایک عام لڑکی کیوں نہیں ہو سکتی؟ پیسے والے ماں باپ، اوکے اوکے بہنیں اور آرام دہ زندگی گزارنے والی کی بھی خواہش ہوتی ہے فیری ٹیلز کی۔ اسے بھی کوئی پرنس جیسا بندہ ملے اور صرف اس کے لیے کچھ ایسا کر جائے جو اس سے پہلے کسی نے کیا ہو نہ سوچا ہو، ایسا کچھ کہ آنے والے زمانے اسے پڑھیں، یاد کریں، بچوں کو سنائیں۔ مجھے چاہیے ایسی فیری ٹیل، مجھے کیوں نہیں مل سکتی۔"؟ اس کی آواز میں ضد سی تھی۔

"کیوں کہ میں 'ابلا ناری' نہیں، ایکسٹرا آرڈنری نہیں، میرے ساتھ ظلم نہیں ہوتا۔ ناٹ فیئر!" وہ کچھ دیر چپ رہی، شاید کچھ سوچ رہی تھی۔

"میں بے حد لیزی ہوں، بہت ممکن ہے کل کو مما پاپا کسی کی تصویر دکھا کر کہیں 'دیکھو تمہارے لیے پرپوزل ہے۔' تو میں ناول کے دوران دوبارہ ڈسٹرب نہ کی جاؤں اور یہ سین ریپیٹ نہ ہو اس لیے بنا دیکھے ہی اوکے کر دوں گی۔ میں جانتی ہوں، انٹرسٹ نہیں تو گھر میں سب سے پہلے مجھے ہی فارغ کیا جائے گا، اینڈ اٹس اوکے۔ پھر بھی میرے اندر یہ خواہش ہے اپنی ذاتی فیری ٹیل کی جس کی ہیروئن میں ہوں، ہائے یہ خیال ہی کتنا اچھا ہے!"

اس کی چہکتی آواز میں جوش اور خوشی تھی۔ اس نے کچھ دیر رک کر ریکارڈنگ بند کر دی۔ کچھ تصویریں لیں اور پھر ہم دونوں خاموشی سے قدرت کو سنتے رہے یا شاید وہ اپنے خیال میں کھوئی تھی۔

کچھ وقت بعد وہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ جیب سے کیبل نکال کر اس نے فون اور لیپ ٹاپ کنیکٹ کیے تو میں سمجھا کہ وہ ریکارڈنگ لیپ ٹاپ میں منتقل کر رہی ہے۔ شاید اس کی ڈیجیٹل ڈائری لیپ ٹاپ میں تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ حویلی میں زنانہ مردانہ انتظام یا حصے علیحدہ تھے۔ سب آزادی سے ایک ساتھ گھوم پھر رہے تھے لیکن ایک تو شاید وہ زیادہ تر کمرے میں ہوتی تھی اور میرے لیے وہاں سب اجنبی تھے اس لیے میں بھی سب کے ساتھ شامل نہیں ہو پاتا تھا۔ وہ زیادہ دکھائی دیتی بھی نہ ہمارا سامنا ہوتا تھا۔ کبھی ایک جھلک نظر آ گئی تو کبھی کہیں بیٹھی یا کسی سے بات کرتے ہوئے۔ اس کے باوجود میرا ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ اس بھیڑ میں اسے کھوجتا اور ڈھونڈتا رہوں۔

☆☆☆

ہر رات بہت دیر تک خوب ہنگامے اور موج مستی ہوتی رہتی تھی۔ مختلف مقابلے اور کھیل ہوتے۔ جس میں ہر کوئی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ ظاہر ہے سب یہاں اسی مقصد سے اکٹھا ہوئے تھے، سب کے موڈ اور یہاں کا ماحول شادی کا تھا۔ اگر پچھلی صبح مجھے وہ نہ ملی ہوتی تو میری بھی چند دوستیاں ہو گئی ہوتیں، میں بھی ہر فنکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا مگر اب میری ساری دلچسپی اس میں تھی۔ اسی کے لیے سرِشام سو جانا، صبح جلدی اٹھنا اور پھر باقی دن اسے ڈھونڈنا اور دور دور سے دیکھنا مشاہدہ کرنا، اس کے ذہن میں چل رہی باتیں قیاس کرنا۔ میں قریب جانے سے اس لیے بچ رہا تھا کہ کہیں میں اس کی نظر میں نہ آ جاؤں کہ وہ تیز فہم تھی۔ انجانے میں اس کے قریب ہونے اور اسے جاننے کا مزہ نشے جیسا تھا۔

میرا اسٹول اب اسی جگہ پر رہتا تھا۔ میں ہمیشہ اس سے پہلے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ پوری حویلی میں شاید ہم دونوں کے کمروں میں ہی صبح کا الارم بجتا تھا۔

"پانچ اگست فورٹین، فائیو ففٹی، حویلی آغا جان۔"

آج وہ شاید غصے میں تھی یا جھنجھلائی تھی جو آتے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہی شروع ہوگئی۔

"کیوں بھئی جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں اسے جینے کا حق نہیں ہے کیا؟ نہیں کرنی نوکری نہ بزنس تو ایسا کیوں سمجھا جاتا ہے کہ مجھے ڈوب کر مر جانا چاہیے۔ پہلے صرف مما اور بڑی آپیاں تھیں اب لگتا ہے انہوں نے مجھے شرم دلانے اور میٹھے میٹھے طعنے مارنے والی دکان کی فرنچائز سارے خاندان کو دے دی ہیں۔ ہر کوئی سمجھتا ہے ان کے طے کردہ معیار پر پورا نہیں اترتا تو وہ کامیاب ہے نہ صحیح الدماغ!

مجھے ڈگری لینے کا شوق نہیں لیکن سب جانتے ہیں کتابیں میرا عشق ہیں اور ان کے نزدیک یہ میرا پاگل پن ہے۔ کل ہی چھوٹی نانی میرے ہاتھ میں عصمت چغتائی دیکھ کر غش کھانے والی ہوگئی تھیں۔

جب کہ سمونا آنٹی نے کہا۔

ٹرانسلیشن میں وہ مزہ نہیں تمہیں پڑھنا ہو تو اردو میں ہی پڑھو۔

تب ہی شہوار نانی نے اپنے مخصوص جتاتے انداز میں مجھے بتایا کہ ہمارے زمانے میں عصمت کو پڑھنا بے حیائی میں شمار ہوتا تھا۔ ایسی لڑکیوں پر بولڈ کا ٹھپا لگ جاتا تھا۔ اب انہیں کیسے سمجھایا جائے کہ ففٹی شیڈز کے زمانے میں عصمت پڑھنے کا شوق سعادت ہے، سعادت!" اس نے ایک گہری ٹھنڈی آہ بھری۔

"میرا بس چلتا تو میں بی اے بھی نہیں کرتی۔

اور میرا بس اللہ جانے کب چلے گا۔

بہت دنوں سے سب پوچھے جا رہے ہیں، کوئی ایم (مقصد) تو ہوگا، کرنا کیا ہے تمہیں، کچھ سوچا اپنی زندگی کا۔ بی اے میں ایڈمیشن لے کر تو میں نے پہلے ہی سب کی ناک کٹوا دی ہے۔ ان سوالوں کو رات میں نے سنجیدگی سے سوچا اور جواب ملا، میں نے اپنی زندگی کا کچھ نہیں سوچا، میری زندگی کا کوئی ایم نہیں سوائے اس کے کہ میں اس کا ہر پل، ہر لمحہ اپنی مرضی سے جیوں، خوش رہوں۔

صرف خوش رہنا زندگی کا مقصد کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہ بھی تو اچیومنٹ ہے کہ بندہ ہر دن ہنس مسکراتے گزارنے کی کوشش کرے اور کامیاب بھی ہو۔ گھر میں تو صبح ہوتے ہی سب کے چہروں پر دن بھر کے کام کا بوجھ ہوتا ہے، یہ میٹنگ، وہ ڈیڈ لائن، فلاں کام ویسا نہیں ہوا جیسا ہونا تھا اس کی فکر، کام نہ ہو تو انہیں سوشل گیدرنگز اٹینڈ کرنے کا بھی اسٹریس ہوتا ہے، ریلیکس تو ہوتا نہیں کوئی۔ رات میں سوتے سوتے بھی اگلے دن کے کام یاد کیے جاتے ہیں روز بھی۔ اس سے اچھی میری والی زندگی نہیں؟" وہ کافی دیر چپ رہی۔

"اس صبح اور ان پہاڑوں نے مجھے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ کل رات میں سوچتے سوچتے سوئی اور آنکھ کھلتے ہی وہ ہی سب باتیں یاد آئیں شاید اس لیے۔ یہ وقت دن کا سب سے پرسکون وقت ہوتا ہے [illegible] میں الو زیادہ ہیں۔ سورج مجھے دیکھ رہا ہے اور یہ بھی خوبصورت ہے الحمدللہ۔"

اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

نانیوں کا ذکر سن کر میں نے وہاں کی بزرگ خواتین پر غور کیا تھا کہ اس کے متعلق معلوم ہو سکے۔ میں دانیال کی دادی کو پہچانتا تھا۔ سارا وقت ان کی گود میں رہنے کے بعد بھی مجھے سمونا آنٹی ملیں نہ شہوار نانی ملیں۔ اکثر خواتین اپنی رفتار سے بات کرتی تھیں کہ میری سمجھ میں ہی نہ آتی تھی۔ اور نام تو وہ اس سے زیادہ رفتار اور کسی اور سیارے والے لہجے میں ادا کرتی تھیں۔

☆☆☆

"چھ اگست فورٹین فائیو فورٹی ٹائم، حویلی آغا جان۔" آج وہ ٹہل رہی تھی۔

"سن رائز ہو چکا ہے اور اب یہاں سے ہمارے جانے کا وقت بھی۔ کل آخری دن ہے اور حویلی آغا جان چھوڑ کر جاتے ہوئے شاید میں رونے ہی لگوں۔"

اس کی بات مجھے بڑی بچی لگی۔ میں بھی اداس تھا۔ میں چاہتا تھا یہ سلسلہ چلتا رہے

جو چاہے کریں، ہم دونوں ان چھتوں پر یونہی ان نظاروں کو دیکھیں اور کوئی ہمیں دیکھنے سے نہ روکے۔

"یہ خوبصورت منظر میرے اندر بہت ساری خوشی بھر دیتا ہے، کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ان بوڑھے پہاڑوں کا حسن مجھے رلا دیتا ہے۔ کیا یہ نارمل ہے کہ اچھی، حسین اور من پسند بات آپ کو رلا دے؟ بل کھاتے پہاڑ صدیوں سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، کاندھے سے کاندھا ملائے ہر موسم مل کر جھیلتے ہیں، مجھے ان کا آسودہ جسم محسوس ہوتا ہے، ان کی شکر گزاری کی خاموش دعا سنائی دیتی ہے کہ دھوپ، بارش اور خشکی سے ان کا مقدر ہوئی سوغاتیں اور آفتیں یہ ایک ساتھ سہتے ہیں تو بھی مجھے ان کی تڑپ اور سسکیاں بھی آس پاس سنائی دیتی ہیں کہ یہ تھک گئے ہیں، یہ ایک دوسرے کو گلے نہیں لگا سکتے، ان کے مقدر میں ساتھ ہے قربت نہیں۔" اس کی آواز کھوئی سی تھی۔

"مجھے دکھائی دیتا ہے، انہیں گردنیں موڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے، ان کی آنکھوں میں حسرت ہے، لیکن ان کے لبوں پر ایک دوسرے کے لیے مہربان تبسم بھی ہے، یہ ساری باتیں کس سے کرتے ہیں، انہیں آواز اور الفاظ کی حاجت نہیں۔ یہ بھی تو حسن ہے، دلکشی ہے مگر اس میں ایک اداسی ہے، آسودہ سی اداسی، اطمینان ہے اور کسک بھی، حسرت بھی مسرت بھی اور مجھے یہ اپیل کرتا ہے۔ ایسا ساتھی جو آپ کے ساتھ ہے لیکن پاس نہیں، آپ مکمل نہیں ہوتے اور یہ ادھورا پن عزیز تر ہوتا ہے۔"

میں دم بخود سا اسے نہیں ان پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا اور ریکارڈ ہوتا ہر لفظ مجھے سچ لگ رہا تھا۔

"کوئی ان کی محبت پر بات کیوں نہیں کرتا۔؟ ان کے مقدر سب سے الگ ہیں، پربتوں کے یہ سلسلے ساتھ اور پاس، قربت اور رفاقت کی تفریق اور یکسانیت سمجھانے والی انوکھی مثالیں ہیں، ایسی مثالیں جن میں اداسی بھری طمانیت ہے۔ مجھے یہاں آکر ان سے عشق ہو گیا ہے۔"

اس نے آہستہ سے فون رکھ دیا۔ فضا میں بھی اداسی بھرا سکون اور پاس کھڑی جدائی کی سرسراتی سسکی پھیل گئی تھی۔

آج بھی اس کے ساتھ لیپ ٹاپ تھا۔ کچھ وقت بعد ہم ایک دوسرے کے پیچھے نیچے اترے تھے۔

اتنی جلدی وہاں ملازمین اور ہم دونوں ہی جاگتے تھے لیکن چھت سے آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی اور میں جاگنگ رننگ کے لیے باہر چلا جاتا تھا۔ واپس آتا، تب تک چند بزرگ ناشتے کی میز پر موجود ہوتے تھے۔ میں نہانے کے بعد بھائی کے ساتھ ہی ہال میں آتا تھا لیکن آج بھوک کا احساس تھا جو میں کمرے میں جانے سے پہلے میز پر آ گیا۔ اپنے لیے کافی نکالی اور ڈونٹ لیے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے یونہی نظریں گھمائیں اور سنبھل گیا۔ لمبی سی میز کے آخری سرے پر وہ بیٹھی تھی۔ نظریں کتاب پر تھیں اور ناشتہ بھی ہو رہا تھا۔ بھوک کے باوجود میری رفتار کم ہو گئی۔

"پہلے کھا لو۔" ایک آنٹی نے پیچھے سے اس کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کتاب کہاں بھاگ رہی ہے۔" اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"کتاب کے ساتھ یہ بدمزہ چائے حلق کے نیچے اتر جاتی ہے آنٹی، بالکل بھی اچھی چائے نہیں بناتے یہ۔ سوری۔ لیکن یہ سچ ہے۔" میز پر سینڈوچ کی ٹرے رکھ رہے بیرے کو دیکھ کر اس نے اس حق گوئی کے لیے معذرت بھی کر لی۔

"شادی کے گھر میں کون کتابیں پڑھتا ہے؟" اس جملے میں مقابل کو شرمندہ کرنے کا طنز تھا۔

"میں۔"

اس نے اطمینان سے جواب دیا اور چائے کا آخری گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر کھڑی ہوگئی۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"سینڈوچ اچھے بناتے ہیں آپ۔" کرسی سے اٹھ کر اس نے آگے جا کر ٹرے سے ایک سینڈوچ اٹھایا۔ ہوتق بنا بیرا اس بار جھینپتے ہوئے مسکرایا۔

"شادی کے گھر والے کمرے میں جا کر پڑھتی ہوں آنٹی! شاید یہ کچھ کم اَن ٹینسیو ہو۔" وہ عام سے لہجے میں کہتی سینڈوچ اور کتاب لیے چلی گئی۔

"جانے کس پر گئی ہے۔" وہ آنٹی تاسف سے کہتی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"چائے دو ذرا۔" انہوں نے بیرے کو حکم دیا۔ "ویسے کہہ تو ٹھیک رہی تھی، چائے تم لوگ اچھی نہیں بناتے ہو۔"

اب میرا دل بھی بدمزہ چائے چکھنے کو مچلنے لگا تھا جو یہاں میں نے آج تک نہیں پی تھی۔

☆☆☆

آج نکاح کا دن تھا۔ پھوپو کی آج رات ہی واپسی تھی۔ ہماری فلائٹ اگلے دن کی تھی۔ جس کے لیے ہمیں علی الصبح یہاں سے نکلنا تھا۔ کل صبح میرا یہاں چھت پر آنا مشکل تھا۔ اس کا بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کب جانے والی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اسے چھت پر اپنا آخری چکر سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس سے بات کر کے خود کو متعارف کروانا چاہیے یا نہیں، میں مسلسل سوچ رہا تھا لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

وہ آئی تو قدم سست تھے۔ آج اس نے روز کی طرح بھاگتے ہوئے زینے نہیں چڑھے تھے۔ چہرہ بھی مضمحل تھا۔ آج وہ آگے دیوار کے پاس جانے کے بجائے کرسی پر ہی بیٹھ گئی۔

جیب سے فون نکال اور سامنے دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"سیونتھ آف اگست فورٹین، فائیو تھرٹی فور، حویلی آغا خان۔"

آج آواز میں روز والا جوش نہیں تھا۔

"ابھی سورج طلوع نہیں ہوا ہے اور میں رات میں مما سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے آج بھی یہاں موجود ہوں۔ کل دوپہر سے فیور نے پکڑ لیا ہے اور مما کے نزدیک یہ میرے صبح صبح کرے سے غائب ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان کے مطابق میں اتنی ٹھنڈ میں لان میں واک کرتی ہوں، اس لیے بیمار ہو گئی ہوں۔ وہ صبح جاگتیں تو انہیں پتا ہوتا کہ اس وقت ٹھنڈ نہیں ہوتی بلکہ موسم بہت ہی خوش گوار اور خوب صورت ہوتا ہے اور میں روز لان میں نہیں اس چھوٹی ٹیرس پر ہوتی ہوں۔ ویسے حویلی ڈیزائن کرنے والے نے اس کا فرنٹ اس سمت کیوں نہیں رکھا؟ آگے کا سبز میدان اور پھر اس کے آگے کا جنگل بھی ٹھیک ہے لیکن ان پہاڑوں کا حسن۔ یہ کوئی اور ہی لیول ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ پہاڑ بعد میں یہاں آ کر ٹھہرے ہوں، جانے کیا لاجک اور وجہ تھی جو انہیں پیچھے کر دیا۔"

اس کے بولنے کی رفتار بھی دھیمی تھی۔

"کل واپس جانا ہے پھر وہی بھاگتی دوڑتی زندگی، گاڑیوں کا شور، لوگوں کی باتیں اور۔" اس نے اور کو لمبا کھینچا۔

"کالج آفس میں نے زونا سے کہا تم سب کی بات ہر اتراتے ہو ویسے، مجھ سے زیادہ یہاں کوئی نہیں پڑھتا تو اس نے کہا۔ دنیا میں اہمیت ڈگری ہے، علم کی نہیں، تو کیا واقعی ایسا ہی ہے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

"آج میں اس جگہ کو اور یہاں کی دل کشی کو سنوں گی، اسے محسوس کروں گی، جانے پھر کب آنا ہو یہاں۔ کل ہی نانی کہہ رہی تھیں۔ اتنی لمبی شادی نے تھکا دیا ہے تو کیا پتا اب کوئی ایسے ایڈونچر کا سوچے گا بھی یا نہیں کہ دور دور تک اس طرح کی یہ پہلی شادی تھی دونوں خاندانوں میں۔ شادی اور فنکشنز تو نہیں لیکن میں نے اس وقت کو خوب انجوائے کیا، اچھی یادیں اکٹھا کیں، ڈیجیٹل ڈائری اسٹارٹ کی۔ حویلی آغا جان کو، اس چھت کو، وہ دور بہت دور کھڑے ان پہاڑوں کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ مجھے ان پہاڑوں سے عشق ہو گیا ہے، ان کے بارے گزرے زمانوں کی ڈھیروں کہانیاں لکھی ہیں جو ابھی ساری نہیں پڑھ پائی، انہوں نے بھی ساری نہیں سنا کیں۔" اس نے کہتے ہوئے منہ بسورا تھا۔

"سوچ رہا ہوں تو ابھی پڑھنے اور سننے ضرور آؤں گی کہ مجھے کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔"

ذرا دیر بعد اس نے ریکارڈنگ بند کر کے فون میز پر رکھ دیا۔ میری نظریں آج سامنے پہاڑ اور آسمان کے بجائے اس کے ارد گرد زیادہ تھیں۔

جانے کتنی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ذرا دیر آگے دیوار کے پاس رکی پھر پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ادھر جاتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تھا۔ وہ اکثر جاتے ہوئے اوپر دیکھا کرتی تھی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ سیڑھیوں پر غائب ہو گئی اور میں اب تک ملوں یا نہیں اس مخمصے میں ہی تھا۔

☆☆☆

نکاح کے وقت بھی شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ہی نظر آئی تھی۔ میں نے دور سے ہی زوم کر کر کے چند تصویریں لی تھیں۔ چوں کہ آج ڈیڈی بھی موجود تھے تو وہ مجھے اپنے ساتھ رہنے کا حکم دے چکے تھے۔ میرا سارا وقت ڈیڈی کے بزنس سرکل اور دوستوں سے ملتے ہوئے گزرا۔

اگلی صبح جاتے وقت میں نے بہانے بہانے سے چار چکر اندر کے لگائے تھے پھر بھی نامراد ہی رہا۔ وہ نہیں دکھائی نہیں دی۔ ممی، ڈیڈی اور بھائی کو اب نکلنے کی جلدی تھی۔ دہرادون ایئرپورٹ یہاں سے سات گھنٹے کا سفر تھا اور ہم پہلے ہی دیر کر چکے تھے۔ ان کے مطابق اب اگر تھوڑا سا اور لیٹ ہوتے تو آگے ہماری فلائٹ چھوٹ سکتی تھی۔ چاروناچار مجھے کار میں بیٹھنا پڑا۔ میں نے حویلی نظروں سے اوجھل ہونے تک جاتے کتنی بار پلٹ کر دیکھا تھا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر میں نے یہ انوکھی اور دلچسپ داستان لکھنا شروع کی۔ وہ چھ دن میرے لیے ایک طویل داستان جیسے تھے۔ میرا یہ انوکھا تجربہ لیپ ٹاپ میں میرے لفظوں میں منتقل ہوتے وقت ہر دن مجھ پر کچھ نیا واضح کرتا تھا۔

میرے پاس اس کی سنی باتیں ہی نہیں تھیں، اس کا فاصلے سے کیا گیا مشاہدہ بھی تھا۔ میری دلچسپی اس میں بڑھتی جا رہی تھی۔ میری زندگی میں اتنی اہم اور خاص جگہ اس سے قبل کسی لڑکی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آسان نہیں تھا پھر بھی محدود معلومات کے سہارے میں نے دانیال کو فون کر کے شانو کے متعلق پوچھا۔ وہ کسی شانو کو نہیں جانتے تھے۔

"آپ کی کسی کزن یا فیملی فرینڈ میں کسی کا نک نیم ہو گا؟"

"اونہوں۔ کسی کا نہیں ہے۔"

"بھابھی سے پوچھیں، شاید ان کی فیملی میں ہو یا انہیں علم ہو۔"

لیکن وہ بھی کسی شانو کو نہیں جانتی تھیں۔

اور چوری چھپے بنا اجازت کھینچی گئی تصویر دکھا کر پوچھنا سراسر غلط تھا۔ اس وقت بھی میں شیور نہیں تھا کہ اس کی خیر خبر مل گئی تو میں اس سے ملوں گا یا نہیں۔ میرے اس شش و پنج نے ہی ہمیں اجنبی رکھا تھا ورنہ میں کسی بھی پل اس کے پاس جا کر بات کر سکتا تھا۔ وہاں وہ میرے لیے 'دوری میں دلکشی' والا معاملہ تھی۔

اس کی باتیں اور ان پر اپنا تجزیہ اور نظریہ لکھتے وقت کوئی ارادہ تھا نہ دور دور تک ایسا کوئی گمان تھا لیکن کئی دن تک لکھتے ہوئے ایک دن اچانک دھیان کے دریچے پر اپنے پر پھڑپھڑاتا خیال کا پرندہ آن بیٹھا اور میں لیپ ٹاپ یونہی چھوڑ کے ڈیڈی کے پاس دوڑا۔

میرے مطالعے کا شوق دراصل ان کے جینز ہی تھے جو میرے حصے میں آئے تھے۔ وہ ادب کا ذوق شوق رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اردو فارسی پڑھ رکھی تھی۔ وہ اب بھی روزی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کا فارسی کلام پڑھتے تھے۔ انہوں نے بچپن میں قرآن اور عربی سے ساتھ ساتھ ہم دونوں بھائیوں کی اردو تعلیم کا بھی بندوبست کیا تھا جس کے نتائج مختلف تھے۔ اب حال یہ تھا کہ بھائی حروف تہجی بھی نہیں پہچان سکتے تھے اور میں روانی سے پڑھ اور سمجھ لیتا تھا، لکھنا مشکل تھا۔

پتا نہیں یہ میرے اس کے لیے جذبات تھے، اس کے لیے کچھ کرنے کی خواہش، کوئی بہت گہرا احساس جسے میں اس وقت مکمل سمجھ نہیں پا رہا تھا یا محض میرا شوق ہے لیکن میں نے ڈیڈی کے سامنے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔

"مجھے خود کو پرکھنے اور آزمانے کے لیے صرف دو سال دیں ڈیڈی! اگر اس دوران میں نے کریئر بنا لیا، کوئی سگنیفکنٹ کامیابی حاصل کر لی تو ٹھیک ورنہ میں سب چھوڑ کر ایمان داری اور سنجیدگی سے بزنس دیکھوں گا۔"

انہوں نے میری بات مان لی اور میں نے 'اے پینڈنگ گڈ بائے' لکھنا شروع کی۔ ہر لفظ کے ساتھ وہ میرا حصہ بنتی گئی۔ ناول کے اختتام تک میں نے اسے خود میں ضم کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا وہ میرا جزو لازم ہے۔ اس کے متعلق لا یا اور دوری کے باوجود میرے اندر بے چینی، بے قراری نہیں تھی میں بہت پرسکون تھا۔

صرف اچھا لکھنا یا بہت اچھا لکھنا کافی نہیں ہوتا ہے لیکن پیسہ اور وسائل ہوں تو بہت کچھ بلکہ سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ میرے پاس ان دونوں کی کمی نہیں تھی۔ میں نے ملک کی صف اول کی لٹریری ایجنسی سے کنسلٹ کیا، ان کا سب سے کامیاب ایجنٹ اور ایڈیٹر منتخب کیا اور جلد ہی 'اے پینڈنگ گڈ بائے' کا معاہدہ ایک بین الاقوامی اشاعتی ادارے کی مقامی شاخ کے ساتھ طے ہو گیا۔

میں نے ایمان داری سے محنت اور کوشش کی تھی پھر بھی ناول کو جتنی کامیابی اور پذیرائی ملی اس کا میں نے تصور نہیں کیا۔ یہ سب خواب جیسا تھا۔ ممی، ڈیڈی، بھائی سب خوش تھے۔ یہ ان کے لیے بھی سرپرائز تھا۔ ڈیڈی کو میرے اس فیصلے پر بہت فخر تھا۔ ان کی خوشی ممی اور بھائی سے مختلف تھی۔ ان کی شہرت اور بھرا بزنس میں اپنا افسر شپ کا بھی کمال تھا کہ میں ہر جگہ نظر آنے لگا۔

اس دور میں مارکیٹنگ، پبلسٹی اور ... کامیابی کی سب سے اہم کنجی ہے۔ ان کے سبب سطحی اور اوسط درجے کی چیزیں بھی ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کر لیتی ہیں پھر میرا ناول تو اوسط درجے سے بہتر تھا۔ اس میں ہر حساس دل کے تار چھیڑنے والی کہانی تھی۔ دوسرے مارکیٹنگ والوں نے ٹارگٹ ریڈرز کو خوب اچھی طرح ٹارگٹ کر کے گھیرا تھا۔ جب ایک پڑھنے والا دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے کہتا ہے تو یہ سب سے اچھی پبلسٹی ہوتی ہے۔ ناول کو اس کا بہت فائدہ ہوا تھا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ اسے مقبول و مشہور کر دوں۔

لمحوں میں ہوا یہ فیصلہ اب میرا شوق اور پیشہ بن گیا تھا کہ مجھے کہانی لکھنا اچھا لگنے لگا تھا۔ میری چھپی ہوئی صلاحیت کھل کر باہر آئی تھی۔ مگر اس کے بعد میں نے پھر رومان نہیں لکھا۔ میں نے سسپنس، تھرلر ناول لکھے۔ انہیں بھی اتنی ہی پذیرائی ملی۔ اب میں فل ٹائم رائٹر تھا۔ میری ساری کتابیں بیسٹ سیلر لسٹ میں شامل تھیں۔ ان پر ویب سیریز بن رہی تھیں۔ پہلے ناول کے کچھ وقت بعد جب ایک پروڈکشن ہاؤس نے 'اے پینڈنگ گڈ بائے' کے رائٹس حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیا تو میں نے فوراً ہامی بھر لی۔

اگلے زمانے یاد رکھیں، سنیں سنائیں والی شق بھی مکمل ہو گئی تھی۔ میں نے پھر بھی اس کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مجھے یقین تھا ہم ملیں گے اور مجھے یہ انتظار بھی ناگوار نہیں گزرتا تھا۔

محبت کرتے رہنے کا احساس اچھا دوست ثابت ہوا تھا۔ ایسا دوست جس کی ہمراہی خوشی کی ضمانت تھی۔ کبھی مایوس اور افسردہ نہیں ہونے

انتظار ایک ایسی مشقت تھی جو روح کو تر و تازہ رکھتی تھی۔

میں نے اس کے لیے 'اے پینڈنگ گڈ بائے' کی صورت میں ساری دنیا میں اس کے لیے 'بریڈ کرمز' کی طرح مجھ تک پہنچنے والے نشان پھیلا رکھے تھے۔ ان کا پیچھا کرتے ہوئے اسے میرے پاس آنا ہی تھا۔ میں نے دانیال کے گھر ناول کی کئی کاپیاں بھجوائی تھیں تاکہ وہ جان پہچان اور خاندان والوں کو بانٹ سکے۔

☆☆☆

اگلے دن جب اطیب نے امن سے کہا تو حسب توقع اور حسب عادت حیرت کے اظہار کے لیے وہ چند منٹ چپ اسے گھورتا رہا۔

"اگلی میٹنگ ارینج کر لو کسی قریبی ڈیٹ پر۔" اس نے حتی المقدور لہجہ اور انداز عام سے رکھے تھے۔

"بلکہ کل پرسوں ہی رکھ لو۔" وہ اسے 'آج ہی' بلا لو کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"فیلیٹ ہے بھئی اس لیڈی میں۔" اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"واقعی۔" اس نے کہا۔

"ترجمہ ویسا ہی ہے جیسا مجھے امید تھی کہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

امن نے اسے جانچتی نظروں سے گھورا تھا۔

قریبی تاریخ اسے ایک دن بعد ملی۔ وہ آگئی لیکن چوں کہ سارے معاملات اور معاہدہ طے ہونا تھا اس لیے اس بار امن بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔

جب اس نے کہا کہ وہ پہلے ہی پورے ناول کا ترجمہ کر چکی ہے تو امن کے ساتھ وہ بھی حیران رہ گیا۔

"مائنڈ نہ کیجیے گا لیکن آپ کافی سے زیادہ ایفیشنٹ ہیں۔" امن نے کہا۔

"اور بہت کانفیڈنٹ بھی۔"

اس کی نظر اطیب پر تھی، وہ مسکرائی۔

"دراصل بطور اردو ٹرانسلیٹر یہ میرا پہلا پروجیکٹ ہے اس لیے میں نے بہت ریسرچ کے بعد یہ ناول منتخب کیا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں اردو ناولز کی مارکیٹ اتنی بڑی نہیں ہے جتنا انگلش ہندی یا دیگر لینگویجز کی ہے، اس ترجمے کا جتنا امپیکٹ ہو گا، میرا کریئر اتنا بہتر ہو گا، اس لیے میں نے محنت بھی بہت کی ہے۔ میں نے فائل آپ دونوں کو ای میل کی ہے۔ کوئی مسئلہ یا بات ہو تو ہم پھر ملیں گے۔"

اس کا پیشہ ورانہ انداز بڑا اچھا تھا۔ وہی چشمہ، وہی کپل، وہی بیگ، بال اسی انداز میں بندھے تھے، بس آج ہاتھ ململ سیاہ آستینوں میں چھپے تھے اور بنگالی کاٹن کی سیاہ ساری زیب تن کیے تھی جس پر چوڑا سا بارڈر سرخ تھا۔

آج اطیب خاموشی سے اسے جانچتا ہی رہا تھا۔ اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی اور امن اس کی جانچتی نظروں کو جانچ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ اس کا ترجمہ یوں پڑھ رہا تھا جیسے وہ سامنے بیٹھ کر اسے سنا رہی ہو۔ اس نے ناول کے نام کا ترجمہ 'ادھوری رخصت' کیا تھا۔

"انہوں نے آج بھی ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا اور شین پلٹ کر چلی گئی۔ محبت کی یہ داستان کرداروں کی گفتگو کے بنا ہی مکمل ہو گئی تھی۔ الف اور شین نے محبت کو نئے معنی دیے تھے جہاں احساس اور یقین کو اولیت حاصل تھی، باقی سب ثانوی تھا اور وہ ضروری بھی نہیں تھا۔ ان کے لیے ساتھ بھی احساس تھا قربت بھی اور لمس بھی۔ وہ بچھڑ رہے تھے لیکن ایک دوسرے کو رخصت نہیں کیا تھا۔ انہوں نے وداع کو التوا میں ڈالا تھا، جانے کب تک کے لیے یا شاید ہمیشہ کے لیے۔ الوداع کے بعد سب ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد راستے الگ ہوتے ہیں اور سفر بھی۔"

انہوں نے اپنے آخری باب میں راستے کھلے اور سفر جاری رکھنے کے امکانات رکھے تھے، رخصت کو کسی اور وقت پر ٹال کر اسے اختتام نہیں بننے دیا

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھا۔

الف اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی لیکن اس کا سینہ احساسات سے معمور ہو رہا تھا۔

محبت مکمل تھی، کہانی جاری تھی اور کردار اکیلے نہیں ادھورے تھے کہ وہ مکمل ہو جاتے تو کہانی ختم ہو جاتی، انھیں یہ ادھورا پن وصل سے زیادہ عزیز تھا کہ ان کی کہانی غیر معمولی تھی، یہ وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوتا تھی، یہ جاری تھی۔

☆☆☆

اس نے ترجمے کو ہری جھنڈی دے دی تھی۔ اس نے کچھ معمولی تبدیلیوں اور اصلاح کی نشاندہی کی تھی۔ اسے ایک ہفتے کے لیے لٹریری فیسٹیول میں شرکت کرنا تھی۔ جانے سے پہلے اس نے کئی دفعہ فون میں اس کا نمبر نکالا جو امن سے لیا تھا لیکن کال نہیں کر سکا۔ اس نے کچھ سوچ رکھا تھا اور اب وہ جلد سے جلد یہ ترجمہ ہاتھ میں چاہتا تھا۔

لٹریری فیسٹیول میں شرکت کر کے ہفتہ بھر بعد وہ شام میں دفتر والے کمرے میں آیا تو میز پر 'ادھوری رخصت' کا فائنل ڈرافٹ رکھا تھا، جسے اب پرنٹ میں جانا تھا۔

"مس شاہین سعید آئی تھیں صبح، وہ دے گئی ہیں۔" امن نے کہا۔

وہ آج شام کا انتظار کر رہا تھا کہ اس سے ملنا ہے اور وہ آ کر چلی بھی گئی تھی۔ اس نے فائل کھولی۔ وہاں گلابی کاغذ رکھا تھا۔ اس نے کھولا۔

اطیب

مجھے میری 'ذاتی فیری ٹیل' دینے کے لیے بہت شکریہ۔

شاہین

"ہا۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ گویا اسے سب یاد تھا، وہ کچھ بھولی نہیں تھی، اس نے اپنی کہانی پہچان لی تھی اور اب اس طرح خود لکھی تھی۔" اس نے ڈرافٹ کو دیکھا اور اچانک اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"یہ نوٹ کیوں چھوڑا؟" اس نے جھپٹ کے فون اٹھایا اور اسے کال لگائی۔

"کیا ہوا؟" امن نے تعجب سے اسے دیکھا۔

نمبر بند تھا۔

"ایجنسی سے شاہین کا ایڈریس اور نمبر لو۔"

"شاہین۔؟" اس بے تکلفی پر اس نے ابرو چڑھائے۔

"وہ 'اے پینڈنگ گڈ بائے' کی شین ہے۔" وہ مشکوک تو تھا اور اب جانے بنا پوچھا بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کی بات سن کر اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

"سو پلیز جلدی کرو۔" اطیب نے فون کی طرف اشارہ کیا۔

ایجنسی نے یہ دھماکا کیا کہ وہ ہفتہ بھر پہلے ہی فائنل ڈرافٹ دے کر ریزائن کر چکی تھی۔ اطیب نے دانیال کو فون لگایا اب اس کے پاس پورا نام تھا۔

اطیب نے فون رکھ کے سامنے دھرے ڈرافٹ کے پہلے صفحے کو گھورا جس پر نمایاں الفاظ میں 'ادھوری رخصت' لکھا تھا۔

☆☆☆

روتے دھوتے میں نے فائنل امتحان دے دیا تھا اور آج مجھے ہر دو مہینے میں ایک بار پڑنے والا کمرے کی صفائی کا دورہ پڑا تھا۔ میں پوری تن دہی سے وارڈ روب، بک شیلف، میز اور درازوں سے سب کچھ باہر نکال چکی تھی بلکہ ان میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کپڑے دوبارہ سلیقے سے رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا اب ایک سال تک نیا جوڑا نہیں خریدوں گی پھر یاد آیا پچھلے صفائی کے دورے میں بھی ایسا ہی کچھ طے کیا تھا اور چار جوڑے تو سامنے پڑے تھے پہننے کے انتظار میں۔ تھک کے میں نے روحی کو آواز دی اور اسے الماری سونپ کے خود کتابوں کی سمت متوجہ ہو گئی۔ میں نے بک شیلف کے دو خانے جمائے تب تک روحی پورا وارڈ روب سیٹ کر چکی تھی۔

"اور کچھ ہیلپ کروں باجی؟" اس نے

پوچھا۔

"ہم، تھوڑے سے فرائز تل دو۔" میں نے مصروفیت کے درمیان کہا۔ وہ چلی گئی۔

بک شیلف کے بعد میں میز کی طرف آئی تو شام ہو چکی تھی۔ اس دوران فرائز بھی تین بار ختم ہو گئے تھے۔ میں نے نماز کے لیے بریک لیا اور دوبارہ لگ گئی۔

میرے پاس ایسی بہت سی کتابیں جمع تھیں جو سالوں سے اپنی باری کے انتظار میں تھیں۔ کئی بار ایسا ہوتا تھا میں نیا ناول لاتی اور اسی دن پڑھنا شروع کر دیتی اور کبھی ناول لا کر بھول جاتی تھی۔ کچھ کتابیں وہ تھیں جو مجھے تحفتاً ملی تھیں اور کافی وہ جو گھر میں دوسروں کو ملی تھیں اور انہوں نے اٹھا مجھے پکڑا دی تھیں۔

پڑھے جا چکے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے ناولز الگ کرتے ہوئے میرے ہاتھ 'اے پینڈنگ گڈ بائے' لگا۔ مجھے یاد آیا یہ شاید ایک سال پرانا ناول بہت مقبول ہوا تھا مگر میں نے ابھی تک پڑھا نہیں تھا۔ میں نئے رائٹرز یا آج کل پبلش ہونے والی چیزیں کم ہی پڑھتی تھی۔ میرے وارد ہونے سے پہلے دنیا میں اتنا سارا اور اتنا اچھا لکھا جا چکا تھا کہ مجھے وہ مکمل کرنے کے لیے ہی یہ زندگی کم لگتی تھی۔

میں نے ناول ہاتھ میں لے کر جائزہ لیا۔ ایک پرانی سی عمارت کے سامنے ایک دوسرے کی طرف پشت کیے دو سائے تھے جن کے ایک ایک ہاتھ پیچھے کی سمت ایک دوسرے کی طرف تھے۔

"نام تو انٹرسٹنگ ہے۔" میں نے پہلا صفحہ کھولا۔ انگریزی میں انتساب لکھا تھا۔

"اس لڑکی کے نام جسے اپنی ذاتی فیری ٹیل چاہیے تھی۔"

میں نے جھٹ پلٹ کر پھر سرورق دیکھا اور ناول نگار کا نام پڑھا۔

"اطیب حیدر۔ یہ کون ہے؟" میں نے انتساب دوبارہ پڑھا۔

"کیا یہ اتفاق ہے؟" مجھے یاد نہیں تھا، یہ میں نے خریدی تھی، کسی نے دی تھی یا گھر میں کسی اور نے مجھ تک پہنچائی تھی۔

"ویسے دو لوگ ایک جیسا سوچیں یہ ممکن تو نہیں ہے۔" میں بار بار وہ ایک سطر پڑھ رہی تھی۔

"یہ کیا مسٹری ہے؟ یہ بھی یا میں نے آج کچھ زیادہ کام کر لیا ہے یا امتحان ختم ہونے کی خوشی میں دیوانی ہو گئی ہوں۔"

میں نے پہلا صفحہ پڑھا، یہ اتفاق نہیں تھا۔ میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ مقفل کیا، لائٹ بند کر کے ٹیبل لیمپ جلایا، اسے میز سے اٹھا کر تکیے کے قریب رکھا اور اپنی زندگی کے اس معجزے میں کھو گئی۔

جب میں نے آخری صفحہ ختم کیا تو صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ ان چند گھنٹوں میں میرے جذبات سارا وقت رولر کوسٹر پر تھے۔ میں روئی، ہنسی، مسکرائی، حیران ہوئی، بے قرار ہوئی، اترائی بھی اور اب ہکا بکا کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

کوئی شک نہیں تھا کہ شین الف کی کہانی کی شین میں ہی تھی لیکن الف کون تھا، اطیب کون تھا۔؟ میں نے حویلی آغا جان کے اپنے قیام کو ذہن میں دہرایا لیکن مجھے ایسا کوئی شخص یاد نہیں آیا۔ اس نے مجھے کہاں سے سنا۔؟ اسی چھت پر؟

نہیں وہاں چھپنے کی جگہ تھی نہ گنجائش، کیا نیچے اس کا کمرہ تھا، اس کی کھڑکی تھی یا اوپر والی چھت۔ لیکن وہاں تو کوئی نہیں جاتا تھا۔ بات صرف سننے کی تو نہیں تھی۔ میں نے بند کتاب پر ہاتھ پھیرا۔

دانیال بھائی کی شادی کو بھی اب دو سال ہو گئے تھے۔ کتاب کی اشاعت ستمبر دو ہزار پندرہ کی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ آن کر کے اطیب حیدر کو سرچ کرنا شروع کیا اور پہلے اس کی تصویر دیکھی۔ اچھا خاصا ہینڈسم اور پرکشش بندہ تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے آج سے پہلے اس شخص کو کبھی دیکھا تھا۔ ابھی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس کا وکی پیڈیا پیج ہی پڑھ رہی تھی کہ مجھے اپنی ڈیجیٹل ڈائری کا خیال آیا۔

حویلی آنا جانا ان سے آنے کے بعد میں اسے جاری نہیں رکھ سکی تھی لیکن وہ ریکارڈنگ اب بھی ایک فولڈر میں محفوظ تھی۔ میں نے اطیب حیدر کی سرچ روکی اور اپنی ریکارڈنگ سننے لگی۔ اب میں جانتی تھی کہ کہیں کوئی اور بھی اس وقت میری باتیں سن رہا تھا۔ میں وہاں اکیلی نہیں تھی اور عجیب تھا کہ مجھے یہ برا نہیں اچھا لگ رہا تھا۔ جانے کب سنتے سنتے میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں سو کر اٹھی تو کمرہ ویسا ہی تھا۔ کتابیں اب بھی میرے آس پاس بکھری تھیں اور میں کتابوں کا تکیہ بنائے سو گئی تھی لیپ ٹاپ کھلا تھا، میرے ایرفون قریب پڑے تھے اور سینے پر "اے پینڈنگ گڈ بائے" تھی۔ سب سمیٹنے اور جگہ پر رکھنے کے بجائے میں دوبارہ ناول پڑھنے لگی تھی۔ اب میں گاہے گاہے اس کی تصویر بھی دیکھتی جا رہی تھی۔

یہ کہانی دو کرداروں کی تھی الف اور شین، جن کی پوری کہانی میں روبرو ملاقات آخر میں ہوئی تھی۔ الف نے شین کو کچھ غیر معمولی حالات میں دیکھا، پیچھا کیا، اسے سنا، سمجھا، پسند کیا اور وہ اس کے لیے خاص ہو گئی اور پھر اس نے اس کے لیے وہ کیا جو ہرگز عام نہ تھا۔ وہ اس کے لیے اجنبی ہی تھی۔ کیونکہ انہوں نے ایک دوسرے سے بات کی تھی نہ وہ ملے تھے پھر بھی وہ اس کی زندگی کا محور بن گئی۔

الف نے اس کی خواہش پوری کرنے کی ٹھان لی۔ یہ اس کے لیے آسان نہ تھا، اس نے اسے اپنا جنون بنایا اور اس کا خواب پورا کیا۔ شین لمبے عرصے تک بے خبر ہی رہی کہ اس کی خواہش، اس کا خواب کوئی اور تکمیل تک پہنچا چکا ہے۔

پھر بالآخر ایک دن اسے علم ہوا کہ اس کا خواب کسی نے مکمل کر دیا ہے لیکن وہ کون ہے کہاں ہے شین نہیں جانتی تھی۔ اس نے بہت تلاش کیا اور ایک دن وہ انجانے میں اس تک پہنچ گئی۔ الف جس نے ملنا نہ ملنا قسمت پر چھوڑ دیا تھا، جب قسمت نے انہیں ملایا تو اس نے شین کو اپنی اصلیت بتائے بنا اجنبیوں کی طرح رخصت ہونے کو چنا کہ وہ چاہتا تھا اس کہانی کا اختتام نہ ہو۔ دونوں کی تلاش ختم ہو نہ انتظار، وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی طرف سفر کرتے رہیں۔

میں درمیان میں لیپ ٹاپ پر ناول اور اطیب حیدر کے متعلق خبریں اور انٹرویو دیکھنے لگتی، کبھی ناول پر تبصرے اور تنقیدیں تو کبھی اپنی ریکارڈنگ سنتی اور ناول میں وہی الفاظ دیکھ کر نئے سرے سے دنگ رہ جاتی۔

جب دو دن تک کمرے سے باہر نہیں نکلی تو گھر والے پریشان ہو گئے۔ مما نے کمرے کا حال دیکھا تو ایک بڑا سا لیکچر ملا لیکن میں کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ اتنا سب کچھ تھا کہ پہلے کیا سوچوں، کس پر غور کروں، کیا کروں کیا نہ کروں، کیا پہلے کروں کیا بعد میں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کبھی لگتا کوئی خواب دیکھ رہی ہوں، کبھی لگتا میں پاگل ہونے لگی ہوں۔

میں روز وہ ناول ہاتھ میں لیے سوچتی رہتی اور اتنے دنوں میں شاید ہی ایسا کوئی نکتہ یا زاویہ بچا تھا جس پر میں نے نہ سوچا ہو۔ میں ہر دن ایک نئے خیال سے الجھتی رہتی۔

ناول، ریکارڈنگ اور اطیب حیدر کے انٹرویو بار بار پڑھنے سننے اور دیکھنے کے بعد آہستہ آہستہ مجھ پر سب کچھ واضح ہونے لگا۔

پہلی نظر کی محبت یا چند دنوں میں عشق ہو جانا ایسا انوکھا بھی نہیں تھا۔ انوکھا تھا میری خواہش کا پورا کرنا۔ اس کی فیملی، تعلیم، بزنس کے مطابق اس کا یہ منصوبہ تو نہیں ہوگا کہ سب چھوڑ کر وہ ناول لکھے گا۔

کبھی لگتا کہ اسے ناول ہی لکھنا تھا اور میری وجہ سے کہانی مل گئی۔ پھر خیال آتا، نہ کال نہ ملاقات، کیا وہ جانتا بھی ہے، میں کون ہوں کہاں رہتی ہوں، اگر اسے یہ سب معلوم ہوتا تو مجھ سے ملنے ضرور آتا یا ناول ہی بھیج دیتا۔ وہ مجھے نہیں جانتا تھا لیکن اب میں تو اسے جان گئی تھی۔ اس کا ایڈریس بھی جانتی تھی۔ کئی بار میرا دل کیا میں اس کے گھر چلی جاؤں۔ یہ مشکل نہیں تھا لیکن پھر ہمت نہیں ہوئی۔

ناول کا اختتام اور تھیم وہی تھی جو میں نے کہا تھا ادھورا پن عزیز ہوتا ہے۔ بس اسی سطر پر میں اٹک جاتی تھی۔ میں نے ہر ایک چیز میں اس کا پیغام دیکھنا چاہا، سرورق، الف کا طریقہ کار، انجام۔ اتنا کافی نہیں تھا کہ میں نے انٹرویوز میں بھی اپنے لیے پیغام ڈی کوڈ کرنے کی کوشش شروع کر دی اور کنفیوز ہوتی گئی۔ وہ بہت اچھا بولتا تھا سحر انگیز آواز میں، اس پر اس کا پراعتماد اور باوقار انداز! جب کیمرہ اس کے چہرے پر فوکس ہوتا تو مجھے لگتا وہ مجھ سے مخاطب ہے۔

جیسے کسی انٹرویو میں اختتام کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔

"یہ سیڈ اینڈنگ تو نہیں ہے، انٹرپریٹیشن کے لیے اوپن ہے، ریڈر جیسا چاہے ویسا اینڈ اخذ کر سکتے ہیں۔"

کبھی کہا: "اس کہانی کا مرکزی کردار ایک منفرد سا احساس ہے، آپ اسے جو چاہے نام دیں۔"

کبھی سمجھاتا کہ "شین اور الف ہر کسی کے اندر ہوتے ہیں لیکن سب کے اندر شین الف اتنی جرأت اور یقین نہیں رکھتے کہ وہ انتظار اور تلاش کریں۔"

اور یہ بھی کہ

"ضروری نہیں مل جانا، حاصل کر لینا، پا لینا سب کی چاہت ہو، کچھ دل روش سے ہٹ کر چلتے ہیں۔"

میری خواہش فیری ٹیل تھی جو دنیا کہے سنے اور وہ مجھے مل گئی تھی اب مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا یہاں کوئی بھی کسی کی بھی خواہش یوں پوری کر دیتا ہے؟ کتنا نایاب یہ تو بہت خاص تھا۔ مجھے بھی کچھ خاص کرنا تھا۔ میں نے لاکھ چاہا لیکن میں یوں اس حالت میں اس کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں کر سکی۔

پھر ایک دن اس کا انٹرویو دیکھتے دیکھتے مجھے اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے۔

"آپ کی سب کتابوں کے تراجم ہو چکے ہیں، نیا ناول دوسری زبان میں ترجمے کے ساتھ ہی ریلیز ہو رہا ہے لیکن آپ نے اب تک 'اے پینڈنگ گڈ بائے' کا ترجمہ کیوں نہیں کیا؟"

"یہ میرا پہلا ناول تھا، میرے لیے بہت خاص اور میرے دل کے بہت قریب ہے۔ میں نے اسے ایک خاص کیفیت میں لکھا تھا، مجھے نہیں لگتا کوئی اور اس طرح اس سے انصاف کر پائے گا جیسا میں نے لکھا ہے، یہ ہے تو گھسی پٹی بات لیکن سچ ہے۔ الفاظ اہم نہیں ہوتے، اہم وہ بات ہے جو ان کے ذریعے کہی جا رہی ہے، عبارت میں پراثر احساس اور کیفیت اسی وقت شامل ہوتے ہیں جب یہ دل کی گہرائی سے خود بخود نکلے ہوں، بنا کسی کوشش کے جب کہ ترجمے میں شعوری کوشش شامل ہوتی ہے اور الفاظ بے ساختہ نہیں ہوتے، اصل لفظ سے قریب قریب تلاش کیے جاتے ہیں۔"

میں نے فیصلہ کیا اور مما کے پاس پہنچی۔

"مجھے آگے پڑھنا ہے۔"

"ہیں؟"

"مجھے ماسٹرز کرنا ہے، اس سے پہلے مجھے اردو سیکھنا ہے۔"

"تم نے گر پڑ کے بڑی مشکل سے تو یہ تین سال نکالے ہیں اب۔"

"مما تب میرا کوئی ایم نہیں تھا۔"

"اب ہے؟" ان سے اسی ردعمل کی امید تھی مجھے۔

"جی، مجھے لٹریچر فیلڈ یعنی پبلشنگ میں کریئر بنانا ہے۔"

اب کے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میرا شوق دیکھتے ہوئے یہ ایسی اچنبھے والی بات بھی نہیں تھی لیکن وہ رزلٹ کے بعد میری شادی کا ارادہ کر چکی تھیں۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"ممامیں سیریس ہوں، مذاق نہیں کر رہی۔"

"او کے۔" انہوں نے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں جانتی تھی، وہ چند دن مجھے دیکھیں گی آیا واقعی سنجیدہ ہوں یا نہیں اور انہیں لگا میں یونہی وقت برباد کر رہی ہوں تو وہ میری نئے سرے سے میری شادی کر دیں گی۔ دونوں آپیوں کے پاس شادی کی فرصت نہیں تھی۔ بڑی آپی مما کے ساتھ ہی بوتیک سنبھالتی تھیں اور چھوٹی آپی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈیزائننگ سے فارغ ہونے کے بعد اپنی ڈیزائننگ فرم چلا رہی تھیں اور ایمان سے مجھے نہیں معلوم تھا ان کی فرم کیا ڈیزائن کرتی ہے۔

"تھینک یو۔" ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر میں نے ان کا گال چوما اور کمرے میں آ گئی۔

اردو کا فیصلہ اس لیے کیا کیونکہ میں سوچتی اردو اور انگلش میں تھی۔ یہ دونوں میرے تخیل کی زبان تھیں۔ انگلش میں تو اطیب لکھ چکا تھا تو اب میرے لیے اردو ہی بچی تھی۔ دوسرے انٹرویو کے دوران وہ جب بھی اردو بولتا تھا تو اتنی شستہ اور خوب صورت کہ سننے والا متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا اور مجھے اسے متاثر اور حیران کرنا تھا اس سے اچھی اردو کے ساتھ۔

میں جو اس بات پر نازاں رہتی تھی کہ میری زندگی میں کوئی مقصد نہیں۔ مجھے مقصد مل گیا تھا۔ میں اسے بھی یونہی حیران اور سرپرائز کرنا چاہتی تھی جیسے اس نے مجھے کیا تھا۔

میں نے دل لگا کر اردو سیکھی، اردو اور انگلش میں ماسٹرز کیا اور اس دوران سوشل میڈیا پر اطیب حیدر کا پیچھا کرتی رہی۔ مجھے ان سات سالوں میں ہر دن ایک نئے انداز میں اس سے محبت ہوتی گئی۔ میری زندگی سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے چوبیس گھنٹے اطیب حیدر کے گرد گھومنے لگی تھی۔

میری بے خبری کے دو سالوں میں اس کا نیا ناول شائع ہو گیا تھا اور یہ 'اے پینڈنگ گڈبائے' سے مختلف ایک تھرلر ناول تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں انگلینڈ کی طرف سے شامل ایک ہندوستانی فوجی کی کہانی۔ کہیں رومان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اسے عوام کے ساتھ ساتھ سنجیدہ حلقوں میں بھی بہت داد ملی۔

میں نے ماسٹرز کیا اور اس کے بعد پبلشنگ اور لٹریری فیلڈ میں داخل ہونے کے لیے انگلینڈ سے بہت سارے کورس کیے۔ گھر میں سب اس کایا پلٹ پر حیران تھے۔ میں جو گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی تھی، جس کے لیے کالج جانا جنگ پر جانے جیسا تھا، وہ اکیلے لندن گھوم رہی تھی۔

اطیب حیدر کا تیسرا اور چوتھا ناول بھی شائع ہو گیا۔ اس کی ساری کتابیں بیسٹ سیلرز تھیں۔ پہلے ناول کے علاوہ اس کی کہانیاں رومانی نہیں تھیں۔ اس کے ناول جاسوسی قسم کے تجسس، ایڈونچر اور تھرل سے بھرپور۔ اس سے سوال پوچھا جاتا تھا کہ وہ اب رومانس کیوں نہیں لکھتا اور وہ کہتا تھا۔

"اے پینڈنگ گڈبائے جیسی کہانی زندگی میں ایک بار ہی لکھی جاتی ہے۔ دوبارہ اس قسم کے ناول کی امید مجھ سے نہ رکھیں۔ وہ ایک ہی کہانی تھی اس جیسی دوسری نہیں ہو سکتی۔"

اور میرا دل خوشی سے بھر جاتا۔ میں رونے لگتی۔ میں اس سے پوچھے گئے سوال، اس کے جواب، اس کی باتیں سب کا اردو ترجمہ کرنے لگی تھی۔ میں وہ ہی سب دل میں اردو میں دہراتی اور میری لغت سے دوستی بڑھتی گئی۔

میں جو سوچ چکی تھی کہ اب اس سے بڑا سرپرائز وہ ہی ہو گا جو ایک دن میں اطیب حیدر کو دوں گی، مجھے پہلے والے سے بڑا سرپرائز ملا۔ 'اے پینڈنگ گڈبائے' پر بنی فلم اے فیری ٹیل واقعی امر ہو گئی تھی۔ اس دن میں روتی رہی۔ میرے آنسو رکتے نہیں تھے۔ میں نے اسی ڈر سے وہ فلم نہیں دیکھی کہ کہیں رو رو کر وہاں بھی اپنا تماشا نہ بنا لوں۔

میں اپنی ریکارڈنگ اب اس کے کانوں سے سنتی تھی، ان سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ناول کا کچھ حصہ پڑھا نہ ہو۔ یہ میری اس گفتگو ہوتی تھی، میں ایسے اس سے مل لیا کرتی۔ میرے اندر اب یہ ڈر تھا میں سامنے جا کر اسے مایوس نہ کر دوں، اس کی کہانی خراب نہ ہو جائے۔

میں اب بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ اس محبت کے بدلے مجھے کیسی محبت کرنا چاہیے۔ اسے میرے متعلق کچھ علم نہیں تھا لیکن اس کے پاس میری باتیں تھیں، میرے خواب، خواہشیں، منصوبے تھے جب کہ میں اس کے متعلق سب جان گئی تھی لیکن مجھے اس کے خواب خواہشیں منصوبے کچھ پتا نہ تھے۔

ماسٹرز کے بعد میں نے سوشل میڈیا اور خبروں سے ملی معلومات کے سہارے اس کے پبلشنگ ہاؤس اور لٹریری ایجنسی میں درخواستیں بھیجیں۔ وہاں مجھے فوراً نوکری نہیں ملی مگر اس میدان میں میں دل لگا کر اپنا کام کرتی رہی اور بالآخر ایک دن کام اور نام کے سہارے اس کی ایجنسی 'دوات' تک پہنچ گئی۔

برسوں کی لگن اور محنت کے بعد میں نے اس ناول۔ نہیں اپنی کہانی، اپنی فیری ٹیل کا ترجمہ کر لیا تھا۔ اطیب حیدر ترجمے کے لیے صاف منع کر چکا تھا اس لیے میری باس رادھیکا بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

میں نے فلم کا جواز پیش کیا کہ وہ بھی تو ایک طرح سے مرئی یا تصویری ترجمہ ہی تھا۔

"یہ بات تو ہے۔ فلم اڈاپٹیشن کے لیے اس نے فوراً ہاں کر دی تھی لیکن خود سب سپروائز کیا تھا، پروڈکشن کے ساتھ وہ بھی انوالو تھا۔" اس بات پر وہ بھی قدرے حیران تھی لیکن اطیب حیدر کی مرضی کے آگے مجبور تھی۔

رادھیکا نے میرے اصرار اور کوششوں کے بعد اس سے میری ملاقات طے کر دی۔ وہ بڑی مشکل سے ایک بار مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہوا تھا۔ مجھے بھی ایک ملاقات ہی چاہیے تھی۔ میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھتا گیا جب ادھر سے تواتر سے ملاقات کسی نہ کسی وجہ سے ٹال دی جانے لگی۔ اس لیے میں اس دن وقت سے پہلے اور ادھر سے 'پھر کسی اور دن' والی فون کال سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ میں نے پہلی بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے پوچھا تھا۔

"پہرا چہرہ اسے یاد ہے؟ اتنے سال بعد میں اسے کیسی لگوں گی۔" مجھے تو یقینی طور پر یہ بھی نہیں پتا کہ اس نے کتنے فاصلے سے، کہاں سے مجھے دیکھا ہے، کتنی بار دیکھا ہے۔

دس بارہ جوڑے پہن کر دیکھنے کے بعد میں نے وہ کرتا اور دوپٹا منتخب کیا تھا کہ میں اپنے آپ کو اس میں سب سے اچھی لگی تھی۔ میں نے بہت دعائیں کیں کہ اس کے سامنے میں خود پر قابو رکھ سکوں۔ میں اسے یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں وہی ہوں۔ مجھے بس اس کے چہرے پر وہ تاثر دیکھنا تھا کہ وہاں اردو میں بھی وہ ہی اور ویسا ہی لکھا ہے جو میں نے محسوس کیا تھا، جیسا میں نے سوچا تھا۔ میری ساری تگ و دو اس منظر کے لیے تھی۔

اس کے پبلشنگ ہاؤس کی لابی میں، میں مسلسل خود کو شانت رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ میں نے ہماری ملاقات کا منظر ہزاروں بار تصور کیا تھا اور ہر بار اپنے اور اس کے مختلف تاثرات کو بھی اور جب وہ تصور حقیقت میں ڈھلنے والا تھا تو میرا تخیل ناکارہ ہو گیا تھا وہ ایک بھی متوقع تاثر یا ردعمل سوچ نہیں پا رہا تھا۔

جب منیجر نے مجھے اندر جانے کو کہا تو میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اس لمحے کے لیے اتنی تیاری اور انتظار کیا تھا اور اب وہ سب ہاتھ سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نروس تھی، پرجوش تھی، ڈر بھی رہی تھی، خوشی سنبھل نہیں رہی تھی اور رونا بھی آ رہا تھا۔

"یا اللہ لاج رکھ لینا۔" میں نے دل سے پکارا اور دروازے پر دستک دی۔

"کم اِن پلیز۔" پہلی بار کسی سائنس اور ٹیکنالوجی کے بنا اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میرا ذہن وہ دل میری زندگی میں رونما ہونے جا رہے، پہلے پہلے تاریخی واقعات یادداشت میں درج کرنے کے لیے بے انتہا مستعد تھے۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ دروازے اور اس کی میز کا فاصلہ بھی مجھے ان آٹھ سالوں سے کم نہیں لگا۔ وہ سر جھکائے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہا تھا۔ آواز کے بعد اس کی دوسری چیز سیاہ بالوں سے ڈھکا سر تھا۔ یکایک میری آنکھیں جھلملانے لگیں۔ میں نے عینک کے پیچھے ایک ہاتھ سے انھیں رگڑا اور دوسرے سے ٹیب کو مضبوطی سے تھام کر خود کو سنبھالا۔ دو تین گہری سانسیں لے کر میں نے وہ آٹھ سالوں کا فاصلہ عبور کیا۔ ابھی میز سے ذرا دور تھی کہ اس نے سر اٹھایا۔ ایک نظر کے بعد میں نے فوراً آنکھیں فرش پر لگا دیں۔ اگر دیکھتی رہتی تو یہ بد بخت سارے راز افشاں کر دیتیں۔

"ہیلو سر۔" میز کے پاس پہنچ کر میں نے سر جھکا کر کہا۔ مجھے خود پر بھروسا نہیں تھا کہ میں نے ہیلو اطیب حیدر کہا تو میری آواز اور کیا کچھ کہہ جائے گی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھامنے کا رسک میں نے نہیں لیا تھا۔ میں نے ٹیب کو اس قدر سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ ڈر لگا کہیں چیخ ہی نہ جائے۔ میں پوری کوشش کر رہی تھی کہ عیاں نہ ہوں۔

"میں شاہین سعید 'دوات' کے ساتھ بطور ایڈیٹر اور ٹرانسلیٹر کام کرتی ہوں۔ 'اے چینجنگ گڈ بائے' کے سلسلے میں ملنا چاہتی تھی۔ مجھے پوری امید ہے آپ موقع دیں تو ہمارا کولیبریشن بہت کامیاب ہوگا۔" میں نے لہجہ اور انداز بالکل روایتی اور پروفیشنل رکھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" ادھر سے بھی انگریزی میں پروفیشنل لیکن سنجیدہ جواب ملا اور میں اپنے فارمل انداز پر شرمندہ ہوگئی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں خود سے ذرا سی ناراض تھی۔

"مجھے رادھیکا نے بتایا، آپ اس ناول کا ترجمہ نہیں کروانا چاہتے، اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے مصروف سے انداز میں بیگ گود میں اور ٹیب میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"چوں کہ یہ میرا پہلا ناول تھا، میرے لیے خاص ہے اور مجھے نہیں اعتبار کہ کوئی ترجمہ کرتے ہوئے اس کی روح تک پہنچ پائے گا یا انصاف کر پائے گا اور اس پر فلم بن جانے کے بعد لوگ پڑھنے کے بجائے فلم ہی دیکھیں گے۔" وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور میرا دل چیخ رہا تھا۔ "اس نے تمھیں پہچان لیا ہے۔"

"دوسرا اعتراض تو ہونا نہیں چاہیے۔" میں نے دل کی دہائیاں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"دنیا میں کتنے ہی ناولز ہیں جن پر فلمیں اور سیریز بن چکی ہیں لیکن ان کے نئے ایڈیشنز اب بھی شائع ہوتے ہیں۔ رہی پہلی بات تو یہ تحفظات تو ہر تخلیق کار کو ہوتے ہیں۔" میں اپنی نروس نیس چھپانے کو مسکرائی اور ٹیب آن کیا۔

"کچھ اقتباسات کا ترجمہ آپ کو ای میل کر رہی ہوں، آپ دیکھ لیں پھر رائے دیں۔" میں انگلیوں کی لرزش چھپا کر سنجیدہ چہرہ بنا کر خود کو ٹیب میں مصروف ظاہر کرنے لگی۔

"میں چیک کر کے آپ کو انفارم کرتا ہوں۔" اس نے جانچتی نظروں کے ساتھ کہا اور میرا دل ڈولا۔ میں اسے اپنا کیا ترجمہ پڑھتے دیکھنا چاہتی تھی اس لیے تو میں نے اتنی محنت کی تھی۔ اسی دن کا تو انتظار تھا مجھے۔

"یہ بہت خوبصورت ناول ہے۔ مجھے یقین ہے اردو داں طبقے میں اسے بہت پذیرائی ملے گی اور امید ہے آپ کو میرا ترجمہ انصاف کرتا محسوس ہوگا۔" میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"آئی ہوپ سو، ہم جلد ترجمے پر کام شروع کریں گے۔"

وہ مسکرایا اور مجھے ایک بار پھر رونا آنے لگا۔ میں الوداعی کلمات جس میں گڈ بائے شامل نہیں تھا کہہ کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ میری پیشہ ورانہ زندگی کی یہ پہلی اتنی مختصر میٹنگ تھی۔

شکر تھا لفٹ خالی تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں نیچے اکڑوں بیٹھ گئی۔ میرے پیر بے جان ہو گئے تھے۔ میں نے چشمہ نکالا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو بہنے سے روکا۔

"میں بار بار سامنا نہیں کر سکتی، میں زیادہ دیر خود پر کنٹرول نہیں رکھ پاؤں گی۔" میں نے سوچا تھا۔

اگلے دن ہی مجھے امن کا پیغام ملا کہ اگلی ملاقات کب رکھیں اور میں جھوم اٹھی۔

ایک دن بعد جب میں دفتر پہنچی تو اس بار ہم تنہا نہیں تھے امن بھی موجود تھا۔ اس دن میں نے بتا دیا کہ میں مکمل ترجمہ کر چکی ہوں۔ مجھے اطیب کی پرسوچ نگاہیں بہت محسوس ہوئیں۔ مجھے رادھیکا نے بتایا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے فیسٹیول میں جائے گا۔ مجھے یقین تھا۔ مکمل ترجمہ پڑھنے کے بعد اس کا فون ضرور آئے گا۔

میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے میں نے رادھیکا کو استعفیٰ سونپ دیا۔ وجہ یہ بیان کی تھی میں لندن جا رہی ہوں جہاں نئی جاب کے لیے اپلائی کیا تھا۔

اس ایک ہفتے میں، میں نے بہت سوچا، خود سے خوب لڑائیاں کیں اور جو اتنے سالوں سے میرا ارادہ تھا کہ میں اسے ترجمہ سونپ کر اس سے یہ اعتراف کروں کہ یہ ترجمہ اس کے خیالات اور اصل سے انصاف کرتا ہے، بن کر لوٹ جاؤں گی، بدل گیا۔

اس ناول کا اختتام جو مجھے اطیب کی مرضی لگتا تھا، اب میں اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ میری 'ذاتی' فیری ٹیل کا انجام بھی تو میری مرضی سے ہونا چاہیے۔

دور دور سے ارادے باندھنا بہت آسان تھا۔ اب اسے دیکھنے اور ملنے کے بعد انسانی فطرت جاگ اٹھی تھی۔ دل لالچ کرنے لگا تھا، وہ اب قانع نہیں رہا تھا، اس کا صبر ختم ہو گیا تھا، اسے مزید اور سب کچھ چاہیے تھا، اسے اب دور نہیں جانا تھا۔'

'ادھوری رخصت' سے اخذ کی ساری باتیں، اور پیغام دل کی دلیلوں کے آگے سرنگوں ہو گئے اور میں شام کی طے شدہ ملاقات سے پہلے صبح اس کی آمد کے وقت ہی اس کے پینٹ ہاؤس روانہ ہو گئی۔ شین کو اب الف سے ملنا تھا اور حال دل کہنا تھا۔

ساتویں منزل پر لفٹ رکی اور جو دو خواتین اندر داخل ہوئیں، ان میں سے اطیب کی والدہ کو میں سوشل میڈیا کی تصاویر کی وجہ سے پہچان گئی تھی۔

"اطیب کب شادی کر رہا ہے؟" دو تین باتوں کے بعد دوسری خاتون نے پوچھا اور میں نے دم سادھ لیا۔

"بہت جلد۔" اس کی والدہ نے خوش دلی سے کہا۔

"ارے واہ! یہ تو بہت اچھی خبر ہے، کون ہے؟"

"اس کی دوست ہے، میں تو کب سے کہہ رہی تھی مگر اس نے اس نئی کتاب کے بعد ہامی بھری تھی۔ ایک دو ماہ میں کتاب آ جائے اس کے بعد ان شاء اللہ۔"

ہمارے طبقے میں ارینج میرج کم ہی ہوتی تھی اور اس نے دوست کے لیے ہامی بھر رکھی ہے تو۔ اس لیے وہ رویہ اور۔ مجھے پہچاننے کے بعد بھی خاموشی۔ میں ایک بار پھر ناول کے اختتام پر اٹک گئی۔ وہ دونوں بھی پینٹ ہاؤس میں ہی آئی تھیں۔ میں لابی میں رک گئی اور وہ دونوں اندر چلی گئیں۔

میں صوفے پر بیٹھی ایک بار پھر فیصلے کے دوراہے پر تھی۔

شاید میں نے شروعات سے ہی سب کچھ غلط سمجھا، میں بس اس کے لیے ایک میوز تھی اور کچھ نہیں۔ اس نے کہانی لکھی، خود کو کامیابی سے لانچ کیا اور کیریئر اور زندگی میں آگے بڑھ گیا۔ اگر میرے لیے کچھ تھا بھی تو وہ سب اس ناول میں ہے، اس کے باہر کچھ نہیں ہے۔ ایک بار اشتباہ ذہن میں جگہ بنا لے تو منٹوں میں دلیل، استدلال، یقین جیسے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

احساس اور خیال نگل لیتا ہے۔ اس نے منٹوں میں میرے بھی چھ سال کھا لیے۔
"لیکن اطیب کے لیے یہ جو بھی تھا میرے لیے وہی تھا جو میں نے اتنے سالوں سوچا تھا، سینچا تھا۔" میرے لیے سر جھٹک کر دور کر دینے والا، احساس اور خیال نہیں تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے مجھ پر منکشف ہوا اطیب اگر آگے بڑھ بھی گیا تھا تو اس نے مجھے جو دیا تھا وہ میرے لیے کافی تھا۔
اطیب نے ادھوری رخصت کو چنا تھا اور مجھے اس کے انتخاب کا احترام کرنا تھا، اسے ایسے ہی قبول کرنا تھا جیسے میں نے اپنی ذاتی فیری ٹیل کو کیا تھا۔ مجھے نہ کچھ ختم کرنا تھا نہ مکمل کرنا تھا اور میں وہ ڈرافٹ اس کی میز پر رکھ کر لوٹ آئی۔

☆☆☆

اس کی لندن کی فلائٹ پرسوں صبح کی تھی۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر یہاں آئی تھی۔ پنجوں کو چھوتے کاٹن کے گلابی فراک پر اس نے سفید سویٹر پہنا تھا۔ دوپٹا اس کے مخصوص انداز میں گردن کے گرد حلقہ بنا کر آگے جھول رہا تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ اس چھت سے نظر آنے والا منظر جوں کا توں تھا۔ مسوری میں برف باری ہو رہی تھی جس کا اثر یہاں بھی تھا۔ ٹھنڈ زیادہ تھی اور پہاڑوں کے گرد دھند بھی۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر وہ جگہ کھوجنے کی کوشش کی جہاں سے اس نے اسے دیکھا اور سنا تھا۔
"اوپر والی چھت ہی ہوگی۔" اس نے سر اونچا کر کے اوپر ان محرابوں جیسے ننھے ننھے دریچوں والی دیوار کو دیکھ کر سوچا اور اتر کر اگلے حصے سے اوپر جانے والی سیڑھیوں سے تیسری منزل کی چھت پر پہنچی۔ اس نے جھجکی دیوار کے ہر حصے میں کھڑے ہو کر نیچے جھانکا، ان چھوٹے سے دریچوں سے بھی۔ پھر سامنے کا منظر بھی دیکھا جو یہاں سے بھی بالکل ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسے دوسری منزل کی چھت سے۔ اس نے غور کیا، وہ کہاں کہاں سے اسے دیکھ اور سن رہا ہوگا۔ آنکھیں بند کر کے ان جگہوں پر تصور بھی کیا۔
"مجھے کسی کی موجودگی اور نظریں بھی محسوس کیوں نہیں ہوئیں؟" اس نے سوچا۔
"اچھا ہی ہوا نا۔ اگر محسوس ہوتیں تو تم نے اسے وہاں سے بھگا دینا تھا یا تم دونوں کی لڑائی ہو جانی تھی۔"
"دوستی بھی تو ہو سکتی تھی۔" اس خیال نے اسے مسکرانے پر مجبور کیا۔ اسے افسوس تھا کہ اس کی شناسائی کی عمر اس سے دو سال کم تھی۔
"لیکن ہماری کہانی شروع تو ایک ساتھ ہوئی تھی۔" اس خیال نے افسوس کچھ کم کیا۔
وہ واپس دوسری منزل والی چھت پر آ گئی۔ کچھ دیر دیوار کے پاس کھڑی سامنے کا نظارہ دیکھتی رہی۔ جنوری کے وسط میں سورج کہیں چھپ کر ستا رہا تھا۔ پہاڑ بھی جیسے ابر کے پیچھے چھپ کر اونگھ رہے تھے۔ اس نے سویٹر کی جیب سے موبائل نکالا اور اپنی آواز کی صوت بندی شروع کی۔
فورٹین جنوری ٹوئنٹی تھری، حویلی آغا جان۔
"میری ڈیجیٹل ڈائری بس اسی جگہ ریکارڈ ہوتی ہے۔ تقریباً آٹھ سال اور چھ ماہ بعد پھر اس جگہ ہوں جہاں آنے کے فیصلے نے میری زندگی بدل دی۔ یہاں گزارے ایک ہفتے نے دو زندگیاں بدل دیں اور اس سے باخبر ہونے میں، میں دو سال لیٹ ہو گئی۔ یہاں میری اونگی بونگی باتوں کو کسی نے اتنی سنجیدگی اور توجہ سے سنا تھا کہ مجھے رہتی دنیا تک کے لیے کتاب اور دل میں قید کر دیا۔ میں اتنی غیر معمولی اور اہم تو نہیں تھی کہ فیری ٹیل کا مرکزی کردار بنتی لیکن ایک غیر معمولی انسان نے یہ کر دکھایا۔
یہ کہانی خوبصورت تو ہے لیکن دوسری کہانیوں سے منفرد بھی، اس میں محبت کے انوکھے معنی اور نئے طور لکھے ہیں، اس میں محبت نبھانے کی نئی روایت ہے، قربت فرقت کے نئے طریق بھی اور میں نے ان سب کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر گلے لگا لیا ہے۔

میں خوش ہوں اداس بھی، میں مطمئن ہوں اور بے حال بھی، مجھے دور جانا ہے اور نہیں بھی۔ لیکن کہانی کے کردار کی مرضی نہیں چلتی، وہ اپنی من مانی کرے تو کہانی برباد ہو جاتی ہے، اس کا حسن داغ دار ہو جاتا ہے۔ اور میرا کہانی کار مجھے کہانی سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کا لکھا انجام بھی اور یہ ادھورا پن بھی۔"
وہ بولتے بولتے آہستہ سے پیچھے پلٹی اور ذہن سے سارے الفاظ یوں اڑے کہ سحر جیسے پھونکا گیا ہو اور آواز یوں سلب ہوئی مانو کسی طلسم نے نطق سے محروم کر دیا ہو۔ سامنے دیوار سے لگ کر اس کا کہانی کار کھڑا تھا۔ ایک پیر زمین پر دوسرا پیچھے دیوار سے لگا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے فیری ٹیل کا یہ راج کمار پکا سہا تھا کہ دس ڈگری سیلسیس میں وہ کپڑوں کی چار پانچ تہوں میں یوں ملبوس تھا جیسے حویلی آغا جان میں نہیں سوئزر لینڈ کے برفیلے پہاڑوں میں ہو۔ بلیو جرسی کے گلے سے شرٹ کی سفید کالر جھانک رہی تھی، اس پر لمبا سیاہ ونٹر کوٹ اور گلے میں گرے مفلر تھا۔
پچھلے دنوں کی مصروفیت بڑھی شیو سے ظاہر تھی۔
وہ اس پر نگاہیں جمائے آگے بڑھا۔ شاہین کا انداز اسی وضع میں ٹھہرا تھا جیسے وہ پلٹی تھی۔ اطیب نے مقابل آ کر دھیرے سے اس کی کلائی پکڑ کر یوں اپنی طرف کھینچی کہ اس کی انگلیوں کے درمیان لٹکے موبائل کا مائیکروفون اب اس کے چہرے کے قریب تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ جھک کر مائیکروفون کے قریب ہوا۔
"اے پینڈنگ گڈ بائے فیری ٹیل نہیں، بلکہ اس کا ادھورا باب تھا، جیسے پہلی اور آخری کے بغیر کوئی فیری ٹیل مکمل نہیں ہوتی۔ اگست فورٹین میں شروع ہوا اس فیری ٹیل کا لاسٹ چیپٹر ابھی، اس وقت، مکمل ہو رہا ہے، جس کا پہلا باب حویلی آغا جان تھا اور اس لاسٹ چیپٹر کا نام میں نے 'شاہین اطیب' رکھا ہے، تم چاہو تو یہ نام بدل کر اپنی مرضی سے بھی رکھ سکتی ہو۔"
سیدھا ہو کر اطیب نے کلائی ساتھ جگہ کر دی جہاں مائیکروفون کا رخ اس کی سمت کیا۔ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس کا دل خوشی سے معمور اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔
"شاہین اطیب پرفیکٹ ہے۔" سارے طلسم ٹوٹ گئے تھے۔ الفاظ، گویائی سب لوٹ آئے تھے۔ اس کی آواز دل اور آنکھوں کی ترجمانی کر رہی تھی۔
"گڈ۔" اطیب نے اسی نرمی سے اس کی کلائی چھوڑ کر موبائل اسکرین پر انگلی رکھی اور وہاں لہراتی لرزتی صوتی لہریں ساکت ہو گئیں۔ شاہین نے ہاتھ نیچے گرایا اور موبائل والا ہاتھ سویٹر کی جیب میں رکھ لیا۔ اطیب سامنے پربتوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔
"کیا تمہیں آج بھی یہ پہاڑ ایسے ہی لگ رہے ہیں جو ساتھ ہیں مگر پاس نہیں اور انہیں یہ ادھورا پن عزیز ہے؟"
وہ اس کے بازو میں جا کر رک گئی۔
"اگست فورٹین والے بہت سے خیالات بدل گئے ہیں۔" اس نے خود کو سنبھال لیا تھا مگر آواز میں اب بھی لرزش تھی کہ یہ مسرت راحت اس کی سوچ سے زیادہ تھی۔
"جیسے۔۔۔؟" اطیب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"جیسے، بنا مقصد زندگی تو گزر جاتی ہے مگر مقصد سفر کو بھی انعام بنا دیتا ہے، چلتے رہنا بھی منزل سے کم خوشی نہیں دیتا اور قربت فزیکل نزدیکی سے زیادہ احساس کا نام ہے، میلوں کے فاصلوں پر لکھے گئے الفاظ جب دل کو چھوتے ہیں تو یہ دوری بھی گفتار کا فن سیکھ جاتے ہیں اور۔" اس نے بھی گردن موڑ کر اطیب کو دیکھا جس کی نظریں اس کے چہرے پر ہی ٹھہری تھیں۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

''اس وقت یہ مجھے ادھورے نہیں لگ رہے ہیں۔'' پاس پاس کھڑے وہ دونوں ایک ساتھ، ایک سے احساس میں گھر کر مسکرائے تھے۔
اطیب نے ہاتھ میں پکڑی کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ شاہین نے دیکھا، 'ادھوری رخصت' کا سر ورق اسے پینٹنگ گڈبائے سے مختلف تھا۔ پہاڑوں کے پیچھے سے جھانکتے سورج والے پس منظر میں دو سیاہ سائے ایک دوسرے کے آگے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ یہ وداع بھی ہو سکتا تھا اور تجدید ملاقات بھی۔
شاہین نے اطیب کو دیکھا۔
''انٹرپریٹیشن کے معاملے میں تمہارا خراب ریکارڈ دیکھتے ہوئے احتیاطاً اس دفعہ آسان بنایا ہے۔'' وہ کتاب اس کے ہاتھ سے لے کر ہنسی تو آنسو گالوں پر پھسل گئے۔
''جب میں نے پہلی بار سوچا تھا کہ تمہیں تمہاری 'ذاتی فیری ٹیل' دینا ہے، اس وقت سے میں جانتا تھا ہمارا ہیپی ایور آفٹر بھی لکھا جا چکا ہے بس اس کے لیے کتنا انتظار۔ یہ علم نہیں تھا اور تبھی میں نے خود کو ایک لمبے انتظار کے سپرد کر دیا تھا۔''
وہ کتاب کے سرورق پر ہاتھ پھیر کر مسکرائی۔
''انٹرپریٹیشن ہی نہیں یقین کے معاملے میں بھی میں کمزور ثابت ہوئی ہوں۔'' اچانک اسے کچھ یاد آیا۔
''اس وقت یہاں کیسے۔ کس نے بتایا۔؟''
ذرا سا پیچھے جا کر اس نے دونوں بازو پھیلائے۔
''حویلی آغا جان کا نیا مالک، اطیب حیدر۔''
''ہا۔'' اس کی حیرت بجا تھی۔
''شالو کے مقابلے میں شاہین سعید کے متعلق پتا کرنا مشکل نہیں اور جب کوئی یہاں آنے کی اجازت مانگے تو مالک کو پہلے خبر ہوتی ہے۔''
وہ ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر واپس اس کے قریب آیا۔
''تم مجھ سے دور جانے کی کوشش میں سیدھے میرے پاس چلی آئی۔''
''ہمیں اس کہانی کار کو کبھی انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے آسمان کی سمت انگلی اٹھا کر کہا تھا۔

☆☆☆

برسوں بعد پھر حویلی آغا جان میں رونق ایک اور شادی کی وجہ سے اتری تھی۔ اس بار چند ہ مہمان تھے اور تقریب بھی بس ایک۔
اگلی صبح طلوع آفتاب سے پہلے وہ دوسری منزل کی چھت پر کھڑا تھا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ پیچھے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی شاہین کی آواز ابھری۔
''یہ دھوکا تھا یا میرا امتحان؟'' جرسی اور جیکٹ میں لپٹا اطیب ہنستے ہوئے پلٹا۔ وہ شب خوابی کے لباس پر شال اوڑھے تھی۔
''تمہارا انتظار۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔
شاہین نے مہندی سے سجے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے برابر کھڑی ہوئی۔
''ہمارا ساری عمر کے انتظار کا کوٹا پورا ہو گیا ہے، اب انتظار کرنا ہے نہ کروانا ہے۔''
''بس ایک دن کے لیے تمہاری طرح تنہا یہ نظارہ دیکھنا چاہتا تھا۔''
''ایک رائٹر کو ایسی ٹیکنیکل غلطی نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کبھی اکیلے یہ نظارہ نہیں دیکھا۔''
''جس کے پاس ایک قابل ایڈیٹر ہو، وہ کر دے تو چلتا ہے۔'' اطیب نے بازو پھیلا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا دیا۔
''سورج بس نکلنے والا ہے۔'' پہاڑوں کے عقب سے نارنجی شعاعیں نمودار ہوتے دیکھ کر اطیب نے کہا۔
وہ دونوں نہیں جانتے تھے، آج پربتوں کے یہ سلسلے انھیں ایک ساتھ دیکھ کر کس قدر خوش تھے اور ان کی سرگوشیاں سن کر سورج بھی انھیں دیکھنے کی خواہش لیے بیدار ہوا تھا۔ آخر یہ ایک فیری ٹیل جو تھی۔

☆☆

ماہنامہ کرن

مارچ 2023ء کے شمارے کی ایک جھلک

❁ ''ماہنامہ کرن'' کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے دلچسپ سوالات،

❁ اداکارہ ''عالیہ علی'' سے ملاقات،

❁ اس ماہ ''عشوُنور'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،

❁ ''تاش گھر'' ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''شوا من سحاب'' مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''گمان کی آہٹ'' فرح بخاری کا مکمل ناول،

❁ ''گنوار کرول وجاں ہم'' ام طیفور کا مکمل ناول،

❁ ''دشت الجھن کا ستار'' آسیہ رئیس کا مکمل ناول،

❁ ''مقیاس'' میمونہ صدف کا ناولٹ،

❁ ''لا'' منشا محسن علی کا ناولٹ،

❁ ام اقصیٰ، ام ہانی، فلک تنویر اور فرح انیس کے افسانے اور مستقل سلسلے،

❁ ''کرن کرن خوشبو''

8 مارچ خواتین کا عالمی دن'' شاہین رشید کا سروے،

مارچ 2023ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

فرح بخاری

شام شہر ہجراں

میانم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے تھے۔ عزت بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی تحریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی کیا تھا لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔

تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میانم ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔

حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال خان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بد دماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔

رضوانہ اور عزت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ اور دوسری مومن چلا رہا ہے۔ راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

وسیلہ اور منصب اس طوفان میں ملتے ہیں اتفاقاً وسیلہ ایک بچا پوچھتے منصب سے ٹکراتی ہے وہ اسے مختصر راستے سے اپنے گھر لے کر جاتا ہے لیکن وہ اس پر شک کرتی ہے بعد میں اسے منصب کے گھر۔ اسی بچے کی فرق سے جانا پڑتا ہے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔

تحریم کی شادی میں وسیلہ منصب اور رمشہ کو انوائٹ کرتی ہے۔ منصب اور رمشہ کو وسیلہ اچھی لگتی ہے تحریم اور مومن پوری فیملی کے ساتھ کالام گھومنے جاتے ہیں اور اسی سفر میں وسیلہ اور منصب کی پھر ملاقات ہو جاتی ہے۔

تیسری قسط

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"ستو وسیلہ...... یہ فیروزہ بی بی کہاں گئی۔ ابھی بھلی چنگی صحن میں کپڑے دھو رہی تھی۔ یہ اچانک کہاں چلی گئی۔"

رضوانہ کمرے میں داخل ہوئیں تو کچھ حیران پریشان سی لگیں۔ وسیلہ نے چشمہ آنکھوں سے اتار کے کتاب سائیڈ پر کی۔

"اور ایلیا؟"

"وہ ہے گھر پہ؟ وسیلہ کا دھیان کسی اور جانب گیا۔"

"دکھائی تو وہ بھی نہیں دے رہی، میں نے سوچا شاید ماموں کی طرف گئی ہوگی امی سے پتا کریں، فیروزہ بیچاری سنڈے کے روز تو امی کے کاموں سے بھاگتی پھرتی ہے۔"

"اچھا۔" رضوانہ جانے کے لیے پلٹیں "تحریم کو کال کر کے پتا کرتی ہوں۔"

"جی۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔" وہ کتاب رکھ کے پلنگ سے اتری۔ موسم بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ جون کی گرمی میں سیاہ موسم کے شب و روز نہایت خوش گوار اور معتدل ہو جایا کرتے۔

کھڑکی میں وہ یونہی بے ارادہ آئی تھی لیکن گھر کی چھوٹی دیوار کے پار کا چھوٹا سا گراؤنڈ یہاں سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ اور بلاشک و شبہ وہ ایلیا ہی تھی۔ وسیلہ نے جلدی سے شال اوڑھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ پہلے امی کو بتایا کہ ایلیا باہر ہے پھر خود بھی باہر نکل آئی۔ چار پانچ بڑے لفافوں اور ڈبوں کے علاوہ وہاں فیروزہ بھی تھی جو کھانے پینے کا سامان سمیٹ کر اب واپس پلٹ رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے؟" وسیلہ حیرت سے منہ کھولے اس خفیہ سموسہ پارٹی کے بچے کھچے نشان دیکھ رہی تھی۔

"آپ بھی لیٹ ہی پہنچتی ہیں ہمیشہ۔" ایلیا نے آخری لفافہ خود اٹھایا۔ فیروزہ باقی کا سب سامان اٹھا کر لے گئی تھی۔

"کیا مطلب لیٹ پہنچتی ہوں۔ اور یہ ہو کیا رہا تھا یہاں؟" وسیلہ کی تو حیرت ہی نہیں جا رہی تھی۔

"آپ سے پہلے وہ آئے تھے جو غریبوں کے دشمن نمبر ون ہیں۔" ایلیا نے انگلیاں خوب جلے بھنے انداز میں ماموں کے گھر کی طرف اٹھائیں، جس سے وسیلہ فوراً سمجھ گئی کہ نشانے پر ماموں زاد مومن صاحب ہی ہیں۔

"غریبوں سے پہلے تو آپ کے دشمن نمبر ون ہوتے ہیں نا......" وسیلہ ہلکے پھلکے ہنس دی۔

"ہاں جی۔ غریبوں کے دشمن اور غریبوں کے حامیوں کے جہادی دشمن۔"

"ہوا کیا تھا؟" وسیلہ نے اس کے شاپر میں ہاتھ ڈال کر بچا ہوا سموسہ نکالا۔

"ہا...... ایلیا نے آہ بھری تو آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔" پچھلی اتوار کو وہ بالکنی سے یونہی نیچے کا نظارہ کر رہی تھی۔ گراؤنڈ میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک ٹیم جیت گئی اور ہاری ہوئی ٹیم منہ بسورتے فوراً رخصت ہو گئی۔ جیتی ہوئی ٹیم نے پارٹی منانے کے لیے رقم جمع کرنے کی کوشش کی لیکن آدھی سے زیادہ ٹیم خالی جیب نکلی جس پر پارٹی ملتوی کر دی گئی۔ ایلیا اوپر خاموش کھڑی ان معصوم بچوں کی اس ننھی سی خوشی اور اس خوشی کو سلیبریٹ نہ کر سکنے کا افسوس دیکھتے الگ ہی کرب میں ڈوب گئی۔ تب ہی اس سنڈے جوں ہی ان بچوں کا میچ شروع ہوا اس نے دونوں ٹیموں کے لیے سموسے منگوا کر شاپر گراؤنڈ کے کنارے لا کر رکھ دیے۔ ایک بڑے بچے کو بلا کر سمجھا بھی دیا۔ اور بس یہی ایلیا سے بھول ہو گئی۔ ایک تو بچہ ذرا بچے سے کچھ زیادہ بڑا تھا اوپر سے بنا دائیں بائیں دیکھے ہی اسے اشارہ کر کے بلا لیا۔ حد تو یہ کہ اشارہ کر کے بلانے پر ایک کے بجائے پوری ٹیم ہی بھاگی چلی آئی۔ اس پہ مستزاد مومن خان بھی اسی وقت چائے کا کپ لیے اپنی بالکنی میں آئے تھے۔ ایلیا بی بی کو اس روز دس بارہ بچوں کی ٹیم سے مذاکرات خوب مہنگے پڑ گئے۔

"کرکٹ کھیلیں گی اب آپ؟" وہ چائے دو سیکنڈز میں اس کے سر پر پہنچے تھے۔

"آپ...... نن...... نہیں...... وہ...... بھیا آپ سموسے لیں، گرما گرم......" ایلیا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا مومن کی وہاں آمد نہیں تھی۔ سرخ پڑتے چہرے سے فوراً ہی سموسہ نکال کر پیش کیا۔ کپکپاتے ہاتھوں کی مجرمانہ لرزش کو مومن نے خوب ہی کڑے تیوروں سے دیکھا۔

"کیا ہے یہ سب؟"

"وہ اصل میں یہ سب غریب بچے ہیں۔ ان کے پاس یہ پارٹی کرنے۔ مطلب کھانے کے لیے پیسے...... آئی مین کھانے کو کچھ نہیں ہے۔" اسے خیرت کی ٹھیک سے وضاحت کرنا بھی نہیں آ رہا تھا۔

"اندر آؤ سب سمیٹ کر، ابھی بتاتا ہوں۔" لڑکوں کی موجودگی کے خیال سے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا گیا تھا۔ لڑکوں نے جھٹ پٹ سموسے نکال کر فوراً سے کھا بھی لیے اور یہ جا وہ جا۔

"یعنی اندر ایک اور کلاس لگنی ہے؟" وسیلہ نے بہت ہنسی چھپائی۔

"غدارا بچا لیں۔ پنجے تیز کیے بیٹھا ہے وہ خونی بلا۔"

"لاحول ولا...... ایلیا......" وسیلہ نے آنکھیں نکالیں۔ "شرم کرو بدتمیز، یہ کیا لینگویج ہے۔"

"آپ نے دیکھا نہیں نا۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر بھاگنے لگی۔ "اندر آؤ" تو ایسے کہہ رہے تھے جیسے ایک بار لاک اپ میں آؤ پھر بتاتا ہوں...... ایسے۔"

"بس کرو ایلیا!" وسیلہ اس بار ہنسی نہیں روک پائی۔ لاک اپ کے ذکر پر ایک وردی والا کیا یاد آیا ذہن کی بکھر لٹ گئی۔ اسے باقاعدہ تصور میں کھول دیے لگا کہ منصب وردی میں کس طرح ملزموں سے پیش آتا ہوگا۔

"آپ کو کہا میں نے کہا تھا۔ یہ سموسوں والا آئیڈیا۔"

"ارے...... میں کیوں......" وسیلہ بدکی لیکن اس سے پہلے ہی مومن گیٹ کے پیچھے سے سامنے آ گیا۔

"جھوٹ بھی سکھا رہی ہو؟ میں کیا جانتا نہیں ہوں وسیلہ کو۔" بازو سینے پہ لپیٹے تیور بھی "قصابانہ" سے کر رکھے تھے۔ وسیلہ ہنس کر اندر ممانی کی طرف بڑھ گئی۔ اب ایلیا جانے اور اس کے مومن بھیا۔

"کیا سوچیں گے وہ لڑکے۔ اتنی ہی لڑکی آخر کس لیے ہم پہ اتنا مہربان ہو رہی ہے۔"

"ہائے پر وہ تو چھوٹے......"

"قد دیکھے تھے ان کے۔" وہ اور زور سے دھاڑے۔ "اور عمر دیکھی ہے؟"

"ہاں جی، ابھی آئی ڈی کارڈ نہیں بنا میرا۔" وہ آنسو بھری پلکوں سے خود ہی ان کو وہ دے گئی جس سے آئے روز واسطہ پڑتا ہی رہتا تھا اور آگے بھی کیا مجال کہ وہ سدھر جائے یا مومن بھیا ہی پیچھے ہٹ جاتے۔

"خبردار جو آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر تم نے کوئی بھی الٹے سیدھے کرتوت کیے۔" وہ انگلی اٹھا کر وارن کر رہے تھے اور ایلیا دل میں سوچ رہی تھی "آپ" سے کیوں پوچھوں۔ میرے گھر میں میری ماں ہے، بڑی بہن ہے۔"

"باپ ہے کیا؟" وہ تو جیسے اس کی سوچ پڑھ رہے تھے۔ تنگ کر پوچھا۔ وہ بدک کر دوڑی، پیچھے ہی۔

"یہ مومن بھیا تو بھوت پریت بھی ہیں۔ اندر کی باتیں کوئی انسان کیسے پڑھ سکتا ہے۔" وہ بنا اسے مزید سنے فوراً وہاں سے بھاگی۔ اب سوچ پڑھنے والوں کے سامنے کیا ٹھہرنا۔ بھاگنے میں ہی عافیت تھی۔

☆☆☆

"اے سن نا رمشہ۔ پچھلی بار جب میں آئی، مجھے وہ پیاری سی لڑکی بڑی ہی اچھی لگی تھی۔ ان کے گھر چلیں۔" رمشہ گود میں شہیر کو تھپکنے کے ساتھ ساتھ ٹی وی بھی دیکھ رہی تھی۔ انیس کے اسکول میں

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گڑیا کی چھٹیاں ہوئیں تو وہ ایک بار پھر میمونہ کو میاؤں چھوڑ گیا۔ اور میمونہ کو گزرے تین ماہ میں بھی وسیلہ برابر یاد رہی تھی۔ میاؤں میں ہی اتنی اچھی سوبر سی، پڑھی لکھی لڑکی کا مل جانا، اسے منصب کی خوش قسمتی دکھائی دیا۔ آپس کی باتوں میں دونوں کی لگاتار چپ ان کے ایک دوسرے کے لیے جذبات صاف عیاں کر رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی منصب اپنے محسوسات بھی ان پر ظاہر نہیں کرے گا۔ تب ہی وہ پچھلی مرتبہ بنا کچھ کہے واپس چلی گئی تھی۔

"کون پیاری سی لڑکی؟" رمشہ کا دماغ ٹی وی سیریل میں پھنسا تھا۔ میمونہ نے سر پر چپت لگائی۔

"ادھر دیکھو یہاں۔ میں وسیلہ کی بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا ہاں وسیلہ لوگ...... ہاں ہاں کیوں نہیں جانتے ہیں، لیکن آپ کی دلچسپی۔" رمشہ نے لیوست کرتے آنکھیں چھوٹی کرکے بہن کو دیکھا تو اس نے بھی شرارت سے آنکھیں میچیں۔

"ہاں، ایک تمہیں میری دلچسپی کی وجہ۔" اس نے دور دوسرے کمرے میں بیٹھے منصب کی طرف اشارہ کیا تو رمشہ بھی ہنس دی۔

"دونوں پیدا بھی ایک ہی دن ہوئے ہیں پھر شادی بھی ۲۵ اکتوبر کو کر دیں تو تین ایونٹ ایک فنکشن میں نمٹ جایا کریں گے۔"

"ایک ہی دن سالگرہ۔ اچھا؟" میمونہ کے لیے ناقابل یقین تھا۔ رمشہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"واؤ...... کیا مزے کا اتفاق ہے۔ تو کیا کہتے ہیں موصوف؟ پسند ہے ان کو وسیلہ۔"

"کیا کہتے، آپ کو یہ ماننے والے لگتے ہیں؟" رمشہ حیرت سے دوہری ہوئی۔

"ہوں۔ مطلب اگلوانی پڑے گی بات۔" میمونہ کا دماغ فوراً کہیں اور پہنچا۔ "دیکھنا پھر، میں بھی اس کی بہن ہوں۔ آؤ ذرا وہاں قریب ہو کر بیٹھتے ہیں۔" میمونہ نے جگہ بدلی اور رمشہ بھی دبا دبا جوش لیے اس کے پہلو میں آ بیٹھی۔ منصب وہاں سے کچھ فاصلے پر اندر روم میں کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا۔ درمیانی فاصلہ ایسا چند قدم کا تھا۔ آواز با آسانی صاف سنی جا سکتی تھی۔

"ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟ وہ وسیلہ کس کے پیچھے ہے؟"

"ہاں، بتا رہی تھی ابھی پریکٹس شروع نہیں کی۔"

"باری تو ویسے اسی کی ہے نا گھر میں؟ مطلب کوئی بڑی بہن بھائی وغیرہ؟" میمونہ خود کو ایک دم انجان ظاہر کرتے بہت کمال کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ منصب نے سرسری ایک نظر ڈال کر دوبارہ اسکرین کی طرف دیکھا۔

"باری تو گھر میں وسیلہ کی ہی ہے۔ بڑی ہم کی شادی ہو چکی ہے۔ اور بھائی تو ہے کوئی نہیں۔ یہ تین بہنیں ہیں۔ اور ان کی امی آنٹی رضوانہ بڑی نرم خو، اچھی سی خاتون ہیں۔"

"یار جلد پروگرام بناؤ ان کے ہاں جانے کا۔"

"کیوں خیریت؟" منصب نے ریوالونگ چیئر کا رخ ان کی طرف پھیرتے رو کھے لہجے میں جاننا چاہا۔ "تمہیں کیوں شوق ہو رہا ہے ان کے ہاں جانے کا؟"

منصب کے کان تو وسیلہ کا نام سنتے ہی پورے کھڑے ہو چکے تھے اوپر سے بہن کا اتاولا پن دیکھ کر سوال کرنے سے باز نہیں آ سکا۔

"وہ...... اصل میں...... میری بڑی نند اور ساس آج کل عرفان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں، تو بہت وقت ہو گیا انہیں کوئی لڑکی پسند بھی نہیں آ رہی۔ میں نے سوچا ان کو وسیلہ کا بتاتی ہوں۔" میمونہ نے بڑے اعتماد اور بھولپن سے آغاز لیا اور رمشہ کا بھی منہ کھل گیا۔ تو یہ میمونہ اس انداز سے بات اگلوانا چاہ رہی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں رمشہ! ایک بار گھر وغیرہ دیکھ لیں، تو میں تصویر بھی مانگ لوں گی۔ کیا کہتی ہوا تو ہلکی پھلکی اور ملائمت بھری چلنے لگی۔ کوشش رمشہ کو اور اکساتے ہوئے گی۔ کوشش رمشہ کو اور اکسانے میں غرق تھا۔

منصب البتہ صدمے میں غرق تھا۔

"ہاں اور اپنی ساس سے کال کر کے ہی بات کر لو۔ پھر رضوانہ آنٹی سے بھی بات کر کے جا سکتی ہو۔ عرفان کو تصویر دکھا دیں گے۔ اگر اس کو بھی پسند......"

"بے بے بے بے؟" منصب نے جب زور سے ان دونوں کو ٹوکا تو ماتھے پر ایک ساتھ کئی بل کھینچے تھے۔ "کیا کیے جا رہی ہو دونوں، تمہارا کیا لینا دینا عرفان کے رشتے سے۔"

"ہائے منصب، لینا دینا کیوں نہیں۔" میمونہ نے انگلی ناک پہ رکھی۔ "دیور ہے میرا۔"

"ہاں اور کل کو کوئی اونچ نیچ ہوئی تو تم ذمہ دار ہوگی۔" وہ بھی جرح پر اتر آیا۔

"تم جانتے ہو میرے سسرال والے ایسے نہیں ہیں۔"

"تو ان لوگوں کو کتنا جانتی ہو۔" وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میمونہ اور رمشہ اپنی اندرونی حالت کو بمشکل کنٹرول کیے ہوئے تھیں۔

"کیوں...... کیا یہ اچھے لوگ نہیں ہیں؟" میمونہ نے آنکھیں معصومیت سے جھپکاتے رمشہ کو دیکھا، جس نے لاپروائی سے کندھے اُچکا دیے۔

"پتا نہیں، بظاہر تو اچھے ہی لگے، اب منصب کو کیا بات پتا ہے تو۔"

"میں نے ایسا کب کہا۔" وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔

"منصب اب تم پولیس والے ہو، تمہارا دیکھنے کا نظریہ مختلف ہے۔ میں تو تمہاری رائے کو ترجیح دوں گی۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو میرا خیال ہے ہم ان کے گھر بھی نہیں جاتا۔"

"اف چپ کرو۔" منصب نے غصے سے ہاتھ اٹھا دیے۔ "تو یہ ہے تم دونوں سے، کتنا بولتی ہو اور بولے ہی چلی جا رہی ہو۔ جہاں جانا ہے جاؤ لیکن کسی کا رشتہ لے کر نہیں۔"

وہ کی بورڈ کو دھکا دے کر کمرے سے ہی باہر نکل گیا۔ میمونہ نے سر گھما کر اس کی پشت کو دیکھا اور جب بیرونی گیٹ بھی بند ہونے کی آواز آئی تو اندر دبا قہقہہ زور سے باہر نکالا۔ رمشہ کا بھی یہی حال تھا۔ میمونہ نے اپنی چالاکی سے منصب کے دل کی پوری بات باہر نکلوائی تھی۔ اس نے صاف الفاظ میں جتا دیا تھا کہ وسیلہ کے گھر ضرور جاؤ لیکن عرفان کا رشتہ لے کر نہیں۔

☆☆☆

"آ...... آپ......" وہ اس کے سامنے نشست سنبھال لینے کے بعد تک بھی اس کا نام سوچتی رہی تھی۔ شکل دیکھتے ہی سارا کیس تو فوراً ذہن میں تازہ ہو گیا لیکن بندے کا نام بالکل ہی یاد نہیں آ رہا تھا۔

"سردار عیسیٰ احمد خان۔" اس نے مسکرا کر یاد دلایا اور ثانیہ کو پہلی بار اس کی مسکراہٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پچھلی پوری ملاقات میں غالباً وہ ایک بار بھی مسکرایا نہیں تھا۔

"اوہ، جی جی۔ معذرت چاہتی ہوں، نام یاد رکھنے کے معاملے میں کچھ بھلکڑ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے ذرا زیادہ لیٹ ہو گیا...... کیا میں دوبارہ یاد دلا دوں۔ وہ میرے بھائی۔"

"جی، وہ سب مجھے یاد ہے۔ آپ کے بھائی صہیب کا معاملہ تھا۔"

"ارے واہ، آپ کو صہیب کا نام یاد ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

"جی، کیونکہ آپ نے اپنا نام ایک ہی بار تعارف میں بتایا جبکہ صہیب کو ہم نام لے کر بار بار ڈسکس کر رہے تھے۔"

"جی، میں سمجھ رہا ہوں۔" اس نے متانت سے سر ہلایا۔ "یہی بات ہے۔"

"تو...... کیسے ہیں صہیب؟"

"بس وہی پچھ...... ٹینشن ہے۔ جو بتائی تھی۔ میں کچھ

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

خاندانی بکھیڑوں میں پھنسا تھا تب ہی وقت نہیں نکال پایا۔ ورنہ یہ معاملہ میرے لیے ترجیحی نوعیت کا ہے۔"

"تو۔۔۔ کیا لگتا ہے...... ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" عیسیٰ مدعے پر آیا۔

"کیا میں صہیب سے مل سکتی ہوں؟"

"اوہ!" عیسیٰ نے جیسے پہلی مرتبہ سوچا۔"کیا کہہ کر؟" اس نے سر اٹھایا تو ثانیہ اس کے مختصر سوال کا مطلب بخوبی سمجھ گئی۔

"اس کے...... اگر سائکاٹرسٹ سے کنسلٹ کا بتانا مشکل ہے تو رہنے دیں۔"

"مجھے آئیڈیا نہیں کہ وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا...... چاہیں تو سوچ بھی سکتے ہیں ملوانے کا۔" وہ جیسے خود سے ہمکلام تھا۔

"میرے خیال سے میں اسے لے ہی آتا ہوں، اگر آپ کو لگتا ہے کہ اس سے ڈسکس کرنا صحیح رہے گا۔"

"مجھے تو لگتا ہے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔"

"کیا واقعی وہ پیچھے ہٹ جائے گا؟" عیسیٰ قطعی بے یقین تھا۔

"دعوا تو میں بھی نہیں کرسکتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ایک غیر جانب دار بندے کی بات سننا اس کے لیے آپ سب کی نسبت کچھ آسان ثابت ہوگا۔ مجھ سے وہ کھل کر بات کرے گا کیونکہ میں اس کے لیے اجنبی ہوں، اجنبیوں سے بات کرتے ہم پر جذباتی دباؤ نہیں ہوتے۔"

"ہوں...... تو ٹھیک ہے، ایک بار صہیب کا مسئلہ حل ہو جائے، پھر میں بھی اپنے کچھ ذاتی مسئلے ڈسکس کروں گا۔" عیسیٰ نے ہلکا سا مسکرا کر معنی خیزی سے کہا تو ثانیہ نے ہنس کر سر ہلایا۔

"موسٹ ویلکم، آپ جب چاہیں اپنا مسئلہ مجھ سے شیئر کر سکتے ہیں۔"

"اوکے تو جس روز آپ کا موڈ خراب ہو، مجھے سن بیجیے گا۔" وہ موبائل اٹھاتے ہوئے مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیونکہ مجھے سن کر آپ کو بہت ہنسی آنے والی ہے۔"

"اوہ، پھر تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔" وہ بھی مسکرا دی۔ "کیونکہ ہنسنا ہم کب نہیں چاہتے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہنسنے اور خوش ہونے کے مواقع ہمیں زندگی میں بہت ہی کم میسر آتے ہیں۔ لیکن میرے لیے آمنے سامنے بولنا کچھ مشکل ہوگا۔ کیا ہم کال پر بات کر سکتے ہیں؟"

"جی جی ضرور۔ آپ میرا نمبر لے لیجیے۔"

ثانیہ نے فوراً ہی سامنے سے اپنا کارڈ کھینچا اور عیسیٰ کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆

"فیروزہ آج تھوڑا ٹائم نکالنا، کچن کیبنٹ کا برا حال ہے، مل کر صاف کر لیں گے۔"

وسیلہ نے امی کے لیے دودھ گرم کرتے فیروزہ کو مخاطب کیا اور کمرے کی طرف چلی گئی۔

ناشتے کے بعد رضوانہ نے دودھ کے ساتھ ایک دوا لینی ہوتی تھی۔ امی کو دودھ دے کر واپس کچن میں آئی اور کیبنٹ کا سامان نکالنا شروع کر دیا۔ فیروزہ سنک میں پڑے برتن دھو لیے تھے، وسیلہ کا خیال تھا کہ اب وہ بالکل فارغ ہے۔ لیکن کچھ دیر گزر جانے پر بھی فیروزہ اس کی مدد کرنے کے لیے پلٹی نہیں تو وسیلہ کا ہاتھ رکا۔

"فیروزہ۔" اس نے نرمی سے پکارا لیکن وہ بری طرح ہڑبڑا کر مڑی تھی۔

"جج جی باجی۔"

"کیا بات ہے۔ خیریت؟" وسیلہ نے اس کی بوکھلاہٹ کو چونک کر دیکھا تب ہی فیروزہ نے اپنے ہاتھ پیچھے کیے۔ وسیلہ کے لیے اس کی حرکتیں عجیب تھیں۔ بجائے کچھ پوچھنے کے اس بار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ سامنے کیا۔

"اوہ نو!" فیروزہ کا ہاتھ دیکھ کر وسیلہ کی خوف سے آنکھیں پھیل گئیں۔ دونوں ہاتھوں پر بڑے بڑے سرخ دھبے جو پانی پڑنے سے سفید چھلکوں جیسے دیکھ کیا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"یہ کیسے ہوا۔ وسیلہ سے..... نہیں۔ اور اس طرح آرام سے کیا ہوا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ ..... کس نے؟ جلایا کیسے۔ اور۔ جلنی لکڑی؟" "وہ گھبراہٹ میں اسی پر چیخے بولی کیوں ڈالا۔" یہ ہاتھ تو ابھی بھاگ کر ڈریسنگ وغیرہ کا سامان بھی لائی۔ تب بھی فیروزہ کے زخموں پر وہ خود ہی لگانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے دونوں ہاتھوں پر یوب کا لیپ لگا دیا۔

"اب بتاؤ بھی کب جلیں تم۔ اور بندہ فوراً ہی چیخ اور رب کو خود کرتا ہے، تم برتن بھی دھونے لگیں۔" وسیلہ نے ایک نظر چولہے کی طرف بھی دیکھا، وہ بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ فیروزہ کے ہاتھ کیسے جلے۔

"یہ تو گھر میں جلے تھے باجی۔ اب تو درد بھی ختم ہو گیا تھا، بس ابھی پانی پڑنے سے۔"

"تو پہلے کیوں نہیں بتایا، اتنے سے برتن تھے، میں خود دھو لیتی۔ اور گھر میں کیسے جل گئیں، چھٹی کر لیتیں۔"

"اب روز روز کیا چھٹی کرنا۔" وہ ہاتھ چھڑا کر جھجک سے اٹھ کھڑی ہوئی اور وسیلہ نے اس کے کہے پر غور کیا۔ امی اور اس کی آپس کی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں، اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ فیروزہ کا شوہر مار پیٹ کرتا ہے۔ لیکن ہاتھوں کا جلنا۔ سوچ کر پریشانی ہوئی کہ کچھ باتیں ہم کیسی بے دھیانی سے گزار جاتے ہیں اور جن پر سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا ہے۔ وہ...... وسیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور شانوں سے پکڑ کر فیروزہ کو کرسی پر بٹھایا۔

"بتاؤ، کیسے جلا ہاتھ، جھگڑا ہوا تھا شوہر سے؟"

"جھگڑا کب نہیں ہوتا۔" وہ نیچے دیکھنے لگی۔

"کس بات پر جھگڑا ہوتا ہے؟"

"بس کھانے کمانے کے رونے ہیں۔ مکان کا کرایہ لینے کے ہاتھ پر رکھنے کی بھول کر دی، چار دن پہلے کام پر سے جمع کر کے بھی لگایا تو پیسہ ادا ہو گیا، پر مجھے کیا پتا تھا یہ اپنا چھوٹے چاولوں کا سامان پورا کر رہا تھا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا، چھوٹے ابل رہے تھے۔ میں نے غصے سے جلتی لکڑیاں باہر نکال دیں کہ جب چھوٹے پلاؤ سے کمائی کچھ نہیں ہوتی تو ریڑھی لگاتے ہی کیوں ہو۔ بس یہی بھول ہوگئی۔ اس نے وہی جلتی لکڑی میرے ہی ہاتھوں پر مسل ڈالی۔"

"سنگی کیوں ہو...... ایسا ظلم تو کوئی جانور پر بھی نہ کرے......" وسیلہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "ظالم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس بے چاری کی کمائی بھی تو ان ہی دو ہاتھوں کی بدولت ہوتی ہے۔"

"سہوں نہیں تو اور کیا کروں، بچوں کا باپ ہے، رہنا تو ہے اس کے ساتھ۔"

"ارے پر اتنا سبق تو سکھانا چاہیے کہ کم از کم ہاتھ نہ اٹھائے۔"

"سبق کیسے سکھا سکتی ہوں باجی، وہ مرد ہے۔"

"پولیس میں رپورٹ کروانی چاہیے، تم جیسی بے وقوف عورتوں کی وجہ سے ان کو شہ ملی ہوئی ہے، کوئی ایک بھی آگے آنے کے لیے تیار ہو تو آس پاس کے دس مرد اپنے آپ سدھر جائیں۔"

"باجی آپ قانون پڑھی ہوتا، اس لیے قانونی باتیں کرتی ہو۔" فیروزہ ایک دم ہی ہنس پڑی "اصل زندگی میں یہ سب نہیں ہو سکتا۔"

"یہ لو، ہو کیوں نہیں سکتا، وکیلوں کے پاس جو کیس آتے ہیں، یہی ارد گرد کی کہانیاں تو ہوتی ہیں، تم ایک بار جرات تو دکھاؤ۔"

"نہیں باجی!" فیروزہ نے قطعی انداز میں سر نفی میں ہلایا۔ "طلاق دے کر فارغ کر دے گا۔ زندگی اور برباد ہو جائے گی، کون سا میرے میکے میں محل کھڑے ہیں، سب سے پہلے بھائی منہ پھیر جائیں گے۔ ادھر طلاق والی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور "اچھا بابا، سمجھ گئی، وسیلہ نے ہاتھ جوڑے تو فیروزہ ہنس پڑی۔

"بس باجی۔ یہی میرا نصیب ہے۔ امی جی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گزارا کرنا ہے۔"
"نہیں پھر اتنی آسانی سے تو میں بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں۔" وسیلہ کی شوخ آنکھوں میں کسی آئیڈیے کی چمک تھی، جاتی ہوئی فیروزہ چونک کر واپس پلٹی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا۔"
"بالکل فکر مت کرو۔ تم پر آنچ بھی نہیں آنے دی اور بندہ بھی تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔"
"لیکن۔"
"چلو......" وسیلہ نے مصنوعی غصے سے انگلی سیدھی کی اور وہ بے بسی کی سی کیفیت میں بمشکل سادھے واپس پلٹ گئی۔
"ہوں......" وسیلہ نے دونوں ہاتھ سامنے باندھے۔ کچھ دیر ساکت کھڑے وہ ترکیب کی ایک سوچ اور پھر یک لخت ہنس کر سر جھٹکا۔ فیروزہ کے بنگلے میں جانے کس کس کے فائدے پیچھے تھے۔ وہ گلاب واقعوں میں دبائے ہنسی روک رہی تھی پر رکنا محال تھا۔ کان کھجاتے اس وقت ایلیا کے کمرے میں آئی۔
"وہ...... تمہارے پاس رمشہ کا نمبر ہے؟ ذرا دینا۔"
"رمشہ......" ایلیا نے جیسے دماغ پر زور دیا۔
"ارے یار رمشہ، بیوقوف وہ اپنے پولیس مین کی سسٹر۔" وسیلہ نے محسوس کیا کہ پولیس والے کے ذکر پر کیا شک ہوا تھا زبان اٹکی تھی اور دل۔
"اوہ اچھا۔" ایلیا کی آنکھوں میں شرارتی سی چمک آئی۔ "کس سے کام ہے؟ رمشہ، بیوقوف یا۔"
"ہاں ٹھیک سمجھیں ان ہی پولیس والے بھائی سے کام ہے۔" وسیلہ نے لہجہ روکھا بنانے کے لیے سخت زور لگایا۔
"ارے دلچسپ۔" ایلیا نے دانت نکالے۔
"بار فضول نہ سنواؤ۔ مجھے فیروزہ کا معاملہ ڈسکس کرنا ہے۔ تم نے اس کے ہاتھ دیکھے ہیں، جاؤ ذرا دیکھو۔"
"اچھا مطلب تمہیں نمبر دے کر میں باہر بھی چلی جاؤں؟" ایلیا بالکل باز نہیں آئی [illegible] آگئی۔
"نمبر تو ابھی دیا ہی نہیں۔"
"موبائل سے لے لو، ایک ہی رمشہ ہے کونٹیکٹس میں۔"
وہ کیبل سے نکل کر باہر چلی گئی۔ وسیلہ نے پلنگ کے کنارے بیٹھ کر رمشہ کا نمبر نکالا [illegible] بے چینی سے چبائے جا رہی تھی۔ حالانکہ ابھی تو صرف رمشہ کا نمبر ملا تھا۔ پر ابھی سے گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔
"ہیلو رمشہ۔ السلام علیکم۔ میں وسیلہ بات کر رہی ہوں۔"
"ارے وسیلہ۔ کیسی ہیں۔ کب سے سوچ رہی تھی، کیسے رابطہ کروں۔ میری نالائقی دیکھو وسیلہ نے نمبر بھی دیا تھا لیکن میں کہیں گم کر بیٹھی۔"
رمشہ نے وسیلہ سنتے ہی بے تکان بولنا شروع کر دیا۔ وسیلہ اس کی بے تابی دیکھ کر خوش ہو گئی۔ اس نے تو کبھی ادھر سے کال کی تھی سو اب تو کہتے ہوئے بھی جھجک ہو رہی تھی۔
"اور سناؤ بیوقوف ہانی کیسی ہیں؟"
"ٹھیک ہیں [illegible] ہے۔ کچھ دن پہلے دوبارہ کال [illegible] آپ [illegible] کا بس پروگرام ہی بناتے رہ گئے۔"
"لے آتا تھا ان کو [illegible] سب سے ملاقات ہو جاتی۔"
"بس یار [illegible] نہیں ہو پایا۔ [illegible] ہفتہ گزر گیا۔"
"تم بھی تو بالکل نہیں آتیں۔"
"یہاں بس...... منصب کے کھانے ہی منصوبہ [illegible] تھکی آ جاتی ہیں۔ پھر تو دو دن تک فراغت ہی نہیں ہوتی۔"
"کیسی ہے نتھی اور اس کی ماں؟"
"ہاں اچھی ہیں...... ابھی بھی کام میں لگی ہیں۔"
"اچھا منصورہ کے ذکر پہ مجھے ایک کام یاد

آیا۔" وسیلہ نے سجاوٹ سے آغاز کیا۔ "وہ اصل میں آپ [illegible] فیروزہ تو اس کا ایک ذاتی [illegible] کیس کی تھوڑی مدد درکار تھی۔ میں نے [illegible] کہ اس معاملے میں اس کی کچھ رہنمائی [illegible] سے پوچھ لوں گی۔"
"بالکل، میں بھی پوچھ سکتی ہوں اور چاہو تو فیروزہ کی منصب سے بات کروا دو وہ خود زیادہ اچھی [illegible] بتا سکیں گی۔"
"اچھا پھر نمبر دے دو بھائی کا۔" وسیلہ جانتی تھی فیروزہ تو ابھی پولیس والے سے بات نہیں کرے گی، بلکہ وہ [illegible] کر رہی تھی [illegible] چاہتی تھی۔ منصب [illegible] خود ہی کسی ڈھنگ سے یہ بات کرتا تھی۔ رمشہ سے ادھر ادھر کی بے شمار باتوں کے بعد بالآخر تھکے ہار بعد دونوں نے ایک دوسرے سے اجازت لے لی۔

☆☆☆

[illegible] آج [illegible] بارھواں دن تھا۔ خان اکبر [illegible] طرح سے اس کے [illegible] خان اکبر [illegible] موشنوں کی [illegible] جانے میں خوشی [illegible] جہاں خاص کھانوں کی [illegible] سے تیار کرو [illegible] ارحم نے بارہ دن یہاں آرام کرنے [illegible] ان بارہ دنوں میں [illegible] ایک [illegible] تو ایک گھر اور اس [illegible] کام [illegible] کے اصل [illegible] ارحم کے [illegible] ہوا تھا۔ [illegible] ہوئے [illegible] سوچ رکھا ہے۔ [illegible] اب تک اس [illegible] تھا جو وہ سوچ لیا کرتا [illegible] دل بہلانے وہ [illegible] میں جو نئے

کے پورے اعتماد کے ساتھ آپ کو آگے بڑھنے پر ابھارتے ہیں۔ ارحم کی شخصیت کو اس کے ماحول و پرورش نے ایسا بنا دیا تھا کہ کوئی اسے اپنے راستے کا پتھر بھی نہیں لگی [illegible] تھی۔
خان اکبر نے کام پر نکلتے وقت اسے روڈ کنارے ڈراپ کیا اور اب وہ اپنے مرحوم چچا احمد جمال کے بنگلے کے سامنے کھڑا اس کی دور تک بکھار رہا تھا۔
"جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟" فیروزہ دروازے پر کھڑے اجنبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"مجھے وسیلہ بی بی سے ملنا ہے۔ وکیل ہیں نا وہ۔ کچھ ضروری کام ہے۔" ارحم نے شکل پر بھرپور سنجیدگی طاری کرتے لہجہ سادہ اور رواں رکھا۔ فیروزہ پہلے تو سر ہلاتی واپس اندر چلی گئی اور پھر کچھ دیر بعد اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔
"السلام علیکم......" وسیلہ جب اندر آئی تو اس کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آئی کیونکہ کسی کلائنٹ کے آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ابھی تو اس نے پریکٹس ہی شروع نہ کی تھی۔ کلائنٹس کا آنا ان کے ہاں معمول کی بات نہ تھی۔
"وعلیکم السلام۔" ارحم فی الفور مؤدب سا اٹھ کھڑا ہوا [illegible] سا جھک کر سلام کا جواب دیا اور ان دونوں کے بیٹھ جانے کے بعد ہی واپس بیٹھا۔
"جی فرمائیے آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟" وسیلہ نے سوچ لیا تھا کہ کیس کسی بھی نوعیت کا ہوا وہ معذرت ہی کرے گی۔ کیونکہ ابھی وہ لائسنس ہولڈر نہیں تھی۔
"معافی چاہتا ہوں، مجھے آپ کی وکالت کا [illegible] میں جانتا ہوں ابھی آپ کی وکالت [illegible] ہے۔" ارحم نے ہلکا سا مسکرا کر وضاحت کی تو وسیلہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"[illegible] تھا آپ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائیں گی، لیکن آپ کی آنکھوں میں جھلکتی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اجنبیت اب مجھے نروس کر رہی ہے۔" ارحم کے لبوں پر ہنوز ہلکی مسکان تھی۔ وسیلہ نے پھر گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ کچھ عجیب و غریب قسم کا مہمان تھا۔

"بیٹا! آپ کھل کر بتا دیں گے، آپ کون ہیں اور آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے۔" رضوانہ نے لب کھولے تو چہرے پر سنجیدگی اور لہجے میں کھردرا پن اتر آیا۔ اندر سے وہ کچھ گھبرا بھی رہی تھیں۔ دل میں تہیہ کیا کہ بنا جانچ پڑتال کسی بھی اجنبی کو آئندہ وہ ہرگز اندر نہیں بلائیں گی۔

"بیٹا! بلانے کا بہت شکریہ، کاش میں نے گزرے چوبیس برس میں یہی پکار مسلسل سنی ہوتی۔"

"چوبیس برس—" رضوانہ کا سانس رُکا۔

"میں ارحم کمال ہوں چچی جان۔ برسوں بعد آپ کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"تت.....تم......" رضوانہ مارے گھبراہٹ کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وسیلہ نے پریشان ہو کر ماں کی حالت کو دیکھا۔

"پلیز چچی! آپ یا چچا ... گھبرا رہی ہیں، میرا مقصد ہرگز آپ کو پریشان کرنا نہیں ہے۔ آپ پلیز بیٹھ جائیں۔" ارحم نے لہجے میں زمانے بھر کی مظلومیت سمو کر التجا کی اور رضوانہ نے بدقت اپنے اعصاب کو قابو میں کیا۔ دماغ جیسے آندھی طوفانوں کی نذر ہو رہا تھا۔ لیکن وہ خود کو پریشان ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ گہرا سانس لیتے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔

"مجھے ابھی بھی حیرت ہے کہ وسیلہ نے مجھے پہچانا کیوں نہیں۔ میں یہاں خونی رشتے کا اگر صرف ایک حوالہ لے کر آتا تو وسیلہ سے قطعی اس بات کی امید نہ لگاتا کہ وہ مجھے پہچان لے، کیونکہ چوبیس برس پہلے تو شاید وسیلہ کی پیدائش ہوئی ہو۔ دراصل وسیلہ اور میں یونیورسٹی فیلوز رہے ہیں۔ اگرچہ میں ان سے دو سال سینئر تھا لیکن ہمارا دو سال کا ساتھ رہا اور میرا خیال تھا کوئی دھندلا سا عکس ضرور ان کی آنکھوں میں لہرائے گا۔ کیا آپ کو واقعی یاد نہیں وسیلہ! میں آئی ٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔"

"آئی ایم سوری، مجھے واقعی یاد نہیں تھا۔" وسیلہ کو اس لڑکے کی بے تکلفی پر حیرت تھی۔ وہ اسے یونی فیلو کی حیثیت سے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا مگر اس کے لیے یہ چہرہ قطعی اجنبی تھا۔

"کوئی بات نہیں، آپ کی لاتعلقی بھی آپ کی شخصیت پر جچتی ہے۔" وہ متاثر کن انداز میں مسکرا کر پھر رضوانہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں زیادہ تو نہیں جانتا چچی جان کہ چوبیس برس پہلے وہ کیا حالات رہے ہوں گے جن کی بنا پر ایسے قریب کے خونی رشتوں میں اس قدر دوریاں آ گئیں لیکن آج برسوں گزر جانے پر اپنے آپ کو ایک خاندان کا ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت سے اتنا ضرور سمجھ سکتا ہوں کہ وقت کی گرد ڈھانپ لینے کا گر بخوبی جانتی ہے، بہت پیچھے کو دوبارہ ... آئندہ کل کی بنیاد بن سکتا ہے۔ دادی جان، امی سب اپنی جگہ پر ہیں لیکن وقت اور حالات نے انفرادی طور پر بہت کچھ بدل دیا ہے۔"

"اماں جی کیسی ہیں؟" رضوانہ کی آنکھوں میں شفیق سی ماں جی کا سراپا ابھرا تو پلکوں پہ نمی اتر آئی۔ وہ اس حویلی کی مہربان بزرگ تھیں، اور انہیں سن کر خوشی ہوئی کہ الحمدللہ خیر و عافیت سے ہیں۔ ساس کا گھر اگرچہ انہوں نے چوبیس برس پہلے چھوڑا تھا لیکن جمال اپنی ماں سے ملنے اپنی وفات کے وقت تک جاتے رہے تھے۔ جمال کا جنازہ جب تایا بھائی حویلی لے گئے تو رضوانہ عدت میں ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں گئیں۔ پچھلے گزرے چوبیس سالوں میں دل کو ایک دم پتھر بنا دیا تھا۔ زندگی کو آگے بڑھانے کی ڈگر پر چلاتے وہ بہت آگے نکل آئی تھیں لیکن اماں جی کا اس سب میں کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ اس رات اپنا آپ بچا کر نکلتے وہ اُن کو بھی اپنے ساتھ لے آتیں تو آج ان کے بچے اس محبت بھری چھاؤں کے سائے تلے وقت گزار رہے ہوتے۔"

"دادی بالکل ٹھیک ہیں، اور یقین کریں کوئی دن ایسا نہیں گیا جب انہوں نے آپ سب کو یاد نہ کیا ہو۔"

ارحم جو دادی کے ذکر پر کھل اٹھا، جبکہ رضوانہ اس کے سامنے بیٹھی تاثرات میں حیرت سے کچھ کھوج رہی تھیں۔ وہ لڑکا جس گود میں پل کر جوان ہوا تھا، کہیں اس کا پرتو کیوں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ارحم کمال احمد تھا، کمال اور شہناز کا بیٹا۔ تو پھر اس کی باتوں میں اماں جی کی خوشبو۔

"امی کہتی ہیں میں بالکل اپنی دادی جان پر گیا ہوں، بلکہ بابا تو کہتے تھے ارحم کی صورت میں مجھے اپنا چھوٹا بھائی جمال واپس مل گیا ہے۔" ارحم بولا تو جیسے رضوانہ کو بنا پوچھے اپنی بات کا جواب مل گیا وہ بس اپنی جگہ ساکت الجھی سی رہ گئیں۔ وسیلہ اس دوران کمرے سے باہر چلی گئی۔

مہمان اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس نے خاطر مدارات کے ساتھ ساتھ تحریم اور ایلیا کو بھی تیار کیا کہ ان کا اتنی مدت بعد ایک اپنا ملنے آیا ہے۔ انہیں بھی آ کر تعارف حاصل کرنا چاہیے۔

وہ جب ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو اس کی ماں کے چہرے سے گھبراہٹ رخصت ہو چکی تھی۔ وہ ارحم کے ساتھ بہت ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ تحریم اور ایلیا سے بھی ارحم کی بہت اچھے ماحول میں بات چیت ہوئی۔ ہاں اگر کہیں یاد آئی تو بس ایک بات کہ آخر حویلی میں بھی کیسے وہ اس کے بڑے ہوئے، یہ نہیں پایا تھی اور اگر دیکھا تھا تو یاد کیوں نہیں آ رہا تھا...... خیر۔

اس نے خود ہی اپنے وہم کو رد کیا۔ وہ آس پاس کے لوگوں پر نظر رکھنے کے معاملے میں ویسے بھی اچھا کوری تھی۔ ارحم سے اُس شام ان سب کی ملاقات بہت خوشگوار رہی۔ وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ مینگورہ میں وہ اپنے ایک دوست خان اکبر کے ساتھ چمڑے کا کاروبار شروع کر رہا ہے اور فی الحال یہیں پر ہے۔

"ارحم سے مل کر ایسا لگا تو نہیں امی کہ ماضی میں آپ کے حالات کسی سنگین نوعیت کے رہے ہوں گے کہ تو پھر چوبیس سالوں کی اتنی سخت دوری۔ ایسی کہ ہمارا بھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہی نہیں رہا، حتیٰ کہ ہماری سگی دادی۔"

"ہاں، مجھے افسوس ہے کہ میرے بچے اپنی دادی کے سایہ شفقت میں نہیں پل پائے۔" رضوانہ نے ایک آہ بھری۔ "لیکن یہاں میں بہت مجبور ہو گئی تھی، کیونکہ اس رات ہمارا حویلی سے نکلنا تمہاری دادی کا فیصلہ تھا۔ اور ان ہی نے منع کیا تھا کہ ہم کسی انجان جگہ پر چلے جائیں، ہمارا پتا ٹھکانا حویلی والوں کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"حویلی والے۔ مطلب۔ ارحم کے والدین؟" وسیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں.....شہناز بھابی اور کمال بھائی کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ چھپ کر نکلنا ناگزیر ہو گیا تھا۔"

"بابا تو ویسے جاتے رہتے تھے۔"

"ہاں۔ وہ ان کا گھر تھا پھر وہاں ماں تھی ان کی۔ شاید اماں جی کو ہماری یہاں رہائش کے متعلق بھی معلوم ہو، لیکن اس بات کو کمال بھائی وغیرہ سے پوشیدہ رکھتا تھا۔ ہمارا پرانا گھر چونکہ سیدو شریف میں تھا تو وہاں سب یہی سمجھتے تھے کہ ہم ابھی تک وہیں ہیں۔"

"ایسی کیا بات ہو گئی تھی؟ جبکہ آج ان ہی کا بیٹا اچانک کیسے نہ صرف ہمارے سروں پہ پہنچ گیا بلکہ اس کے نزدیک تو بات ہی کوئی نہیں۔"

"ہاں، شاید اس کا ایسا سوچنا جائز بھی ہے۔ جیسے میرے بچے نہیں جانتے کہ اس وقت کیا حالات بن گئے تھے، ارحم بھی تو تم سب جیسا بچہ ہے۔ اس کے انداز بتاتے ہیں کہ وہ ہر بات بھول کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اور شاید وہ اپنی ماں کو بھی اسی ڈھنگ سے تیار کر کے آیا ہو۔"

"تو کیا واقعی سب پہلے جیسا ہو جائے گا، ہم

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنی دادی سے مل سکیں گے۔"

"اللہ نہ کرے سب کچھ پہلے جیسا ہو۔" رضوانہ نے بے ساختہ خوف بھری جھرجھری لی تو وسیلہ ٹھٹک گئی۔

"میرا مطلب ہے، آج حالات وہ نہیں ہیں۔" رضوانہ نے فوراً خود کو سنبھالا "ارحم ٹھیک کہہ رہا تھا، وقت ہر اچھے برے کو ڈھانپ لیتا ہے۔ وہ وقت تو گزر گیا، جب تمہارے بابا نے اپنی مرضی کا فیصلہ کیا اور آنے والے کچھ سال ہم دونوں نے مخالفتوں کا سامنا کیا۔ اب تو تمہارے بابا بھی دنیا میں نہیں رہے، وقت یقیناً بدل گیا ہے۔"

"اور آگے بھی سب اچھا ہوگا۔ ان شاء اللہ۔" وسیلہ نے مسکرا کر ماں کا ہاتھ دبایا تو رضوانہ نے مسکرا کر پلکیں موند دیں۔

☆☆☆

امین کو ابرو سے باہر جانے کا اشارہ کر کے منصب نے [illegible] اور دوبارہ اپنی توجہ موبائل فون کی جانب مبذول کی، جہاں وسیلہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"آپ نے واقعی ایل ایل بی کیا ہے؟" انداز ایسا اچنبھے بھرا تھا کہ وسیلہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھتے وہ بھی جھجکے سے باہر نکل آئی۔ ابلیا کا مسلسل گھورنا اسے نروس کر رہا تھا۔

"جی بالکل اصلی والی وکالت کی ہے۔ لیکن ابھی میں بہت مجبور ہوں، وہ فیروزہ بالکل ساتھ دینے کو تیار نہیں۔"

"ہوں، تو یعنی جو غیر پیشہ ورانہ رویہ آپ اپنا رہی ہیں، اس وردی والے سے بھی اس کی توقع چاہ رہی ہیں؟"

منصب کا غصہ قطعی مصنوعی لیکن آواز کا رعب ایسا تھا کہ وسیلہ کو بے اختیار چپ لگ گئی۔ فیروزہ کا قصہ تفصیل سے منصب کو بتانے کے بعد وہ اب یہ چاہ رہی تھی کہ منصب کسی طرح فیروزہ کے شوہر کو دھمکائے۔ اور "کس طرح" کی تفصیل بھی وہ منصب کو بتا چکی تھی۔ فیروزہ ہرگز شوہر کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے حق میں نہ تھی۔ وسیلہ نے سوچا کہ فیروزہ اور اس کے شوہر سعید کے جھگڑے کے وقت منصب اچانک اپنی پولیس والی وردی میں انٹری مارے اور یوں ظاہر کرے کہ وہ اس ایریا میں کسی اور معاملے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا اور عورت پر مار پیٹ ہوتے دیکھ کر وہ سعید کی خوب اچھی طرح خبر لے۔ اس سے فیروزہ بھی شوہر کے عتاب سے بچ جاتی اور سعید خان بھی آئندہ جسمانی تشدد سے پہلے سو بار سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور فی الوقت وسیلہ کا اصل مقصد صرف ایک ہی تھا کہ فیروزہ کا شوہر اس سے مار پیٹ نہ کرے۔

"اچھا یہ بتائیں کہ عین جھگڑے کے وقت میرا نزول کیسے ہوگا۔ یا پھر میری آمد کی خوشی میں جھگڑا اسٹارٹ ہوگا۔" منصب کے مزاج پر شوخی تو کال آتے ہی چھا گئی تھی۔ اب وہ سوال پوچھ پوچھ کر صرف بات کو طول دے رہا تھا بلکہ وسیلہ کو بھی بری طرح زچ کر چکا تھا۔

"نہیں نہیں...... وہ...... اصل میں ایسا ہے کہ فیروزہ کا جیسے ہی اپنے میاں سے جھگڑا شروع ہوگا، وہ مجھے مس کال کر دے گی اور میں فوراً آپ کو بتا دوں گی۔"

"اور میں بھی فوراً چل پڑوں گا۔ کیا یہ واقعی اتنا آسان ہے؟"

"ہاں جی۔ آسان تو ہے نا۔" وسیلہ اس کی غیر سنجیدگی دیکھ کر اب خائف ہونے لگی۔ "پولیس اسٹیشن کتنا تو قریب ہے ہمارے گھروں سے۔ پھر فیروزہ کی گلی یہ عین ہمارے گھر کی بیک پر تو ہے۔ بس چوتھا نیلا دروازہ ہے۔"

"ہوں۔" منصب نے بالآخر وسیلہ کے مدعے پر سنجیدگی اختیار کر ہی لی "اوکے، ٹھیک ہے۔ میں آپ کی طرف سے کال کا منتظر رہوں گا۔ بس خیال رہے کہ وہ فیروزہ نہ بھانڈا پھوڑ دے۔ مجھ سے زیادہ آپ کے لیے مشکل بن سکتی ہے۔ باقی آپ سمجھدار

"جی...... جی......" وسیلہ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں موبائل اسکرین کو دیکھنے لگی۔ پتا نہیں منصب کے آخری جملے کا کیا مطلب ہے۔ وہ [illegible] کر فیروزہ کو بتانے چل پڑی۔ اس کا میاں تو [illegible] شام کے حساب سے جھگڑا کھڑا کرنے کی [illegible] تھا۔ منصب کو کال کرنے کی نوبت کسی بھی [illegible]

☆☆☆

"یہ سب آپ لائے ہیں موسن؟" تحریم ایک ایک چیز کو بار بار اٹھا کر دیکھتی، پھر بے یقینی سے موسن کو۔ پچھلے روز وہ ایک کورس کے سلسلے میں [illegible] گیا تو واپسی پر بچوں کے لیے [illegible] ساری شاپنگ بھی کر آیا۔ بظاہر لاتعلق دکھائی دیتا موسن اندر سے کتنا حساس، کتنا جذباتی تھا۔

"کمال ہے، مختصر سے وقت میں آپ نے اتنی شاپنگ بھی کی اور چھوٹی چھوٹی باریکیوں کا خیال رکھا اور سائز۔" وہ پھر ایک بے بی ڈریس ہاتھ میں لیے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

موسن نے نومولود بچوں کے کپڑے نہ صرف [illegible] سائز کے لیے تھے بلکہ موسم کی مناسبت کا بھی خیال رکھا تھا۔

"بہت خوب صورت بے بی کاٹ اور بے بی [illegible] رکھے تھے۔ میں نے ان کی صرف تصویریں [illegible] اب تم تو سفر نہیں کرو گی تو تصویر [illegible] ترتیب دے آؤں گا۔"

موسن نے بات کے دوران موبائل کھول کر تصویریں دکھانا شروع کیں۔ اور یہ وہ چیزیں [illegible] جن کا اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔

"ہوں...... اور بچوں کی اماں کے لیے کچھ نہیں؟" تحریم کی آنکھوں میں محبت بھرا شکوہ تھا۔

"بچوں کی اماں ذرا فری ہو لے، ان شاء اللہ [illegible] ساری شاپنگ کرواؤں گا۔"

"[illegible] کہتے ہیں۔ سب کچھ بعد میں بنواؤں گی۔"

"ویسے وہ "بعد" کچھ چار پانچ سال بعد آئی ہے۔" موسن اسے بغور دیکھتے قطعی سنجیدگی سے بولا تو وہ چونکی۔

"کیا مطلب...... چار پانچ سال؟"

"جی ہاں میڈم؟" موسن نے پیار سے اس کی ناک پر انگلی بجائی "یہ جو شرافت سے اندر بیٹھے ہیں نا۔ انہوں نے تمہارے ہوش تک اڑا دیے تھے، فیشن تو بڑے دور کی بات ہے تمہیں روٹین کی چوٹی بھی بھول جاتی ہے۔"

"توبہ ہے موسن، آپ کو تو کتنا کچھ پتا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کسی تجربے کار دایہ سے بات کر رہی ہوں۔"

"بدتمیز......" وہ بے اختیار ہنس دیا "چلو اب فی الحال تم یہ سب سامان باقیوں کو دکھا کر خوش ہوتی رہو، میں ذرا فریش ہو جاؤں۔"

☆☆☆

وسیلہ نے چھوٹی دیوار سے اندر جھانکا، فیروزہ اپنے صحن کے بیچوں بیچ کھڑی دوپٹے کے کونے میں روپے لپیٹ رہی تھی۔

"پرائے گھروں میں تانکا جھانکی سخت گناہ ہے۔"

"ہیں۔ وہ۔ آآآئی۔" وسیلہ بوکھلا کر مڑی تو کہنی منصب کے ڈنڈے سے جا ٹکرائی۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی منصب کو کال کر کے وہاں بلایا تھا۔ فیروزہ آج اپنی تنخواہ گھر لائی تھی۔ اور بقول فیروزہ آج گھر میں جھگڑا ہونا لازمی ہے کیونکہ اس کا شوہر بنا مکان کے کرائے اور راشن پانی کی پرواہ کیے اس سے تنخواہ طلب کیا کرتا تھا۔ تب ہی وسیلہ اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کے گھر کے باہر آ گئی اور منصب کو بھی بلا لیا۔

"اوہو۔ زور سے لگ گئی؟" منصب نے گھبرا کر ڈنڈا پیچھے کیا۔

"نہیں، ٹھیک ہے۔" وسیلہ نے کہنی سہلا کر

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اپنی شال درست کی۔ براؤن اور بلیک کلر کے کپڑوں میں اس کی رنگت کچھ اور کھلی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ منصب نے غور کر دیکھنے سے گریز کیا۔

"جی تو کب چھاپہ مارنا ہے؟"

"چھ...... چھاپہ......" وسیلہ کی آنکھیں پھیل گئیں "یہ چھاپے وغیرہ سے تو اس کے شوہر کو شک ہو جائے گا۔" وہ بادیا چلائی۔

"بھئی، اس کو بھی چھاپہ ہی کہتے ہیں، پریشان نہ ہوں۔"

"اور آپ اس کو کہیں گے کیا...... آں...... آپ کہیں یہاں قریب چوری ہوئی تو تفتیش۔"

"پولیس کو وضاحت دینے کی کیا ضرورت، اس طرح تو پولیس والا ہی چور لگے گا...... نہیں؟" جانے وسیلہ کے چہرے میں ایسا کیا تھا، منصب کا دیکھتے ہی مزاج شوخ ہونے لگتا۔

"ارے لیکن اس طرح تو سعید یہ سمجھے گا کہ آپ اسی کی خبر لینے آئے ہیں، اور پھر فیروزہ کی خیر نہیں۔" وسیلہ کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ منصب کو بھی فوراً احساس ہوا۔

"اچھا ٹھیک ہے، کہہ دیں گے کسی بہانے۔ لیکن اس سے سلوک کیا کرنا ہے، اتنا سبق تو سکھانا ہی چاہیے کہ آئندہ وہ بیوی سے ہاتھا پائی نہ کرے۔"

"جی وہ تو ضروری ہے۔"

"او کے۔ تو ہاتھ پیر توڑ دوں؟" منصب کا انداز یکدم نارمل تھا۔

"توڑ پھوڑ......" وسیلہ چلا اٹھی۔ "نن نہیں نہیں...... بس ہلکا سا ڈنڈا ماریں۔"

"ہلکا سا ڈنڈا؟" منصب نے غصے سے ہاتھ کمر پر رکھا۔ "ہمیں تو پریکٹس میں بھی ہلکا ڈنڈا نہیں سکھایا گیا، تاکہ کسی کو تو ہم از کم تو نہیں گی۔"

"نا...... نہیں۔ ہائے نہیں...... ارے وہ فیروزہ ٹوٹی ٹانگوں والے شوہر کا کیا کرے گی۔" وسیلہ نے خوف سے تھوک نگلا۔ منصب کو بلا کر وہ سو فیصد پچھتا رہی تھی۔

"ہوں...... تو ہاتھا چھوڑ دیتا ہوں، [illegible]" دیکھیے گا وہ سعید تو مشغل لٹکانے آجائے گی۔ [illegible] اب مکمل تنگ کر کے حقے لے رہا تھا، [illegible] محترمہ اس کی باتوں کو سخت سنجیدگی سے لے رہی تھیں۔

"نہیں نہیں...... خون نہیں...... پلیز...... آپ واپس جائیں۔ میں کچھ اور سوچتی ہوں۔" اسے منع کرتے وسیلہ کا واضح ہاتھ کانپا تھا۔ منصب نے مسکرا کر اس کی کانپتی کلائی کو دیکھا، وسیلہ کی معصوم طبیعت پر دل بے طرح پگھلا، کچھ دیر محبت سے اس کا چہرا دیکھتے ہی دیوار سے کندھا ٹکا دیا۔

"زندگی بہت کٹھن ہے سویٹ ہارٹ، [illegible] نری خود اپنے ہاتھوں اپنا قتل کروانے کے مترادف ہے، سخت بننا سیکھیں، وقت بہت بے رحم ہے۔"

"واپس چلیں؟" وسیلہ نظریں چرائے اس کے طرز تخاطب کی زد میں تھی۔ منصب مسکرا کر سیدھا ہوا۔

"اونہوں۔" سر انکار میں ہلاتے سانس اندر کھینچا "آج تو آپ کو دیکھنا ہی ہوگا، سعید جیسے لوگ سیدھے کیسے ہوتے ہیں۔ اور آپ بنا کوئی شور دے چپ چاپ یہاں سے ویڈیو بنائیں۔"

"ویڈیو...... کہاں دیتی ہے؟" وہ پھر بوکھلا کر آگے بڑھی۔

"کہیں نہیں دینی، بعد میں بیٹھ کر دیکھنا کہ لائف میں سخت کیسے بنتے ہیں۔" منصب ابرو اونچا کر کے تدبر سے سمجھاتے آگے بڑھ گیا۔

چھوٹی دیوار سے سعید کو کمرے سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ بیوی کے ہاتھ میں رقم دیکھ کر جس کے تیور بدل رہے تھے، معاملات آج فیروزہ کے حق میں ہونے کو ہوئے۔

اور پھر اس سہ پہر ان دونوں کو آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں اپنا مقصد حاصل ہو گیا۔ سعید نے اونچا اونچا چلاتے پانچ منٹ میں ہی فیروزہ کی چوٹی ہاتھ میں لے لی تھی۔ غصے سے بیوی کو گھماتے

دیوار پہ دے مارتا جب منصب نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر اس پر ڈنڈے سے [illegible] سعید کی نظر پولیس کی وردی پر پڑی تو وہ رنگ فق ہو گیا۔ فیروزہ نے بال چھڑا کر جلدی سے چادر اپنے گرد اوڑھی اور منہ چھپا لیا۔ سعید اس بھاگ کر دروازے تک گیا، وہ حیرت سے منصب کو دیکھ رہا تھا۔

"میں بتاؤں، بالوں سے پکڑ کر دیوار میں کیسے مارتے ہیں...... ہوں؟" منصب نے ڈنڈے کی نوک اس کی ٹھوڑی میں چبھوئی تو سعید کی کراہ نکل گئی۔

"کیا کرنے والے تھے بیوی کے ساتھ؟" وہ سختی سے دھاڑا تو سعید نے سہم کر منصب کے پاؤں پہ ہاتھ رکھے۔

"معاف کر دو صاحب، غلطی ہو گئی۔"

"معافی تو اب تھانے جا کر ملے گی، ڈھونڈنے تو ایک چور کو آیا تھا، لیکن اس ایریے میں تو تم جیسے بدمعاش بھی پل رہے ہیں۔ عورت پہ تشدد کرا جاتے ہو۔ یا سمجھاؤں؟" منصب نے ڈنڈا لہرایا۔

"نہیں صاحب نہیں، آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔"

"جاؤ، معافی اپنی بیوی سے مانگو۔ اور یاد رکھو، مارپیٹ کرنے والے کے خلاف ہم بنا رپٹ کے کارروائی کر سکتے ہیں، اس لیے کسی بھول میں نہ رہنا، آج تو اتفاق سے گزر ہو گیا لیکن آئندہ میں آتا رہوں گا اور بنا کسی رپٹ کے تمہاری حرکات پہ نظر رکھوں گا۔"

"ہاں صاحب...... جیسا آپ چاہیں۔" وہ گھگھیانے لگا۔

"یہاں آؤ......" منصب نے ہاتھ لہرا کر فیروزہ کو قریب بلایا۔

"کیا کہتا ہے...... کیوں مار رہا تھا؟"

"نہیں صاحب، کچھ نہیں، معاف کر دیں اسے۔" فیروزہ نے عاجزی سے ہاتھ جوڑے۔

"شرم کرو...... بے غیرت......" منصب نے سعید کے کان پر چٹکی بجائی "اب بھی تمہیں بیچاری ہے۔ چاہتی تو میری اچانک آمد کا فائدہ اٹھا کر ایک کی چار لگا سکتی تھی۔ اور یہ ہاتھ میں کیا ہے۔ ہوں۔ رقم ہے۔ واپس کرو اس کے روپے۔"

"کمائی ہو تم؟" منصب نے انجان بن کر فیروزہ سے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

"خبردار جو آئندہ بیوی کی کمائی پہ نظر رکھی، اس کے لیے الگ سے دفعہ لگتی ہے۔ ایک بار تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔" وہ پھر سے سعید کا کان مروڑنے لگا۔ سعید گھبرا کر پھر اس کے قدموں پہ گر گیا

"نہیں صاحب...... کبھی کچھ نہیں مانگوں گا۔ مجھے اپنا نان چھولے کا ریڑھا کافی ہے۔"

"ہوں...... یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

وہ اس کا کان چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ وسیلہ نے موبائل نیچے کرتے ویڈیو روکی اور ہنستے ہوئے گلی سے باہر نکل آئی۔ اپنا گھر ڈھلان چڑھ کر تھا، منصب بھی سعید کو دھکا کر اس کے پیچھے پیچھے نکل آیا تھا۔ اپنے ساتھ وہ کسی کانسٹیبل وغیرہ کو نہیں لایا تھا۔

"اچھا تو وہ کون سی دفعہ ہوتی ہے۔ مطلب مارپیٹ پر بنا رپٹ کے ایکشن لینا۔" وسیلہ کا چہرا لگاتار ہنسنے سے گلابی ہو گیا تھا۔

"شکر ہے اپنے سعید میاں وکیل نہیں تھے، ورنہ یہ نکتہ وہاں سے اٹھایا جاتا تھا۔" منصب بھی تیز قدموں سے اس کے ساتھ آملا۔ وسیلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے میں شکر پڑھ رہی ہوں کہ سب کچھ بہت عمدہ طریقے سے ہو گیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے ڈیوٹی سے ہٹ کر ایک۔"

"شکریہ تو مجھے ادا کرنا تھا۔" وہ بالکل ہی بے ساختہ کہہ گیا لیکن پھر منہ پھیر لیا، بات سنبھالنا اب مشکل لگ رہا تھا۔ ادھر وسیلہ بھی حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔

"جی، وہ کیسے؟"

"کالام کے بعد تو پھر ملنا ہی نہیں ہوا۔" اس

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نے لہجے کو سرسری کرنے کی کوشش کی۔ وسیلہ مسکرا کر رہ گئی۔ اُسے آج پہلی بار معلوم ہوا کہ منصب کے ساتھ بات کرنے میں سہولت کیوں محسوس ہوتی تھی، وہ ہمیشہ اپنے اور اس کے بیچ ایسا لائٹ دوستانہ رویہ رکھتا کہ معنی خیزی کو جگہ ہی نہ ملتی، ورنہ وسیلہ کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی یونی میں اس نے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ بھی معمول کی گفتگو بھی کی ہو۔ منصب اس لحاظ سے پہلا مرد تھا جس سے بات کرکے اس نے کبھی اپنی سرزنش نہیں کی۔

"آپ نے مشکل میں آواز دی، کسی قابل سمجھا، میں ممنون ہوں، او۔۔۔۔ر۔۔۔۔" اس نے رُک کر شرارت سے کچھ سوچا پھر مسکرادیا۔ "چائے کے لیے کوئی اچھی سی ملاقات قدرت نے آئندہ کے کسی دن میں ضرور لکھی ہوگی۔ ابھی کے لیے خدا حافظ۔" وہ ہاتھ ہلاتے فوراً ہی ڈھلان اتر گیا۔ وسیلہ کچھ دیر تک مسکرا کر دیکھے گئی، پھر سر جھٹک کر گیٹ کے اندر آگئی۔

☆☆☆

"السلام علیکم دادی جان۔ میں ارحم۔" اس نے نہایت سعادت مندی سے خوب لجاجت سے آغاز لیا اور ہاجرہ بی بی حیرت سے موبائل کو دیکھے گئیں۔ پوتے کا ایسا پیار لٹاتا لہجہ، وہ سلام کا جواب دینا ہی بھول گئیں۔

"کیسی ہیں دادی جان۔۔۔ طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"میں ٹھیک ہوں ارحم بیٹا۔ تم کہاں ہو؟" وہ خوشی سے زیادہ فکرمند ہوگئیں کہ ارحم کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ پوتا جو گھر سے کچھ کہہ کر بھی نہیں گیا تھا اچانک اتنا مہربان کیسے۔

"میں ایک کام کے سلسلے میں میانوالی میں ہوں دادی۔ آپ کی بہت یاد آرہی تھی، دراصل ان دنوں مجھے میرے کھوئے ہوئے بہت سے رشتے واپس ملے ہیں، انجانوں کی قدر اپنوں سے دور جا کر نہیں، اپنوں کے بیچ آکر ہوئی ہے۔ آج احساس ہورہا ہے دادی! اگر آپ کے پاس رہ کر میں نے آپ کی شفقت اور محبت کے سائے کی کبھی ناقدری کی ہے تو مجھے تو ان تمام قیمتی لمحوں کا ایک ایک پل آپ کے قدموں میں گزارنا چاہیے تھا۔ اور اب میں ایسا ہی کروں گا دادی، بس ایک بار یہاں سے فارغ ہو جاؤں۔"

"کون سے رشتے؟" ہاجرہ ہکا بکا تھیں۔ ارحم کی کایا پلٹ تو انقلابی تھی۔

"دادی! مجھے جمال چچا کی فیملی مل گئی ہے یہاں۔ آپ سوچ نہیں سکتیں میں کتنا خوش ہوں۔"

"رضوانہ۔۔۔۔" دادی کے لبوں نے برسوں بعد ایک مانوس نام پکارا۔

"جی دادی، آپ کی بہو رضوانہ، آپ کی پوتیاں تحریم، وسیلہ، ایلیا۔۔۔۔ سب سے ملتا ہوا اور میں جلد از جلد آپ کو بھی ان سب سے ملوانا چاہتا ہوں۔"

"تم۔۔۔۔ خوش ہو ارحم؟" نہ جانے وہ بے یقین سی کیوں تھیں۔

"جی دادی، بہت خوش ہوں، اور کیسے خوش نہ ہوں دادی۔۔۔۔ وہاں تھانہ میں میرا ہم عمر بھلا تھا ہی کون۔۔۔۔ اکیلے رہتے میرا مزاج بھی روکھا، بدمزاج سا ہو گیا تھا۔ کاش یہ سب رشتے مجھے پہلے مل گئے ہوتے۔ آپ تو مجھے پہچان بھی نہیں پائیں گی دادی، میں بہت بدل گیا ہوں۔"

"ہاں ارحم مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔" ہاجرہ بی بی خوشی سے مسکرائی تھیں۔ ارحم کا بدلاؤ بے شمار خوشیوں کی نوید تھا۔

"اور مجھے کب ملواؤ گے ارحم؟" وہ پوری مچل گئیں۔ "رضوانہ کو یہاں لے آؤ۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔" وہ جھجک کر رکیں تو ارحم کے لیے سمجھنا مشکل نہ رہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں دادی، میں نے امی کو بھی سمجھا دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنے اب تک کے رویے پر بہت پشیمان ہیں۔۔۔۔ پھر اتنی طویل دوری کے بعد ابھی پرانی باتیں بھول چکی ہیں۔ اب سب مجھے سوائے ماضی کے ایک بھیانک باب کے اور کچھ نہیں لگتا، میں چاہتا ہوں آپ بھی ان کو سمجھائیں کہ بیتی باتوں کو فراموش کر دینے میں سب کی بھلائی ہے۔۔۔۔ ہے نا؟"

"ہاں بیٹا۔ یہی سچ ہے۔ بیتی باتوں میں کیا رکھا ہے، پھر اب تو جمال ہی نہیں رہا، گھر تو رضوانہ بیچاری کا بھی ٹوٹ چکا۔ اور ٹوٹے ہوؤں کو تو جوڑا جاتا ہے، ان کے زخموں پر تو مرہم رکھا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے شہناز بھی اپنا دل صاف کر سکے گی۔" ہاجرہ بی بی ارحم سے بھی زیادہ جذباتی ہو گئیں۔ ارحم نے مسکراتے ہوئے ان سے اجازت لی، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ بہت جلد انہیں ان کی بہو اور پوتیوں سے ملوانے لائے گا۔

☆☆☆

"مجھے بتاؤ آپی۔۔۔۔ کیا چاہیے؟" ایلیا اسے بیڈ سے اترتا دیکھ کر فوراً آگے بڑھی۔

تحریم کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا۔ اس سے چلنا پھرنا بھی مشکل تھا لیکن بیٹھے بیٹھے بھی پیٹھ اکڑنے لگتی، کبھی تو وہ تنگ آکر رونے لگ جاتی، عجیب بے بسی محسوس ہوتی اس حالت میں۔ نجانے دن بھی اتنے سست رفتار کیوں ہو گئے تھے۔

"کام تو کوئی نہیں ہے، بس بچوں کے روم تک جا رہی ہوں، سوچا اتنا نیا سامان آیا رکھا ہے، کچھ سیٹنگ ہی کرلوں۔ لیکن یہ دیکھو اتنا سا فاصلہ ہے اور مجھ سے چلا تک نہیں جا رہا۔"

تحریم اس کے ہاتھ پر دباؤ دیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ عزت ماسی اور وسیلہ نے کمرے سے متصل اسٹور روم کو بچوں کے لیے خالی کر لیا تھا۔ دو بچوں کے جھولوں، ڈھیر سامان نے کمرے کی حالت ابتر کر دی تھی۔ موسن الگ چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔ ایسے میں بھی ہر چیز نک سک سے اپنی جگہ پر اچھی لگتی تھی۔

اسٹور روم کا دروازہ بیڈ روم میں ہی کھلتا تھا۔

سارا سامان باہر نکال کر بڑے اسٹور روم میں ڈالا اور اس چھوٹے کمرے کو نیا کلر کروا کے اسے بچوں کے لیے سیٹ کرنے کا ارادہ کیا۔ اب تو تقریباً ہر چیز اچھی طرح ایڈجسٹ ہو گئی تھی۔ پچھلے روز ایک چھوٹی الماری بھی آگئی۔ اب اس میں بچوں کے کپڑے وغیرہ سیٹ کرنے تھے۔ ایلیا آئی تو اس کی مدد سے تحریم نے باقی سامان بھی سلیقے سے سیٹ کر دیا۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے آپی۔۔۔۔" ایلیا کی شوخ آنکھوں میں تحریم سے بھی سوا چمک تھی۔ کریم دیواروں والے اس چھوٹے سے کمرے کے پردے اور فرنیچر وغیرہ بے بی پنک کلر کے تھے۔ بے بی وارڈروب بھی بے بی پنک اور وائٹ کلر کی تھی۔ دیواروں پر فریم شدہ بچوں کی تصویروں کا سیٹ ایلیا خود لائی تھی۔

"اس دیوار پر اپنے بچوں کی تصویریں لگائیں گے، ہے نا آپی؟" وہ پانڈا شکل کا وال کلاک کیل میں لٹکا کر پیچھے دیوار پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔

"ہاں، میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" تحریم سنگل بیڈ پہ بیٹھی بغور دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ دو بے بی کاٹ کے ساتھ ایک سنگل بیڈ اس نے اپنے لیے ڈلوایا تھا تاکہ رات کو اگر بچوں کے پاس آکر انہیں سنبھالنا پڑے تو اس کے پاس بیٹھنے کی آرام دہ جگہ ہو۔

"ارے واہ۔۔۔۔ اس چھوٹے کمرے کی تو قسمت چمک اٹھی۔" تحریم کو آوازیں دیتے وہ جب چھوٹے کمرے میں داخل ہوا تو تحریم بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی اور ایلیا اسٹول پہ کھڑی تھی۔

"اچھا ہے نا بھیا!" ایلیا نے شوخی سے چہک کر تالی بجائی تو توازن بگڑا لیکن اس نے ہلتے ڈولتے کسی طرح خود کو سنبھال کر دیوار کو تھاما۔

"ارے نیچے اترو بے وقوف لڑکی۔ خوشی بعد میں منا لینا۔" موسن نے ہاتھ آگے کر کے اس کی کلائی کو پکڑا اور ایلیا نے جھینپ کر نیچے چھلانگ لگائی۔ بھیا کا موڈ کچھ اچھا تھا ورنہ بے نقط کی سننا پڑ جاتیں۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"یہ دیکھیں مومن ایلیا لائی ہے، اچھی ہیں نا؟" تحریم نے اس کی توجہ قریبی دیوار کی طرف دلوائی جہاں کچھ دیر پہلے ہی ایلیا نے فریم شدہ تصویریں لگائی تھیں۔

"ہاں اچھی ہیں لیکن بہت جلد ان میں نئی تصویریں لگنے والی ہیں۔" وہ ہنسا۔

"ایگزیکٹلی، میں نے بھی یہی سوچا کہ مہینے بھر بعد ہر طرف کی دیواریں اپنے بچوں کی تصاویر سے بھر دیں گے۔" ایلیا پھر چہکی۔

"ہاں اور ایک فریم میں تمہاری تصویر بھی ہونی چاہیے، گھر کے اکلوتے بچے کو دو پارٹنر جو ملنے والے ہیں۔" مومن کا موڈ واقعی بہت خوش گوار تھا۔ ایلیا نے اس کی بات پر منہ بنایا۔ آج اس کی بے عزتی تو نہ ہوئی تھی پر بھیا بننے کو بھی کہاں تیار ہوتے تھے۔

"پچھلے مہینے میں اٹھارہ سال کی ہو گئی ہوں اور میں نے اپنا آئی ڈی کارڈ بننے بھی دے دیا ہے۔" اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے ایڑی اوپر کو اٹھائی۔ انداز میں صاف غرور جھلکتا تھا۔

"بن جائے تو میرے پاس ہی رکھوا دینا تاکہ تم جب بھی کوئی بلنڈر مارو تو میں تمہیں دکھا سکوں کہ اب یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا۔" وہ مضحکہ اڑانے کے انداز میں ہنسا تھا۔

"پھر شروع ہو گئے آپ۔ چلیں اٹھنے میں مدد دیں۔" اس نے ہاتھ آگے کیا اور ایلیا بھی منہ میں بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"آ.....آپ....." وہ ایک دم بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو گود میں رکھی کتابیں اور پین وغیرہ نیچے گر گئے۔ وہ مزید نروس ہو کر فوراً نیچے بیٹھ گئی۔ ارحم نے پیروں میں آیا پین پہلے جھک کر اٹھانا چاہا لیکن پھر خود بھی اکڑوں بیٹھ گیا۔ وسیلہ اس سے چند فٹ ہی دور تھی۔

"کاش ہم ایک دوسرے کے لیے اس قدر اجنبی نہ رہے ہوتے تو آج مجھے دیکھ کر آپ کا ری ایکشن کچھ اور ہوتا۔" اس نے مسکرا کر پین آگے بڑھایا اور وسیلہ نے تعجب بھری نظروں سے دیکھ کر پکڑنے پر اکتفا کیا اور سامان سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آیئے....." وہ دروازہ کھول کر اسے اندر لاؤنج میں لے آئی۔

وہ دھڑلے سے گھر میں گھس آنے والا اس کا تایا زاد تھا۔ ادھر امی تھیں جو کل تک اپنی سسرال کا نام سن کر تھر تھر کانپتی تھیں، اب ارحم کمال خان کی اثر انگیز باتوں سے چھلکتی دکھائی دیتی تھیں۔ وسیلہ کو اس نئی بدلتی صورت حال پر اعتراض تو کوئی نہیں تھا لیکن جو کچھ اب تک امی سے سننے کو ملا تھا اس کے بعد اتنے جلدی بھروسا کر لینا اسے تو دانش مندی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن جب امی ہی مطمئن تھیں تو وہ کیسے کوئی اعتراض کھڑا کرتی۔

البتہ ذہن میں چلتی کشمکش اسے مطمئن نہیں ہونے دے رہی تھی۔ ٹھیک ہے کہ ماضی میں جو کچھ اس کی امی پر گزرا وہ اس کا آنکھوں دیکھا نہ تھا لیکن جتنا کچھ امی سے سنا تھا اس کے تناظر میں تھانہ کی حویلی اس کے لیے کسی جیل خانے سے کم نہ تھی۔ پھر سوچتی شاید جگہ کا نام ہی عجیب ہے۔ جب شہر کا نام تھانہ ہو تو تصور جیل خانے کا ہی آسکتا ہے۔ لیکن... وہ سوچوں میں رکی۔

امی کہتی تھیں تائی شہناز ان کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ حویلی میں واحد دادی ہی ان کی خیر خواہ تھیں۔ اور پھر وسیلہ کی پیدائش کے موقع پر نجانے کیا ہوا کہ دادی نے انہیں اچانک حویلی چھوڑنے کا کہا۔ اور ساتھ ہی تاکید کی کہ آئندہ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ آنے والے کچھ سالوں میں جمال ہی ماں سے جا کر مل آتے، رضوانہ کو وہ دوبارہ گاؤں نہیں لے گئے۔ اور دس، بارہ برس جب تک جمال زندہ رہے، ان ہی کا حویلی سے تھوڑا بہت ناتا رہا، جب جمال بھی فوت ہو گئے تو یہ سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اور اب...... بابا کی وفات کے بارہ سال گزرنے پر یہ ارحم کمال آیا تھا۔ یہ کہتا ہوا کہ گزری باتوں کو بھول کر ایک ہو جانے میں ہی سب کا بھلا ہے۔ وسیلہ جب چائے لے کر آئی تو ارحم اس کی امی سے کہہ رہا تھا کہ چچا جان کا جائیداد میں حصہ ہے۔ ان کے بیوی بچوں کا حق اور ان کے پاس امانت ہے۔ وہ بڑے کھلے دل سے اس کی امی کو جائیداد کا ان کا حصہ وصول کرنے کا کہہ رہا تھا۔ رضوانہ اس کے خلوص اور اپنائیت پر ہر بار پہلے سے زیادہ ممنون ہو جاتیں۔ وہ اس کے لیے دل میں بہت محبت بھرے جذبات محسوس کرنے لگی تھیں۔ ارحم نے اس کی امی کی دادی سے بھی بات کروا دی تھی جو برسوں بعد رضوانہ کی آواز سن کر بے طرح خوش تھیں۔ آخری بار تو بارہ سال پہلے ہی جمال نے ان کی بات کروائی تھی۔

"مجھے یہ کزن کچھ عجیب سا لگا...... ہے نا؟" ایلیا کچھ کھسر پھسر کے انداز میں وسیلہ کے کان میں بولی تو وسیلہ نے ہنسی روکی، چور نگاہوں سے دور بیٹھے ارحم کو دیکھا۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتے رضوانہ کو تھانہ والی زمینوں کا احوال دے رہا تھا۔

"اچھا..... کیا عجیب ہے مثلاً؟" وسیلہ نے دلچسپی سے ابرو اٹھایا۔

"بناوٹی ٹائپ۔ مجھے اتنا میٹھا بولنے والے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"ہیلو لوگ......؟" وسیلہ نے آنکھیں نکالیں۔

"یار باجی، سمجھو نا۔ مطلب اتنا بھی کون اپنوں کے لیے ترستا ہے۔ ایک رویا نہیں بے چارا۔"

"بس میٹھا بولنا تو خوبی ہوتی ہے۔ اور ہم نے بھی تو مومن بھیا جیسے روکھے لوگ دیکھے ہیں، انہیں ہضم نہیں ہو رہا شاید۔"

"روکھے ہیں لیکن اپنے اپنے تو لگتے ہیں نا۔ ویسے بھی اس ہیلو سے تو بہت اچھے ہیں ہمارے سڑو بھیا!"

"بس کرو، اب بے چارے کا نام نہ ہیلو پڑ جائے۔"

"بناوٹی ہیلو..... کیسا نام ہے۔" وہ شوخی سے چہکی تو وسیلہ نے بے ساختہ ٹھوکا مارا۔ جوش سے اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

"امی، بابا کے بعد بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھیں، مجھے لگتا ہے وہ خوش ہیں ارحم کے آنے سے، پھر دادی جی۔ جن کا ذکر امی نے ہمیشہ بہت اچھے لفظوں میں کیا، ارحم کے توسط سے ہمیں اپنی دادی ملنے والی ہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ سب اچھا ہونے والا ہے۔"

"ہوں۔" ایلیا نے بے دلی سے سر ہلایا۔ "اللہ کرے سب اچھا ہو۔"

☆☆☆

مون سون کی وہ پہلی بارش تھی۔ پچھلا پورا ہفتہ معمول کے خوش گوار موسم کے برخلاف کچھ گرم گیا تھا۔ اور آج تو بادل جیسے بہت کھل کر برس رہے تھے۔ بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج میں ہلکا خوف اور ایک پراسراری خوب صورتی تھی۔

ایلیا کو امی کے بیڈ پر نیند آ گئی تو وسیلہ نے کمرے کی لائٹ آف کی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ وال کلاک کی طرف دیکھا، ابھی رات کے نو بجے تھے۔ آج اس کا شاعری پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہی اس کا من پسند بارش کا موسم اور وہی دل کی ناسمجھ آنے والی بے چینیاں، یوں لگتا جیسے وہ اس خوب صورت وقت کو بھینچ کر روک لینا چاہتی ہو۔

موبائل کی بیل نے اسے لفظوں کے سحر سے باہر نکالا، چشمہ اتار کر اس نے موبائل ہاتھ میں لیا۔ کال منصب کی جانب سے تھی۔ اس کا دل بے طرح دھڑک گیا۔ کال اٹینڈ کر کے کانوں سے لگایا تو منہ سے ہیلو ہی نکل نہیں پایا۔

"ہیلو!" خاموشی پا کر منصب نے خود ہی محتاط سا ہیلو کہا۔

"جی......" بمشکل اس کی گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"السلام علیکم۔" اس نے جی سے ہی پہچان لیا تو اس مرتبہ قدرے اعتماد سے مسکرا کر آغاز لیا۔

وعلیکم السلام۔ وسیلہ نے آواز پر تو قابو پالیا

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دھڑکن البتہ پہلے سے کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔
"سو تو نہیں رہی تھیں۔ سوری شاید میں نے ڈسٹرب کیا۔"
"نن..... نہیں۔ میں جاگ رہی تھی۔"
"موسم انجوائے نہیں کر رہیں؟"
"جی، یہ موسم تو اندر بیٹھ کر انجوائے کیا جاتا ہے۔" وہ ذرا سا مسکرائی "اور میں وہی کر رہی ہوں، کافی پیتے اور کتاب پڑھتے ہوئے۔"
"ماشاءاللہ خوش نصیب ہیں۔"
"اور آپ....." وہ کہتے کہتے جھجک کر رک گئی۔
"آپ کے گھر کے سامنے۔" اس نے بالکل ہی اچانک کہہ دیا اور موبائل وسیلہ کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔
"سچ جی۔ یہاں۔ کیوں؟"
"کھڑکی میں آ سکتی ہیں؟"
"جی نہیں..... اللہ حافظ۔" اس نے فوراً ہی کال کاٹ دی۔ دل جیسے ساری کھڑکیاں دروازے توڑ کر باہر آ رہا تھا۔ وسیلہ کا چہرہ پریشانی سے کانوں تک تپ گیا۔ موبائل آف کر کے اس کے کمرے میں چلے جانا ہی بہتر تھا۔ اس نے دل میں ارادہ باندھا، موبائل ہاتھ میں لیا اور اسی وقت منصب کی جانب سے پہلا وائس ایپ میسج موصول ہوا۔
"آپ تو ایک دم ہی پریشان ہو گئیں، سوری وسیلہ جی مذاق کر رہا تھا۔ دراصل میرے مجرموں کو خوب صورت موسم میں شرارت سوجھی، باہر نکلنے کے لیے شور مچا رہے تھے۔ مجھے ڈیوٹی کانسٹیبل نے کال کر کے بلا لیا۔ تب ہی اس برستی بارش میں گھر سے نکلنا پڑا اور اب ان کی خبر لے کر تھانے سے باہر نکلا ہوں گھر واپس جانے کے لیے..... آپ کی کھڑکی کی زرد لائٹ بارش میں نہایت دلکش محسوس ہوئی تو کال ملائی، ویسے اندازہ نہیں کر پایا آپ کا ہی گھر ہے یا کچھ اور..... میرے تصور نے البتہ بالکل ایسی ہی چھلانگ لگائی تھی۔ یعنی چائے پیتی یا کتاب پڑھتی وسیلہ خاتون..... ایک مرتبہ پھر معذرت، البتہ آپ کی گھبراہٹ بہت نیچرل تھی اور ماحول کی مناسبت سے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ وجہ شاید آپ سمجھ گئی ہوں گی۔"
"اوہ!" وہ نچلا لب دانتوں میں دبا کے بیک وقت مطمئن اور شانت ہوئی۔ ہونٹ بھی بڑی دیر بعد مسکرائے اور پہاڑ سا بوجھ سر سے یک لخت اترا تو اس نے بھاگ کر کمرے کی لائٹ آف کی اور پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ سڑک یہاں سے صاف دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی روشنیاں بھی تھیں اور بوندا باندی بھی جاری تھی۔ مدھم روشنی میں پولیس جیپ عین گیٹ کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ اور اندر بیٹھا آدمی بھی بلاشبہ منصب تھا۔ اس نے مسکرا کر دیکھا اور پردہ چھوڑ دیا۔
وائس ایپ سامنے کھلا تھا۔ اس کی بالکل بھی سمجھ نہیں آیا کہ کیا لکھے تب ہی منصب کی جانب سے کھلکھلاہٹ لکھا آ گیا اور شرمندگی سے وسیلہ نے بے ساختہ آنکھیں میچ لیں۔ لائٹ آف کرنا اس کی اگلی بے وقوفی تھی جس کا راز بھی منصب نے جھٹ سے پا لیا تھا۔

☆☆☆

"انسان کا دل کب خوف اور وہموں میں گھرتا ہے؟"
رضوانہ نے کھڑے کھڑے بالکل ہی اچانک سوچا اور جواب اندر جیسے موجود تو تھا لیکن زبان تک آنے اور الفاظ میں ڈھلنے کو تیار نہ تھا۔ ارحم ابھی ابھی ان سے مل کر اور یہ کہہ کر وہاں سے نکلا تھا کہ بہت جلد وہ اپنی امی اور دادی کے ساتھ یہاں آئے گا۔ اور رضوانہ اس کے جانے کے بعد خالی دماغ لیے بس یہی سوچ پائیں کہ وہ سب کچھ جو ہونے جا رہا ہے وہ یونہی چلتے رہنا چاہیے۔ یا اس کو یہیں پہ روک دینا بہتر ہے۔ یا پھر اس سب کا زیادہ جوش اور جذبے سے آگے بڑھنا اچھا ہے؟ لیکن وہ کچھ بھی طے کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔ البتہ یہ طے تھا کہ انہیں بہرحال کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہے۔

وہ صوفے کے کونے پر ٹک گئیں، دماغ بھی خیالات کی یلغار کو آج روکنے کو تیار نہ تھا..... جیسے یہ کب سے پہلے انہیں توفیق بھائی سے بات کرنی چاہیے تھی۔ چوبیس برس پہلے بھیا ہی تھے جن کے بہانے وہ اتنا بڑا قدم اٹھا پائی تھیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تب جمال ان کے ساتھ تھے اور فیصلہ بھی اماں جی کا تھا، شاید اس لیے رضوانہ نے ذمہ داری کا بوجھ خود پر اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن جمال کے بعد تو توفیق بھائی ہی تھے جنہوں نے ہر قدم پر اس کا ہاتھ تھاما تھا بلکہ یوں کہا جائے تو گزرے چوبیس برسوں میں بھیا کا ہاتھ بھی چھوٹا ہی نہیں تھا۔ اگرچہ اب وہ ہاتھ فالج کے حملے سے اتنا مضبوط نہیں رہا تھا لیکن کچھ لوگوں کا محض ہونا ہی اللہ کی طرف سے انسان کی غیبی امداد اور سہارا ہوتا ہے۔ بھلے وہ کچھ بھی نہ کریں لیکن یہ "ہونا" کسی جادو کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا۔
رضوانہ نے ایک نتیجے پر پہنچتے بے ساختہ سر ہلایا۔ بڑی دیر سے وہ خیالوں میں اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہی تھیں۔ دوسرا خیال انہیں یہ آیا تھا کہ اماں جی اگر ارحم کے ساتھ یہاں آ جاتی ہیں تو ان سے بھی بہت کچھ جانا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ باوجود برسوں سے رابطے میں نہ ہونے کے وہ ان کی خیر خواہ تھیں اور موجودہ صورت حال میں ان سے بہتر مشورہ اسے کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

☆☆☆

"منصب! مجھے رضوانہ آنٹی کی طرف جانا ہے۔"
"کون رضوانہ آنٹی؟" وردی کے کالر درست کرتے اس نے سر پر کیپ فٹ کی۔
"ایلیا نے مجھے ایک شاپ بتائی ہے۔ وہاں سے کرا کے کپڑے بہت اچھے مل جاتے ہیں۔" رمشہ نے آج لٹی اور عفورہ کو بھی دو گھنٹے لیٹ آنے کا کہا تھا۔ اس کا ارادہ منصب کے ساتھ ہی نکلنے کا تھا تاکہ وہ اسے ان کے گھر ڈراپ کر دے۔
"کیا کرنے جا رہی ہو، کہاں جانا ہے۔ اتنی صبح صبح؟"
"ارے وسیلہ لوگوں کے گھر جا رہی ہوں۔ ایلیا سے میری بات ہو گئی ہے۔ وہ کہتی ہے ابھی آ جاؤ، پھر تو ساڑھے نو تک نکل جائیں گے۔ پھر بھی وہ مجھے خود ہی چھوڑ دے گی۔"
"تو یوں کہو نا۔ اتنی دیر سے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے۔"
"ہاں تو مجھے کیا پتا تمہیں صرف وسیلہ کا نام سمجھ میں آتا ہے۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔" رمشہ کھلکھلا کر کمرے سے باہر نکل گئی اور منصب شرمندگی سے مسکرا کر رہ گیا۔ ایسے واقعی ساری بات وسیلہ کا نام سن کر ہی سمجھ میں آئی تھی۔
"تو اب آپ کی والدہ اور سسٹر کا نام بھی یاد رکھیں گے وسیلہ جی۔" اس نے اپنے آپ کو یاد دلاتے خیالوں میں وسیلہ کو مخاطب کیا اور یہ بات اسے خود بھی کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ وسیلہ کے ذکر پر اس کے لب کیوں مسکرانے لگتے تھے۔ بنا کسی بحث میں پڑے اس نے رمشہ کو وسیلہ کے گھر کے باہر چھوڑا۔
جولائی کے آخری ایام تھے اور آج نسبتاً ایک گرم دن تھا۔ وسیلہ کے باہر نکلنے ہونے کی امید اور امکان تو نہیں تھا، پھر بھی دل نے نجانے کیوں یہاں تک آنے میں بھی انجانی سی خوشی محسوس کی تھی۔
"واپس تو میرا خیال ہے، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" رمشہ نے خود کلامی کی تو منصب چونکا۔
"نہیں مجھے کال کر دینا۔ شاپنگ کر کے یہیں آنا۔ گھر میں خود چھوڑ آؤں گا۔"
"ہوں..... اوکے۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکاتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آج کا دن یقیناً بہت اہم تھا۔ ارحم نے اشاروں اشاروں میں رضوانہ چچی سے وہ سب کہہ دیا تھا جو اس کے یہاں آنے کا اصل مقصد تھا۔ وسیلہ بھلے یہ بات ماننے کو تیار نہ تھی کہ اس نے بھی ارحم کو

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

یونیورسٹی میں دیکھا بھی تھا لیکن ارحم کے لیے تو یہ اتفاق ہی اس مقصد کی اہم کڑی تھا۔

آج اس نے چچی پر باتوں باتوں میں ظاہر کر دیا تھا کہ وسیلہ کو یونیورسٹی کے دنوں سے ہی پسند کرتا ہے اور اب امی اور دادی کی مرضی سے اسے اپنانے کے لیے دل و جان سے سنجیدہ ہے۔

ارحم نے چچی کی آنکھوں میں محسوس کیا کہ انہوں نے ارحم کے اظہار کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ خود ارحم نے شروع سے یہی فیصلہ کیا تھا کہ بجائے وسیلہ کے وہ چچی جان سے بات کرے گا۔ اور اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ اس پر کتنی سوچ بچار کرتی ہیں۔ ارحم کے لیے اب جلد از جلد ماں اور دادی کو یہاں بلانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ دیر اس کے کئی دوسرے معاملات کے آڑے آ رہی تھی۔

وہ کسی قدر مصروف انداز میں کی چین جیب سے نکالتا گیٹ سے باہر نکلا تو بری طرح ٹھٹک کر رکا۔ ایک بہت شناسا چہرا...... تھانہ میں جس سے صبح شام کا سامنا رہتا تھا۔ یہاں آنکھوں کے عین سامنے وہ بھی خاکی وردی۔ ارحم کے چہرے کا رنگ یکسر تبدیل ہوا تھا۔ منصب پولیس کی وردی میں جیپ سے ٹیک لگائے کیا شاندار پرسنالٹی کا مالک لگ رہا تھا۔ حسد اور تنفر کی لہر دماغ سے شدید ناگواری لیے ٹکرائی اور اس کے قدم وہیں پڑتے وہیں رک گئے۔ منصب نے اس دوران حیرت بھری مسکراہٹ لیے ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا تھا۔

"ارحم خان...... آپ یہاں؟"

"سلام خان جی!" رمشہ بھی اسی وقت گیٹ سے باہر نکلی۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر ادب سے سلام کیا، جبکہ اس کے ساتھ گیٹ سے باہر نکلتی وسیلہ اور رضوانہ آنٹی نے حیرت سے رمشہ، پھر منصب اور ارحم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

"جی آنٹی، ارحم خان جی تھانہ سے ہیں نا، ہمارا گھر بالکل قریب ہے ان کے۔" رمشہ نے خوش دلی سے بتانا شروع کیا۔

"جی چچی! منصب کے والد ہمارے منشی تھے۔" ارحم نے مسکرا کر اضافہ کیا۔

"منشی......؟" رضوانہ چونکیں۔

"جی میرے بابا نور خان حویلی میں منشی ہوتے تھے۔"

منصب نے وضاحت کی اور رضوانہ کے چہرے پر ایک لہری آ کر گزر گئی۔ رمشہ ان کی بیٹی کی نئی نئی دوست بنی تھی۔ ادھر ارحم بالکل نیا یہاں آیا تھا۔ ان سب کے پہلے سامنے پہنچ کر معلوم ہوا کہ رمشہ اور منصب کا باپ منشی تھا انہیں کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔

"اچھا واہ ماشاء اللہ، آپ سب تو پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

وسیلہ نے مسکرا کر رمشہ کو دیکھا۔ جامنی شال لپیٹے سے سر پر جمائے وہ رمشہ کو دیکھ کر بات کر رہی تھی۔ ارحم نے ایک نظر منصب کی طرف دیکھا لیکن وہ تو اسی کی طرف متوجہ تھا۔

"آپ کبھی ہیں ارحم خان! تو گھر ضرور آئیے۔" منصب نے ارحم کو دعوت دی۔ وسیلہ سے اس کی نئی نئی پیدا ہوئی انڈر اسٹینڈنگ اپنی جگہ لیکن وہ سب کے بیچ اس کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن سکتا تھا۔

"ہوں۔" ارحم نے اس کی دعوت پر کوئی تبصرہ نہ کرتے رضوانہ چچی کو دیکھا۔

"او کے چچی جان۔ میں پھر آؤں گا۔" وہ ایک تحکم سے کہتے بنا کسی سے سوال جواب کیے اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔

اس نے چند لمحوں میں محسوس کر لیا تھا کہ رضوانہ چچی لفظ "منشی" پر بے چین ہوئی تھیں اور اس کے لیے یہی بہت تھا۔ تب ہی اس نے منصب کی بات کو قابل اعتنا بالکل نہیں جانا اور لاپروائی کا تاثر دیتے بنا جواب دیے پلٹ گیا۔

وسیلہ نے ارحم کی نخوت کو خفالت سے دیکھا۔

جبکہ منصب نے بے تاثر چہرے کے ساتھ مڑ کر رمشہ کے لیے جیپ کا گیٹ کھول دیا اور وہ ان سب سے الگ جیپ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"سو ارحم، ہم میانم میں ہیں نا...... وہ......

یہاں تو منصب بھی ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا۔"

دادی یہ بات کوئی تیسری مرتبہ دوہرا رہی تھیں اور ارحم نے ضبط اور غصے سے اسٹیئرنگ کو بھینچا۔ اس کے دل میں کئی الٹے سیدھے جواب آ رہے تھے لیکن موقع ایسا تھا کہ اسے کسی قیمت پر دادی کو اپنا پرانا روپ نہیں دکھانا تھا۔ کیونکہ ان کی نظروں میں تو وہ ایک بدلا ہوا ارحم تھا جو انہیں ان کی بچھڑی ہوئی بہو اور پوتوں سے ملوانے ان کے گھر لے جا رہا تھا۔ شہناز بھی کئی دنوں سے برابر بہت اچھے ڈھنگ سے پیش آ رہی تھیں۔ اپنا مطلب نکلوانے کے لیے موجودہ رویہ اپنانا ناگزیر تھا۔

"ہاں ہاں اماں کیوں نہیں...... ہم ذرا رضوانہ بھابی اور بچوں سے مل لیں پھر منصب کو بھی ضرور تلاش کریں گے۔ کیوں ارحم؟"

"جی بالکل۔ میں پتا کروں گا۔" ارحم نے اس ذرا سے وقفے کے دوران اپنے گرم دماغ کو ٹھنڈا کیا تھا۔

رضوانہ چچی کا گھر آ گیا تھا۔ انہیں پہلے سے اطلاع دی جا چکی تھی کہ وہ اپنے ساتھ دادی اور امی کو لا رہا ہے۔ کار اس نے پورچ میں روک کر ہارن دیا۔ یہاں بھی یقیناً سب بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ اس کی امی اور دادی کا بھی اسی جذباتی انداز میں استقبال کیا گیا جس کی ارحم توقع کر رہا تھا۔ البتہ اماں کے غیر ضروری آنسو اسے اپنی ہنسی روکنے پر مجبور کرتے رہے۔

ارحم کو کئی بار دل چاہا چپکے سے ان کے کان میں کہے کہ وہ اوور ایکٹنگ کر رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر البتہ ارحم کو دلی خوشی اور سکون محسوس ہوا کہ رضوانہ چچی کے سب شکوے اور غصے پہلی مرتبہ ہی کر آنسوؤں میں دھلتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے کا اطمینان بتاتا تھا کہ دل لینے کے بعد وہ ایک ساتھ کئی خدشات سے باہر آ گئی تھیں۔ اور یہی سچ تھا۔ رضوانہ کو لگا برسوں سے جمی برف بلاوجہ ہی اتنے طویل عرصے تک جمود کا شکار رہی تھی۔ اگر یہ دوریاں بہت پہلے مٹ جاتیں تو اتنے برس وہ خوف اور ڈر میں تو نہ جیتی رہتیں۔

خصوصاً اماں جی کا شہناز بھابی کے ساتھ آنا ان کے کئی سوالوں کا اپنے آپ جواب تھا۔ لیکن یہ رضوانہ کی بدقسمتی تھی کہ وہ ہرگز یہ نہیں جانتی تھیں کہ یہاں تو اماں جی خود ایک ساتھ کئی حیرتوں سے نمٹ رہی تھیں۔ شہناز اور ارحم کا یک لخت بدلتا رویہ ابھی وہ سمجھنے کی کوشش میں تھیں کہ ارحم تو انہیں رضوانہ سے ملوانے ہی نکل پڑا، تب انہوں نے بھی یہی سوچا کہ پرانی رنجشیں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اللہ پاک نے شہناز اور ارحم کے دل میں اگر نرمی ڈال دی ہے تو اس سے اچھی خبر اور کیا ہو سکتی ہے۔

"جدائی کا وقت جتنا طویل اور کڑا رہا ہے، دنیا نے تو بس دیکھا ہے بھابی! ہم نے جھیلا ہے خود پر۔" شہناز کی پلکیں نئے سرے سے نم ہونے لگیں، اماں جی سے بات کرتے رضوانہ چونک کر جیٹھانی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"جی بھابی، سچ کہتی ہیں۔" انہوں نے زیادہ تبصرہ مناسب نہیں سمجھا۔ اب پرانی باتوں کو کیا دوہرانا

"میں تو کہتی ہوں اب نزدیکی بھی اتنی مضبوط اتنی جان دار ہونی چاہیے کہ دنیا دیکھتی رہ جائے۔" شہناز نے اپنا مدعا مکمل کیا۔

"رشتوں میں پیار محبت اپنے من کی سچی خوشی کے لیے ہوتی ہے، دنیا دکھاوے کے لیے نہیں شہناز۔" ہاجرہ بیگم نہایت صاف گو تھیں اور اظہار بھی اسی حساب سے کرتی تھیں، لیکن شہناز اس معاملے میں مصلحتاً بھی خاموشی اختیار کرنے کے موڈ میں نہ تھیں۔

"یہ دل کی سچی خوشی ہی ہے اماں! کہ اب دل

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

چاہتا ہے رشتہ داری کی ڈوری میں ایک مضبوط گرہ اور بھی ڈال دی جانا چاہیے۔"

"مطلب؟" اماں جی نے توجہ مکمل بہو کی جانب کی۔

"وسیلہ مجھے اپنے ارحم کے لیے بہت اچھی لگی ہے۔ کیوں بھابی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں خدانخواستہ اعتراض کی تو کوئی بات نہیں، بس ذرا سا وقت ملنا چاہیے۔"

"اماں آپ ہی کہیں نا رضوانہ بھابی سے۔ اب سوچ بچار میں کیا رکھا ہے۔ میں تو شکر پڑھ رہی ہوں کہ صحیح وقت پر آ گئی۔ اگر تحریم کی طرح وسیلہ کا بھی کہیں ہو جاتا تو۔"

"کیسے ہو جاتا امی!" ارحم نے شرما کر حصہ لیا۔ "ہوٹل کے وقت سے برابر وسیلہ کی ہر اطلاع اپنے پاس رکھ رہا ہے۔"

"بھیا! آپ نے ہوٹل میں وسیلہ کو کیوں نہیں کہا کہ آپ اس کے کزن ہیں؟" ایلیا پہلے تو چونکی اور پھر بولی تو ارحم نے گھبرا کر پہلے تو ماں کو دیکھا پھر جھینپ کر بات سنبھالی۔

"ایک تو مجھے پتا ذرا دیر سے چلا، پھر جب سنا کہ آپس کے تعلقات بھی ذرا سرد مہری کا شکار ہیں تو یہ سوچ کر رک گیا کہ نجانے وسیلہ کا ردعمل کیا ہو۔"

"بس بھئی چھوڑو پرانی باتیں۔ مجھے تو آج رضوانہ بھابی کی ہاں سننی ہے۔" رضوانہ نے لاڈ سے بھابی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

رضوانہ نے اندر ہی اندر بے بسی سی محسوس کرتے اماں جی کی طرف دیکھا۔ اور اس ایک نظر کے سوال میں سالوں پرانے قصے درج تھے۔ کاش انہیں کچھ دیر اماں جی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ دل میں سوچ رہی تھیں اور شہناز نے جیسے یہ بھی رضوانہ کی آنکھوں سے پڑھ لیا۔ اور یہ تو وہ ہرگز نہیں ہونے دے سکتی تھیں۔ اماں جی اور رضوانہ کو ایک دوسرے سے اکیلے میں کوئی موقع نہیں ملنا چاہیے، کیونکہ جتنی رضوانہ بے خبر تھیں اتنی ہی اماں جی لاعلم تھیں اس کے ارادوں سے۔ فی الحال تو اسے دونوں کی اسی بے خبری سے فائدہ اٹھانا تھا۔

"اماں جی! آپ ہی کچھ کہیں نا۔ بہت سے میرا تو اب ایک ہی خواب ہے کہ ویران پڑی حویلی کب اپنوں کے وجود سے دوبارہ آباد ہو گی، کب جمال کے بیوی بچوں کو اس کا حق واپس ملے گا اور میں ضمیر کی قید سے خود کو آزاد کر پاؤں۔ یہ بوجھ اب میرے اٹھانے کا نہیں ہے بھابی۔ میں جانتی ہوں اماں جی، بابا آپ آخر کس نے کب تک اس ویران قید خانے میں رہنا ہے۔ حق دار کو اس کا حق مل جائے۔ رشتے آپس میں مضبوط ہو جائیں گے۔ لیکن مجھے دل کا اصل اطمینان نصیب ہو جائے گا۔"

"جی بھابی! آپ صحیح کہتی ہیں۔ بس تو تھی بھیا سے مشورے کا وقت مل جائے تو۔"

"کیوں نہیں، بسم اللہ کریں۔ بلکہ ارحم بتا رہا تھا، بھائی صاحب بیمار رہتے ہیں، پھر بھی پاس والا ہی ہے نا۔ ہم تو خود عیادت کو جائیں گے۔ اسی بہانے بات بھی ہو جائے گی۔"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" رضوانہ پھر مروت سے چپ سی رہ گئیں۔ شہناز بھابی نے تو وہاں لگوانے کی ٹھان ہی لی تھی۔

☆☆☆

"شکریہ...... آپ نے رمشہ کو ہمارے ہاں بھیجا۔ اس کے آنے سے بہت اچھا لگتا ہے۔" وسیلہ نے میسج بھیج کر پلکیں سختی سے بھینچ لیں۔

پچھلی دوپہر سے وہ لگاتار اس سوچ میں تھی کہ آخر ایسا کیا لکھے منصب کو جس سے برا بھی نہ لگے اور رابطہ...... وہ بری طرح جل ہو کر رہ گئی۔ وہ منصب سے رابطہ کرنا چاہتی تھی، کچھ بھی مناسب سا کہہ کر۔

"ہوں......" لب بھینچ کر منصب نے اپنی ہنسی روکی۔

"رمشہ کے آنے کے دو دن بعد شکریہ ادا کرنے کی وجہ تو بہت سیدھی تھی، لگاتار دو روز تک بڑی سوچ بچار کرتا رہا تھا۔ بالآخر ہمت کر لی لیکن وہ بھی سیدھی طرح فرض کہاں کرتا بہت تھا کہ یہی وجہ ہو گی۔ دل بے تاب کو اظہار کے ادارے ہی چین نصیب ہوتا ہے۔ منصب نے شیشے کے پار دیکھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آئے۔ منصب نے بجائے واٹس ایپ کرنے کے کال ہی ملا دی۔

"السلام علیکم......" وہ سخت نادم تھی اپنی پہل پہ، چہرہ مارے ندامت کے سرخ ہو گیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں وسیلہ۔ بات ہو سکتی ہے آپ سے؟"

"جی، میں ٹھیک ہوں۔" وہ بس یہی کہہ پائی۔

"بہت دنوں سے میں سوچ رہا تھا، آپ سے پوچھوں۔ وہ خاتون جن کا مسئلہ حل کیا تھا۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی دوبارہ۔"

"آں...... فیروزہ......؟" وسیلہ نے اپنا دماغ حاضر کیا۔ "جی جی، اللہ کا شکر پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

"چلیں اچھی بات ہے۔ اور یہ شکریے کیوں ادا کیے جا رہے تھے۔ آنا جانا تو اب لگا رہنا چاہیے۔ میں تو آپ کی آمد کا منتظر ہوں۔" منصب نے "ہم" کے بجائے "میں" کہہ کر وسیلہ کی جھجک دور کرنے کی کوشش کی۔

"جی میں بھی چکر لگاؤں گی۔ دراصل تھانہ سے میری دادی اور چچی آئی ہوئی تھیں۔" وہ بھی کھل گئی۔

"دادی آئی تھیں۔"

منصب کا بے اختیار دل دھڑکا۔ اب تو معلوم ہو چکا تھا کہ وسیلہ کا تعلق بھی حویلی سے ہے۔

"کیسی تھیں دادی۔ اور آ کر چلی بھی گئیں؟"

"آپ جانتے ہیں دادی کو؟ او ہاں شاید" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"نہ صرف جانتا ہوں بلکہ انہیں اپنی دادی مانتا اور کہتا ہوں۔ وہ بھی مجھے اپنا پوتا مانتی ہیں۔ کاش میں ان سے مل پاتا۔"

"جی مل سکتے اگر وہ کچھ دن یہیں رہ جاتیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا لیکن ارحم بھائی انہیں اسی روز واپس لے گئے۔ حالانکہ دادی بھی ہمارے پاس رہنا چاہتی تھیں۔"

"اتنے جلدی کیوں؟ بس ایک دن۔" منصب کو بھی حیرت ہوئی۔

"جی وہ شہناز چچی کہہ رہی تھیں، ان کی بہن ہیں وہاں حویلی میں، ان کو شاید وہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتیں۔"

"ہوں...... وہ تو واقعی ہیں لیکن دادی تو رک جاتیں۔"

"جی، میں نے بھی یہی کہا۔ میری دادی سے ملنے کی حسرت ابھی مٹی ہی نہیں تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔ بالکل میرے بابا جیسی۔" وسیلہ ایک دم جذباتی سی ہونے لگی۔

"چلیں، کوئی بات نہیں، اگلی مرتبہ آپ لوگ تھانہ ہو آئیں۔"

"جی وہ تو......" وسیلہ ایک دم رک سی گئی۔

"جی۔؟" منصب کو اس کی جھجک سمجھ میں نہیں آئی۔

"جی کچھ نہیں۔"

"بتائیں بھی۔ کچھ کہتے کہتے رک جانا پولیس والوں سے بالکل برداشت نہیں ہوتا۔" وہ تنگ کرنے کے انداز میں ہنسا تو وسیلہ نے بھی قہقہہ لگایا۔

"پولیس والے نے کہیں ڈنڈا تو نہیں اٹھا لیا۔"

"ڈنڈے کی ضرورت نہیں، میں سوالوں سے ہی زچ کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔"

"اچھا واہ۔ خود اقرار کر رہے ہیں۔"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"تو کیا یہ خامی کہلاتی ہے؟" وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔
"ہوشیاری کہلاتی ہے۔"
"نہیں خیر معصوم سا بندہ ہوں۔ ہوشیاری تو پیشے کا حصہ ہے۔ جبراً سکھائی گئی ہے۔"
"وہ اصل میں میری تائی نے رشتہ مانگا ہے۔"
"آپ کا......؟" اس نے بھی پوچھنے میں دیر نہیں کی۔
"جی......"
"مطلب ارحم خان کے لیے آپ کا رشتہ؟" اس کا دل پل میں سلگا۔
"جی......"
"اور جواب؟"
"ابھی تو نہیں دیا۔"
"تو کیا رجحان ہے۔ ہاں یا نہ؟" وہ بالکل بنا جھجکے پوچھتا چلا گیا۔ انداز میں بے چینی اور عجلت تھی۔
"امی کا جھکاؤ تو لگ رہا ہے۔"
"نہیں وسیلہ......" اس کا دل بڑے زوروں سے دھڑکنے لگا تھا۔ "ایسا مت ہونے دیں۔ پلیز۔"
"جی......؟"
"آپ سمجھ رہی ہیں نا...... میں بہت جلد خود آنے والا ہوں۔ تب تک۔"
"لیکن۔"
"وسیلہ کیا ہم ایک بار مل سکتے ہیں۔؟ یہ بہت ضروری ہے۔"
"یہ بہت مشکل ہے سر!" وسیلہ الجھن میں پڑ گئی۔
"اکیڈمی میں اتفاقاً کہیں سامنا ہو جانا الگ بات ہے لیکن طے کر کے اکیلے کہیں ملنا۔ مجھے سوچ کر اچھا نہیں لگ رہا۔"
"نہیں نہیں اکیلے نہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں

۔ آپ گھر آ جائیں۔ ربعہ سے ملنے، سسر کو بھی ساتھ لے آئیے گا۔ مجھے کہاں کسی کا ملنا جلنا ہے تو۔"
"او، جی جی میں سمجھ گئی۔" وسیلہ کے سر پل میں بوجھ سرکا۔ "میں کوشش کروں گی اکیلے دن میں۔" اس نے لب چباتے ساتھ ساتھ سوچنا بھی شروع کر دیا۔

☆☆☆

"کتنی عجیب بات ہے نا منصب!" ربعہ نے بڑی دیر بعد سر اٹھایا تو منصب نے بھی چونک کر سر گھمایا۔
"ہوں۔ کیا؟"
"دیکھو نا۔ ادھر تھانہ میں ہم کمال خان کی حویلی کے قریب تھے۔ اور یہاں جمال خان کی حویلی۔ مجھے لگتا ہے ہم دادی کو اب ضرور بلا لیں گے۔"
"دادی آئی تھیں۔"
"ہیں۔ وہ کب آئیں؟ ابھی پرسوں ہی تو میں گئی ہوں۔"
"پچھلے روز آئی تھیں۔"
"تمہیں کیسے پتا۔ کس نے بتایا؟"
"ہوں!" منصب نے جیسے اب سوچا، پھر کچھ وقفہ کیا، وسیلہ کا نام لینا ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے گلا کھنکارا۔
"ارحم خان سے ملاقات ہوئی تھی۔"
"تو...... چلی گئیں دادی۔؟ ہم سے کیوں نہیں ملیں، پھر کب آئیں گی؟"
"ارے یار۔ اب ارحم خان سے تو میں نے اتنے سوال نہیں پوچھے۔" وہ ہنس پڑا۔ "بس سرِراہ ملاقات ہوئی تو بھی بتا رہا تھا کہ تھانہ سے سب کو ملوانے لایا تھا۔"
"میں وسیلہ سے بات کروں گی۔ پوچھوں گی میری دادی اسے کیسی لگیں۔ وہ تو جانتی ہی نہیں کہ اس کی دادی ہماری بھی کچھ لگتی ہیں۔"
"ہوں!" منصب نے تبصرہ محفوظ رکھا۔

پہلے سے وہ گھر آنے کی بات کر چکا تھا۔ تو اب یہ آئے سامنے ہی دادی کو ڈسکس کریں گی۔ وہ مسکرا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

"ہیلو؟" نئے نمبر سے آنے والی کال ریسیو کرتے تانیہ کا لہجہ کچھ اپنے آپ ہی محتاط سا ہو گیا
"السلام علیکم...... جی میم تانیہ سے بات ہو سکتی ہے؟"
"وعلیکم اسلام، جی میں تانیہ بات کر رہی ہوں۔ تانیہ کو لہجہ شناسا سا لگا لیکن پہچاننا مشکل ہوا۔"
"میں عیسیٰ احمد۔ آپ سے نمبر لیا تھا آپ کے آفس میں۔"
"جی سر، میں پہچان گئی۔ کیسے مزاج ہیں؟" وہ جانتی تھی عیسیٰ کسی علاقے کا پڑھا لکھا سردار ہے۔ طرز تخاطب اسی حساب سے موزوں تھا۔
"میں مخل تو نہیں ہوا آپ کی کسی مصروفیت میں؟"
"جی نہیں، میں گھر پر ٹکی ہی رہتی ہوں۔" وہ ہنس کر وضاحت دینے لگی "مجھے ابھی کوئی کام نہیں کرنے دیتی، خود ہی شوقیہ کچھ کر لوں تو اور بات ہے۔ خیر آپ بتائیے، صہیب کیسے ہیں؟"
"بظاہر تو ٹھیک ہی ہے۔ لیکن دوستوں وغیرہ سے پتا چلتا رہتا ہے کہ اپنی ضد کے معاملے میں ایک جگہ سے نہیں ہلا، اس کے دوستوں کا گلہ کہ صہیب کے پاس سوائے پریشے کے اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔"
"تو کیا لگتا ہے، مجھ سے ملنے کا معاملے میں کچھ ہوگا؟"
"ابھی میں نے بات نہیں کی، شاید کسی دن اسے اچانک ہی لے آؤں۔ بعد میں دیکھی جائے گی۔"
"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اسے یاد آیا کہ عیسیٰ اس سے اپنا کوئی ذاتی

مسئلہ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ سوچ میں تھی کہ خود بات شروع کرے یا عیسیٰ کو کرنے دے۔
"کسی طرح یہ الجھن سلجھ جائے، تو زندگی آگے کو رواں ہو۔ بعض معاملے الجھی گرہوں جیسے ہوتے ہیں، خود تو سلجھتے نہیں، دوسرے معاملات پر بھی اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔" وہ جیسے بہت مایوس ہو کر بولا تھا۔
"کیا صہیب کا مسئلہ بھی گھر کے باقی معاملات پر اثر ڈال رہا ہے؟" تانیہ نے سلجھے طریقے سے پوچھنا شروع کیا کہ ظاہر ہے عیسیٰ نے محض شب کے لیے تو کال نہیں کی ہوگی۔ پھر اس سے تو وہ ایک ڈاکٹر سمجھ کر ہر بات ڈسکس کرتا تھا۔ تانیہ کا سوال پوچھنا اسے ذاتیات میں دخل نہیں لگ سکتا تھا۔
"جی، کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ ذرا جھجکا۔
"پلیز آپ کھل کر بتائیے۔ میرے لیے سمجھنا اور مشورہ دینا آسان ہو جائے گا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"میں گھر میں سب سے بڑا ہوں، دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ صہیب سب سے چھوٹا ہے۔ بابا کے جانے کے بعد گھر، خاندان بلکہ علاقے کی سب ذمہ داری مجھ پر ہے۔ بہت سال ان تمام معاملات کو سمجھنے میں لگا دیے۔ پر اب جب وہ حالات قابو میں آئے تو صہیب کا مسئلہ شروع ہو گیا۔ میری والدہ میری شادی کے لیے پریشان رہتی تھیں لیکن صہیب نے اچانک ہی ایسے حالات بنا دیے کہ ہم سب کو اب اس کی شادی کا معاملہ اہم لگ رہا ہے۔ ادھر وہ ہے کہ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ دوسری طرف خاندان کی کچھ فیملیز ہیں، جہاں میری شادی کا معاملہ ڈن کرنے کی بات ہے۔"
"آپ کی شادی میں اگر رکاوٹ کوئی نہیں تو کر لیجیے، بنا دوسرے معاملات کو دیکھے۔"
"جی، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن یہاں بات

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

میرے مسئلے کی آجاتی ہے۔"

"آپ کا مسئلہ؟"

"وہی جو آپ سے کہا تھا۔"

"جی جی مجھے یاد ہے۔" تانیہ نے تصدیق تو کی لیکن دل میں حیران ہوئی کہ وہ بات تو کچھ ہنسی مذاق سے متعلق تھی۔

"دراصل میرے قریبی رشتہ داروں میں سے تقریباً ہر گھر میں میری ہم عمر کزن موجود ہے اور سب ہی گھرانے رشتہ دینے میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن۔ یہیں سے میرا مسئلہ شروع ہوتا ہے۔"

"جی جی آپ بتاتے جائیے۔"

"اچھا تیلی، سولہ برس کی عمر سے ہی مجھ پر خاندان برادری کی ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ گاؤں کا سردار ہونے کی بنا پر ہر جگہ عزت دی جاتی ہے۔ وہ سب ہی رشتہ دار جن میں ماموں تایا چچا وغیرہ شامل ہیں، بیٹی دینے پر ممنون دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ کزنز لڑکیوں کے رویے میں بھی یہی ممنونیت جھلکتی ہے۔ کسی طرح میں کسی کے لیے ہاں کہہ دوں اور وہ تمام عمر میری ممنون احسان رہیں۔"

"ہوں...... اچھا......" وہ بات سمجھ میں نہ آنے پر بھی سر ہلائے گئی۔

"اور...... مجھے ایسی شریک حیات کی تلاش ہے جو مجھ پر رعب جمائے۔"

"ہیں......؟" اس نے بری طرح چونک کر آنکھیں پھیلائیں اور منہ سے بے ساختہ ہی ہیں نکل گیا۔ جواباً عیسیٰ ہنسا تو بس کچھ ہی دیر تانیہ نے خاموشی کا وقفہ دیا پھر وہ بھی ہنستی چلی گئی۔

"میں نے کہا تھا نا...... آپ ہنسیں گی۔" عیسیٰ نے مصنوعی غصے سے منہ پھلایا لیکن وہ بے فکری سے ہنستی ہی رہی۔

"سوری...... لیکن جتنا صہیب کا مسئلہ اچھا خاصا سنجیدہ ہے، آپ کی پرابلم اتنی ہی غیر سنجیدہ ہے۔"

"مانتا ہوں یار، اسی لیے...... آپ سوری...... وہ "یار" کہنے پر [illegible] میں جھینپ کر رک گیا۔

"کوئی بات نہیں، آپ آرام سے اپنا نقطہ نظر بتائیے۔"

"میرے پاس اپنی اس شرط کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں، بس میں اس کلف لگی زندگی سے بیزار ہوں، میں اپنی ذاتی زندگی کو باہر کی فارمل زندگی سے قطعی مختلف بنانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر میں، میرے روم میں مجھے سردار نہیں دوست سمجھا جائے۔ لیکن بلیو می، یہاں کوئی ایسا نہیں جس سے ایسی توقع کی جائے، مجھے ان کے کم پڑھا لکھا ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ذہنی ہم آہنگی کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں ان میں سے کوئی بھی [illegible] میں میری دوست بننے کو تیار نہیں ہوگی۔"

"تو آؤٹ آف فیملی کوئی لڑکی آپ کی نظر میں ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر آپ کے لیے ایسی لڑکی کون تلاش کرے گا؟"

"وہ کوئی مسئلہ نہیں، بس کوئی مجھے اجازت تو دے۔"

"کوئی...... یعنی آپ کی والدہ؟"

"جی، بس ان ہی کا مسئلہ ہے۔"

"آپ نے اپنی شرط انہیں بتائی؟"

"شرط تو نہیں۔ ہاں یہ کہا ہے کہ مجھے خاندان میں بیاہ نہیں کرنا۔"

"پھر......؟"

"بس خفا ہو گئیں کہ تم بھی صہیب کی طرح چھوڑو کوئی شوشا۔"

"اوہ......" تانیہ نے ہنسی دبائی۔

"تو بتائیے۔ کیا کروں میں؟"

"رئیلی، مجھے فوری طور پر تو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا مشورہ دوں، لیکن اگر کچھ ٹائم مل

جائے تو......؟"

"اوشیور...... یہ معاملہ ویسے بھی ایمرجنسی وقت کا نہیں ہے۔ آپ آرام سے سوچ بچار کر لیں۔"

"شکریہ...... میں ان شاء اللہ دو، تین تک دوبارہ بات کرتی ہوں۔"

"اوکے۔ اللہ حافظ!" عیسیٰ نے بھی کال آف کر دی۔ جبکہ تانیہ اس کے بعد بھی دیر تک عیسیٰ کے ہی معاملے کو سوچے گئی۔

☆☆☆

"سوات کی گرمیاں گھر سے نکلنے گھومنے پھرنے کے لیے جتنی آئیڈیل ہیں، ہم سب اس حساب سے بہت سست ہیں...... بھئی۔"

رمشہ انہیں لیے کچن میں آ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ میکرونیز بناتے اور چائے پیتے وہ قریب آدھے گھنٹے سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"بالکل صحیح کہتی ہو...... میں تو خصوصاً دھکا دے کر نکلنے والوں میں سے ہوں۔" وسیلہ مسکرا دی۔

"تحریم کو بھی لانا تھا۔ وہ تو بالکل ہی نہیں نکلتی......"

"وہ تو نکلنے کے لیے ہر دیوار پھاند لینا چاہتی ہے۔" ایلیا زور سے ہنسی۔ "لیکن اپنے سڑو بھیا انسپکٹر لگے ہیں نا ان پر۔"

"اچھا، ویسے میرے انسپکٹر بھائی بہت نرم دل کے ہیں۔" رمشہ نے مسکرا کر یاد دلایا تو ایلیا اور وسیلہ دونوں شرمندہ ہو گئیں۔

"ہمیں بھی یہی مثال ملی تھی۔" وسیلہ نے ہنس کر ایلیا کو دھپ لگائی تو اس نے زبان دانتوں میں دبالی۔

"بھئی میرا مطلب ہے، وہ انسپکٹر ہو کر بھی عہدے کا رعب جما نہیں پاتے۔"

"نہیں خیر، رعب تو ہے۔" وسیلہ بالکل بے ساختہ بولی تو رمشہ اور ایلیا نے رک کر پلٹ کر اسے دیکھا۔ وسیلہ کی نظریں ملیں تو بری طرح جھینپ گئی۔

"میرا مطلب ہے۔"

"مطلب وطلب رہنے دو اور یہ گرما گرم کافی انسپکٹر بھیا کو اُدھر۔ بائیں ہاتھ کی بالکنی میں دے آؤ۔ آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔" رمشہ نے ایک بڑا کپ اسے تھما کر رخ موڑا تو وہ بھی دوپٹہ سیٹ کرتے بنا کوئی تبصرہ کیے باہر نکل آئی۔

اب منصب نے گھر بلایا تھا تو یقیناً بہن کو بتایا ہی ہوگا کہ وہ وسیلہ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ بائیں ہاتھ پر لاؤنج میں ہی بالکنی کا دروازہ تھا۔ گلاس وال بالکنی کے شیشے اور پردے مکمل ہٹے ہوئے تھے۔ باہر ڈھلان اور سامنے کی پہاڑی کا نظارہ یہاں سے بہت واضح اور بھلا معلوم ہو رہا تھا...... منصب لکڑی کی کرسی پر بیٹھا تھا ہاتھ میں موبائل لے رکھا تھا۔ وسیلہ کی آمد پر سلام کرتے مؤدب سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"وعلیکم اسلام۔"

"شکریہ۔" وسیلہ سے کافی کا مگ لیتے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"سوری!" آپ کو یہاں تک زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں، ویسے بھی نکلنا تو پڑ جاتا ہے، آنا جانا کہاں رک سکتا ہے۔ جیسے اس روز دادی وغیرہ اچانک آ گئے۔"

"وسیلہ! مجھے دراصل اسی بارے میں ہی بہت کچھ پوچھنا تھا۔ دل میں بہت سے سوال تھے۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی بات کو کہاں سے شروع کیا جائے۔"

"جی، میں بھی اسی بارے میں کھل کر بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اصل میں ارحم خان کی فیملی، ہم، آپ کہیں نہ کہیں تینوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں تو یہ بات حیرت میں ڈالتی ہے۔"

"زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوتی ہے کہ

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہماری ان سے رشتہ داری تو ہے لیکن جان پہچان بالکل نہیں۔" وسیلہ نے مزید کہا۔

"ہاں، یہ کچھ عجیب ہے...... تو ایسا کیوں؟"

"میرے بابا جان نے امی سے پسند کی شادی کی تھی۔ اور حویلی میں اس فیصلے کو پسند نہیں کیا گیا بس پھر کچھ اسی وجہ سے دوریاں بڑھیں اور۔"

"جی جی سمجھ سکتا ہوں۔ اور سوری آپ کے پرسنل معاملات میں ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"کوئی بات نہیں، دراصل میں خود جاننا چاہتی تھی کہ ارحم وغیرہ کیسے لوگ ہیں، کیونکہ باوجود رشتہ داری کے ہم اجنبی ہیں۔"

"لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اچانک دوبارہ سے کیسے۔"

"جی، وہ تو ارحم ایک دن اچانک ہی ہمارے گھر آگئے۔ انہوں نے کہا کہ برسوں پرانی رنجشوں کو بھول کر دوبارہ ایک ہو جانا چاہیے۔"

"تو آنٹی کا کیا کہنا ہے اس بارے میں۔ کیونکہ برسوں پہلے جو کچھ ہوا، وہ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔"

"ان کا تو صرف اتنا ماننا ہے کہ اگر دادی بھی چاہتی ہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ دادی کے کہنے پر ہی تو گھر چھوڑا تھا۔"

"اور...... یہی بات؟" منصب کا اشارہ رشتہ مانگنے والی بات کی طرف تھا۔

"امی کہتی ہیں، تمہارے بابا کی اتنی جائیداد ہے، اس طرح وہ ہمیں واپس مل جائے گی۔ اور ماموں کے فالج کا باہر ملک میں علاج ہو پائے گا۔"

"لیکن جائیداد تو حق ہے، اور رہا شادی وغیرہ کے۔"

"میں نے بھی یہی کہا۔" وہ سر جھکا گئی۔

"جی...... تو"

"وہ کہتی ہیں اگر شادی سے انکار کر دیا تو اتنی مشکل سے قریب آتے رشتوں میں قربت سے پہلے پھر دوریاں پیدا ہونے لگیں گی اور ہو بھی ہوسکتا ہے وہ جائیداد دینے سے بھی انکاری ہو جائیں۔"

"آپ تو خود وکیل ہیں۔ بابا کے حق کے لیے کیس۔"

"یہی سب تو امی ہونے نہیں دینا چاہتیں۔ کہتی ہیں بات مقابلے اور ضد کی آگئی تو کیا فائدہ فاصلے مٹانے کا، وہ کہتی ہیں، پرانی رنجشیں مٹانے کے لیے نئے رشتے جوڑنا خاندانوں میں معمول کی بات ہوا کرتا ہے۔ نہ صرف دل صاف ہو جاتے ہیں بلکہ محبت کے رشتوں میں اور زیادہ مضبوطی آتی ہے۔"

"ان کی بات سے انکار نہیں، یہ سب اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ لیکن وسیلہ پھر ہم......؟"

منصب نے صاف گوئی سے فوراً اپنے دل کی بات رکھی جبکہ خیالوں میں اکثر وہ یہ سوچتا تھا کہ یہ مرحلہ شاید ایسی سہانی راہوں میں آگے کہیں بہت دور پڑتا ہے۔ اور شاید کہ ایسا ہی تھا، وسیلہ کی جھکی پلکیں، خاموش لب بتاتے تھے کیا اسے یہ بات سننے کے لیے یہاں تک خود چل کر آنا چاہیے تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں وسیلہ! یہ میری زندگی کا انتہائی اہم قدم اس طرح اٹھانے کا نہیں تھا۔ آداب محبت کے خلاف ہے کہ آپ مطلوبہ کو اپنی جانب بلائیں، بجائے اس کے جایا جاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم اس بات کو اگنور کرکے آگے بڑھ سکتے ہیں۔" وسیلہ نے مسکرا کر اس کی آپ جناب کا بار کم کرنے کی کوشش کی۔ اس بار منصب بھی ہلکا پھلکا ہو کر ہنس دیا۔

"مجھے یقین ہے فوجیہ میں "انڈراسٹینڈنگ" ہمارا پرابلم کبھی نہیں بنے گی۔"

منصب کو اس کی موجودگی میں وضاحتیں کم سے کم دینا پڑتی تھیں، وہ بنا کہے تقریباً سب سمجھ لینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ فوجیہ کے ذکر پر البتہ

پلکیں پھر ہلا کے اٹھے ہی رہ گئیں تو منصب کو ایک بار پھر اپنی کوتاہی نے ماتھا پیٹنے پر مجبور کیا۔

"اللہ تمہیں پوچھے منصب۔"

"ہوں؟" وسیلہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

"سب سے پہلے مجھے آپ سے آپ کی مرضی پوچھنا تھی وسیلہ، لیکن میں برابر کچھ نہ کچھ ایسا کیے جارہا ہوں جیسے ہمارے تعلقات دو طرفہ کی بنیاد پر ہوں۔"

"آپ پولیس میں آنے سے پہلے خبریں پڑھتے تھے۔" وسیلہ نے ہنسی دبا کر پوچھا لیکن منصب نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

"مجھے بھی ابھی آدھے جملے کے دوران ایسا لگا جیسے میں خبرنامہ نشر کر رہا ہوں، میں نے کہا نا، ہمارے بیچ انڈراسٹینڈنگ نہ ہونے کا ایشو بھی نہیں آسکتا۔ لیکن ہاں۔" اس نے پھر چونک کر سر جھٹکا۔

"ہر بات سے پہلے مجھے آپ کے خیالات جاننا ہیں۔ میرا مطلب ہے، میں میمونہ کو رشتہ بھیجنے کے لیے بلانا چاہتا ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو ارحم خان سے پہلے میری بھی رشتے کرا سکتی ہیں۔"

"مجھے ارحم خان کے رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے لیے وہ سب انجان ہیں، پھر امی سے دور جانے کو دل نہیں مان رہا۔ میانوالی ہی میرا وطن ہے۔ گھر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑ جائے، اس کے لیے دل تیار نہیں ہوتا۔" وہ سر جھکائے وضاحت کے انداز میں ارحم کے رشتے پر اعتراض کر رہی تھی۔ منصب نے چہرا سنجیدہ رکھتے اسے بولنے دیا۔

"بس......؟" ایک لمبے وضاحتی بیان کے بعد منصب نے ہلکا سا مسکرا کر جواباً اتنا ہی کہا۔

"ہمارے بیچ انڈراسٹینڈ کرنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں اسی کی بات دہرائی۔ چہرا اجلی مسکراہٹ سے شگفتہ ہو رہا تھا۔

"بہا ابھی وکیل لگتی ہیں۔" وہ ہنس دیا۔

"بات نکلوانے کا ہنر تو آپ کے پیشے کا بھی حصہ ہے۔"

کچھ باتوں کا حسن نکلوا کر معلوم کرنے میں نہیں ہوتا۔"

"جی، یہ میں بھی مانتی ہوں۔ جذبوں کی سچائی دل سے دل تک اپنے آپ پہنچتی ہے۔"

"نہیں، یہاں اس میں چھوٹا سا ایک مسئلہ ہے۔" منصب نے دو انگلیوں سے چھوٹے کا اشارہ کیا۔ وسیلہ خاموشی سے دیکھے گئی۔

"دل سے دل تک پہنچنے میں آسانی تب ہوتی ہے جب جذبہ دونوں طرف ایک جیسا ہو۔ جہاں ایک دل جھکنا نہ چاہے، وہاں دوسرے کا جذبہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ دل جیتنا بھی ایک ہنر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک طرف کی محبت دوسرے کا دل تھوڑا وقت لگا کر سہی بہرحال فتح سے ہم کنار ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ یہ راہیں بہت کٹھن ہیں، یہاں راستے ہموار کم پرپیچ زیادہ ہوتے ہیں۔ خود کو کسی دھوکے سے بچانے کے لیے توازن برقرار رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ میرا آپ کو بلانا بھی ایسی ایک کوشش سمجھ لیں وسیلہ...... میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایسے معاملات میں دل دھوکوں کی زد میں آنے کو جیسے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی کے باقی ہر معاملے میں یہی ہم ہوتے ہیں کہ بڑے ہی زیرک معاملہ فہم اور حقیقت پسند دکھائی دیتے ہیں لیکن یہاں آکر اپنی بسائی دنیا کا فریب ہماری عقل پر ایسے اندھے پن کی پٹی باندھ دیتا ہے۔ آج آپ مجھے مایوس کر دیتیں تو فیصلہ کرنا، پیچھے ہٹنا تکلیف دہ سہی پر سہل ضرور ہو جاتا۔"

"لیکن میری کمی کو ستاتا......؟"

"وہ میں کرلوں گا ان شاء اللہ......

اور......" وہ ذرا دیر کو رکا۔

"آپ کی وکالت کسی دن کام آئے گی۔ جرح کیجیے بہر صاحبا! کچھ تو ہونے والے پارٹنر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔" اب وہ مسکرا رہا تھا۔ سے کتنا بڑا بوجھ ہٹا تھا وسیلہ کے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جوابی اظہار ہے۔
"میں جاؤں......؟" وہ اٹھنے لگی۔
"ویلے......" منصب نے بے اختیاری پکار
لیا تو وہ اٹھ نہیں پائی۔ منصب کے بلانے میں
نجانے کیا تھا اس کی نظریں اوپر نہیں اٹھ سکیں۔
"مجھے شدت سے انتظار رہے گا اس دن کا
جب یہیں اسی بالکنی میں مسز منصب اپنے ہاتھوں
سے بنائی کافی لیے یہاں آ کر بیٹھا کریں گی۔ پھر
اس خوشگوار گرماہٹ سمیت ہم آنے والی زندگی کا ہر
موسم ایک ساتھ انجوائے کریں گے۔"
"ان شاء اللہ۔" وہ ہنس کر کہتے اس بار رکی
نہیں۔ منصب مسکرا کر اسے جاتے دیکھتا رہا۔
آنکھوں میں مستقبل کا اتنا سہانا سپنا سجا تھا کہ اس
لمحے وہ پلکیں تک جھپکنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ آج صبح سے ہی بستر سے نہ نکلی تھی۔ گلا
خراب ہوا تو ہلکی سی حرارت بھی ہو گئی۔ امی نے
ماتھا چھوتے ہی صاف منع کر دیا کہ آج وہ اُسے
ہرگز کلینک نہیں جانے دیں گی۔ اور جب امی انکار
کر دیں تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی مرضی چلاتی۔ لہٰذا
سوئی ہی رہی۔ البتہ امی کی کوششوں سے ہی اب
سہ پہر آنے تک وہ بالکل فٹ اور فریش محسوس
کر رہی تھی۔ تب ہی موبائل ہاتھ میں لیے
برآمدے میں آ بیٹھی۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے
آنکھیں موندے وہ یونہی بیٹھی تھی کہ جب موبائل پر
کال آنے لگی۔ روشنی کی وجہ سے اسے نام دکھائی نہ
دے رہا تھا۔ بس بنا سوچے ہی کال اٹینڈ کر لی
"السلام علیکم ڈاکٹر ثانیہ!" ایک مردانہ آواز
نے بڑی بے تکلفی سے اس کا نام لیا تھا۔ وہ چونک
کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ذہن اس آواز پر غور کر رہا تھا
"مجھے لگا تھا شاید اب تک آپ نے میرا نمبر
میرے نام سے ضرور سیو کر لیا ہو گا۔" اس کے
جواب نہ دینے پر آگے سے مزید کہا گیا تو اس
مرتبہ ثانیہ نے بھی آواز پہچان لی۔
"اوہ آپ۔ سوری وعلیکم السلام۔" وہ ہنس
دی۔ "اصل میں باہر بیٹھی ہوں۔ موبائل
اسکرین دکھائی نہیں دے رہی تو۔"
"صحیح، صحیح۔" عیسیٰ کی فی الفور تسلی ہوئی۔
"تو...... سب خیریت...... طبیعت وغیرہ ٹھیک ہے آپ
کی؟" عیسیٰ نے کسی قدر تشویش سے استفسار کیا۔
"آپ کو کیسے پتا؟" وہ حیران ہو کر پوچھ
بیٹھی جس پر عیسیٰ ہنس پڑا۔
"آپ کو پتا ہے میں اس وقت کہاں سے
بول رہا ہوں۔"
"جی......؟" وہ کچھ نہیں سمجھی۔
"جناب میں اس وقت آپ کے بند کلینک
کے سامنے کھڑا اس بات پر افسردہ و پشیمان ہو رہا
ہوں کہ اتنی دور سے میرا یہاں آنا بے کار چلا گیا۔"
"اوہ......" ثانیہ نے بے ساختہ اپنے سر پہ
ہاتھ رکھا۔ وہ بھی کتنی بدحواس اور یکدم غائب دماغ ہو گئی
بیٹھی تھی۔ یہ وقت اس کے کلینک میں بیٹھنے کا تھا۔
"سوری وہ آج گلے کے درد اور بخار کی وجہ
سے گھر پر ہوں۔ معافی چاہتی ہوں آپ کو ناحق
تکلیف اٹھانا پڑی۔"
"کوئی بات نہیں، اور یہ بتائیں، آپ کی
طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ اب اپنی گاڑی میں
بیٹھ کر اسے دوبارہ اسٹارٹ کر چکا تھا۔
"جی الحمدللہ۔ امی نے اسٹیم، جوشاندہ،
غرارے ٹائپ ہر ٹوٹکا آزمایا ہے مجھ پر۔ ٹھیک تو
ہونا ہی تھا۔" وہ ہنس پڑی۔
"چلیں شکر ہے۔ یہ تو اچھا ہوا۔"
"جی لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کو بلاوجہ
تکلیف اٹھانی پڑی۔"
"ارے، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں قریب میرا
ایک دوست رہتا ہے۔ میں نے اس کو کال ملائی تھی، وہ
گھر پر موجود ہے، میں ابھی اس سے ملنے جا رہا ہوں۔"
"اوہ اچھا۔ یہ تو ٹھیک ہو گیا پھر۔" اسے ایک
گونہ تسلی ہوئی۔ "اور صہیب ٹھیک ہیں؟"
"جی، میں بھی بتانے کے لیے آیا تھا۔ ابھی
پچھلے روز باتوں باتوں میں، اس سے آپ کا ذکر کیا۔
میں نے اس سے کہا کہ اپنے ایک دوست کے کسی
بیٹے کے سلسلے میں میری ڈاکٹر ثانیہ سے اتفاقاً
ملاقات ہوئی اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بھی ایک بار ان
سے ملنا چاہیے کیونکہ وہ ایک بہت اچھی مشیر ہیں۔ اور
اچھی بات یہ ہے کہ وہ مان بھی گیا ہے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے، آپ مجھے بتا دیجیے کہ
مجھے کن باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔"
"سب سے پہلے تو یہی کہ آپ اس کی زبانی
اس کے حالات سنیں گی۔ اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا
کہ آپ کو پہلے سے سب معلوم ہے۔"
"جی، وہ میں سمجھ گئی، ایسا ہی ہونا چاہیے۔"
"باقی تو......" عیسیٰ سوچ میں پڑ گیا "آپ ہی
بہتر بتا سکتی ہیں کہ کن باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔"
"آپ بے فکر رہیں، میں ان شاء اللہ اچھی
طرح سنبھال لوں گی۔"
"جی مجھے یقین ہے۔" عیسیٰ کے لہجے میں
بھرپور اعتماد تھا۔
"بہت شکریہ!" وہ ممنون ہوئی "اور۔ باقی
سب خیریت رہی اتنے دنوں؟"
"جی، بس وہی...... امی اور میری بحث......"
وہ والی بات ثانیہ کی بھی سمجھ میں آ گئی۔
"لاحاصل بحث......؟" ثانیہ نے بھی
شرارت سے جملہ جوڑا۔
"جی بالکل لاحاصل...... پھر آپ نے بھی تو
کوئی مفید مشورہ نہیں نکالا اپنے دماغ سے۔" وہ
بے ساختہ شکوہ کر بیٹھا۔
"اصل میں آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے پاس
دوسرا کوئی آپشن بھی نہیں ہے امی کو بتانے کے لیے۔"
"ہوں، پھر تو لگتا ہے مجھے ہی شوشا چھوڑنا
پڑے گا۔"
"یعنی؟"
"امی کو لگتا ہے کہ اگر خاندان میں نہیں کرنا چاہتا
تو پھر باہر سے کم از کم کوئی لڑکی تو ظاہر کروں۔"
"اچھا ہی مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔" وہ
شوخی سے ہنسی۔
"تو ٹھیک ہے، پھر میں آج ہی انہیں ایک
نام دے دیتا ہوں۔"
"کوئی فیک (جھوٹا) نام؟" وہ چونکی۔
"ثانیہ سرفراز کوئی فیک نام تو نہیں۔"
"جی؟" اس کا گلا خشک ہوا۔
"کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟"
"لیکن آپ......" وہ بری طرح اٹک گئی۔ عیسیٰ
کی بات قطعی غیر متوقع تھی "آپ کو سوچ بچار کے بعد
"آپ کی بات درست ہے ثانیہ کہ ایسا پرپوزل
بنا سوچ بچار کے سامنے نہیں رکھنا چاہیے۔ لیکن آپ
جانتی ہیں میں نے آپ کا نام کس وجہ سے لیا؟"
"کس وجہ سے؟" اس کی آواز بہت گھٹی ہوئی سی تھی۔
"زندگی میں کچھ واقعے بنا وقت لیے انکشاف
جیسے داخل ہوتے ہیں۔ میرا گھر سے نکلنا، یہاں تک
آنا سراسر ایک معمول کی کارروائی تھی لیکن یہاں پہنچنے
پر جب میری نظر تالے پر پڑی تو ایک دم ہی اندر کسی
کمی اور مایوسی کے احساس نے بہت شدت سے غلبہ
پایا۔ مجھے اس وقت خیال آیا کہ جس کام کے لیے میں
اتنی دور سے اتنا سفر کر کے آیا ہوں، وہ تو ایک فون کال
پر بھی ہو سکتا تھا، لیکن میں نے یہاں تک آنے کے
لیے خصوصی وقت نکالا۔ البتہ یہ حقیقت نہ مل پانے کی
مایوسی کے بعد مجھ پر کھلی کہ دراصل یہ احساس ہے کیا۔"
"لیکن اگر آپ کچھ وقت لے لیتے۔"
"کیوں...... کیا آپ کو لگتا ہے آپ اپنے
پارٹنر کی اچھی دوست نہیں بن سکتیں؟" عیسیٰ اب
مسکرا رہا تھا۔
"پتا نہیں۔" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ
کال کاٹ دی۔ پتا نہیں عیسیٰ یہ بات کو کہاں لے گیا
تھا۔ پتا نہیں یہ سب ہونا چاہیے تھا؟ پتا نہیں۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ثمرہ بخاری

ودیعت مژگاں

گرمیوں کی خاموش طویل جلتی بلتی دوپہر کو اور بھی طویل لگنے لگتی ہے۔ جب تپتے ہوئے برآمدے میں کاٹنی پڑ جائے۔ زندگی کا چلن سمجھ سے باہر ہے۔ سب انسان برابر ہیں مگر کس طرح؟ کچھ تو اس وقت ٹھنڈے کمروں میں آرام کی نیند سو رہے تھے اور کچھ بچا کھچا کھا کر سائے کی تلاش میں ناکام اداس آنکھوں، خاموش زبان مگر بولتے چہروں کے ساتھ منتظر تھے۔ آس تو کوئی بھی نہیں مگر پھر بھی پتا نہیں تجھ میں کیا کشش ہے زندگی کہ تیرے نام سے ہی پیار ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں سورج کب ڈھلے گا۔ سانس کے ساتھ جلتی ہوا جسم کو اندر تک جلا دیتی تھی۔

برآمدے کے سامنے لان ہے۔ شام کو سانس لیتا پھلتا پھولتا لان اس وقت گرمی کی شدت سے بے جان دکھائی دے رہا تھا اور ایسی ہی حالت عدی کی بھی تھی۔ برآمدے میں اس کے لیے چارپائی ڈالی گئی ہے اور یہ گھر والوں کا احساس تھا۔ یہاں ایک پرانا سا پنکھا بھی چھت پر لگا ہوا ہے۔ جو ہوا کم اور آواز زیادہ دیتا ہے۔ یہ بھی اچھا ہے جو ہوا کم ہے۔ ایسی گرم ہوا جو بدن پر طمانچوں کی طرح لگتی ہے۔ اگر تیز ہوتی تو شاید عدی کی برداشت سے باہر ہو جاتی۔ سردیوں میں بھی یہی کمروں کی بیک پر بنا برآمدہ اس کی پناہ گاہ ہے اور گرمی بھی اسے یہیں گزارنی ہے۔ ہر موسم میں چقیں یہاں لگی رہتی ہیں اور گھر والوں کا خیال ہے عدی کو موسم کی سختی سے بچانے کے لیے یہ چقیں بہت کافی ہیں۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

یہ گھر یتیم عدی کے چچا اور تایا جان کا تھا۔ اڑتی اڑتی اس نے سنی تھی کہ اس گھر میں اس کے ابا کا بھی حصہ ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا حصہ کس طرح لیا جاتا ہے۔ تین وقت کی روٹی اور اس کے اسکول کا خرچ۔ بس وہ یہی جانتا تھا کہ چچا اور تایا اس پر بہت احسان کر رہے ہیں۔ یہ بھی اسے یوں پتا چل گیا کہ چچی اور تائی ہر آنے جانے والے کو بتاتی رہتی تھیں اور اس کی جان پر بھی ہزار مہربانیاں گنواتی تھیں۔ معصوم بارہ سالہ عدی احسانوں کے بوجھ تلے بری طرح دبا ہوا تھا۔ دبلا پتلا، سانولا سا یہ لڑکا، بچوں کو ہنستے کھیلتے ہر دکھ سے بے نیاز دیکھتا۔ ماں باپ سے لاڈ اٹھواتے۔ ان بچوں کو دیکھ کر کیا اس کے دل میں اپنی محرومی کا احساس دکھن نہیں بھرتا تھا۔ کیا وہ نہیں چاہتا تھا اسے بھی کوئی گلے لگا کر پیار کرے۔

صبح ناشتے کے وقت کچن میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ ناشتا عموماً تائی جان بناتی تھیں۔ ان کے تینوں بچے فرمائشیں کرتے۔

"امی! مجھے انڈا بنا دیں اور آملیٹ مجھے نہیں کھانا، مجھے ہاف فرائی چاہیے۔"

"امی! مجھے بٹر چاہیے۔"

"امی! میں نے سلائس اور جام لینا ہے۔"

ناشتا تائی جان بناتی تھیں، مگر چچی بھی کچن میں موجود رہتی تھیں۔ تا کہ اپنے دونوں بچوں کو وہ خود ان کی پسند کے مطابق ناشتا دے سکیں اور عدی کچن کے دروازے کے قریب خاموش انتظار میں کھڑا رہتا — کب یہ بچے ناشتا کر کے کچن سے نکلیں اور اس کی باری آئے۔

تائی جان کا صمد انڈا بنواتا تو بڑے شوق سے تھا مگر پورا کبھی نہیں کھاتا۔ چھوڑ دیتا تھا اور تائی جان وہ بچا ہوا ہاف فرائی انڈا جس کی صرف سفیدی ہی باقی ہوتی تھی، اس کے آگے رکھ دیتی تھیں۔ عدی خاموشی سے وہ انڈا، کسی کا بچا ہوا پراٹھا، کسی کے سلائس کے ٹکڑے اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیتا اور بڑی خاموشی سے سر جھکا کر کھا لیتا۔

دونوں عورتیں اسے یوں رغبت سے کھاتے دیکھتیں تو اپنے بچوں سے کہتیں۔

"دیکھا کیسے سب کچھ ہڑپ کر جاتا ہے۔ ایک تم لوگ ہو، دنیا جہان کی نعمتیں بھی سامنے رکھو تو اشتہا نہیں جاتی۔ ایک یہ ہے، لگتا ہے کچھ نہیں چھوڑے گا۔ سب کھا جائے گا۔"

"یہ تو بھوکا ہے، بھوکا۔" بچے نفرت سے اس دبلے پتلے، سانولے، بے کشش لڑکے کو دیکھ کر حقارت سے کہتے۔

وہ جیسے سنتا ہی نہیں تھا۔ نہ چہرے پر کوئی تاثر آتا، نہ زبان سے کچھ کہتا۔ یوں لگتا تھا کہ روح کی خاموشی اس کے دل میں آ کر ٹھہر گئی تھی اور اس کا وجود اس تپش سے جھلس کر رہ گیا تھا۔ بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ ہجوم میں اسے وحشت ہوتی۔ اکیلا بیٹھا نہیں کیا سوچتا رہتا تھا۔ چچا کہتے۔ "سوچنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور عقل عدی کے پاس ہے ہی نہیں، کیا پھر وہ بھلا کیسے سوچ سکتا ہے۔"

جو بچے ذہین ہوتے ہیں وہ خوب کھیلتے کودتے ہیں۔ ہر چیز کو بغور دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ عدی نہ کھیلتا کودتا، نہ ہی کسی چیز کو بغور دیکھتا۔ وہ گھر کے باقی بچوں کو دیکھتے ہی فوراً وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرتا۔ باقی سارے بچے ایک ہی اسکول میں جاتے تھے۔ انہیں وین لینے کے لیے آتی تھی۔ جبکہ عدی کا اسکول یہاں سے قریب ہی تھا۔ یہ سرکاری مڈل اسکول تھا۔ پتا نہیں وہ کیسا طالب علم تھا۔ پاس ہوتا تو کتنے نمبر لے کر۔ کبھی کسی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صمد اس سے ایک کلاس آگے تھا۔ ہر سال اس کی کتابیں عدی کے کام آ جاتی تھیں۔ صمد کتابیں سنبھال کر نہ رکھتا، اس لیے اکثر صفحے پھٹے ہوئے ہوتے تھے اور جب یہ کتابیں عدی کے پاس آتیں تو وہ انہیں بہت سنبھال کر بڑے پیار سے رکھتا اور بڑی حفاظت کرتا ان کی۔

صمد اور عدنان کے پرانے کپڑے بھی اسے مل جاتے — صمد اور عدنان کو نئے نئے کپڑے بنانے کا شوق تھا۔ یوں وہ ایک کپڑا بہت کم استعمال کے بعد اسے دے دیتے۔ کپڑے ہوتے تو اچھی حالت میں مگر صمد اور عدنان صحت مند تھے، قد میں بھی اس سے بڑے تھے۔ بے چارہ عدی ان کپڑوں کو پہن کر بھدا سا لگتا تھا اور جب بچے گھر آئے ہر مہمان کو بتاتے — کہ عدی نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں صمد اور عدنان کے ہیں۔ تب جو شکل عدی کی بنتی، وہ دیکھنے والوں کو اور بھی مضحکہ خیز بنا دیتی۔

"بے چارہ عدی کتنا دبلا سا ہے۔ کیسا کالا کالا سا رنگ ہے اس کا اور جب یہ بات کرتا ہے تو ڈر کر اس کے منہ سے غلط لفظ نکل جاتے ہیں۔" بیٹا اس پر ہنس کر بتایا کرتی تھی۔

وہ لوگ جان بوجھ کر اس سے الٹے سیدھے سوال کرتے اور جب وہ ہڑبڑا کر جواب دیتا تو سب کو ہنسی آتی تھی اور وہ سر جھکا کر اپنی موٹی موٹی آنکھیں دبلے پتلے سانولے ہاتھوں پر جما دیتا۔

☆☆☆

عدی اس گھر میں کسی فالتو اور بے جان شے کی طرح تھا۔ نہ اس کی کوئی آرزو تھی اور نہ ہی وہ زندہ انسانوں کی طرح ضرورتیں رکھتا تھا۔ ابھی پچھلے دو ماہ اس نے بغیر جوتوں کے گزارے تھے۔ گھر میں کسی کے جوتے خراب ہوتے تو اس کے حصے میں آتے تھے مگر بدقسمتی کہ سب کے جوتے ٹھیک ٹھاک تھے اور گرمی کے موسم میں اسے ننگے پاؤں پھرنا پڑ رہا تھا۔ شکر ہے کہ گرمی کا موسم تھا۔ اگر جو سردی ہوتی تو پھر کیا ہوتا اور یہ بھی شکر کہ گھر میں پہننے والے سلیپر خراب ہو گئے تھے۔ اگر جو اسکول کے شوز جو صمد کے دل سے اتر گئے تھے اسے مل گئے تھے، پھٹ جاتے تو پھر کیا ہوتا اور پھر پورے دو ماہ بعد چچا نے نئے جوتے خریدے، پرانے اسے مل گئے اور جب اس نے لڑکیوں والے سلیپر پہنے تو سب کو ایک تفریح ہاتھ آ گئی۔ کتنا ہنسے تھے سب، خاص کر بیٹا۔ اسے عدی پر بہت ہنسی آ رہی تھی اور عدی دونوں ہاتھ گود میں رکھے اپنی کالی موٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"اب جو ہمارے کپڑے پرانے ہو جائیں گے ہم وہ بھی عدی کو دے دیا کریں گے۔" نیلم کی بات پر ایک اور قہقہہ پڑا۔

عدی نے چاہا وہ اٹھ کر یہاں سے چلا جائے مگر اس کے پیروں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ ان میں اتنی جان بھی نہیں تھی کہ وہ اس کمزور جسم کا بوجھ سہار سکیں۔ اسے یہیں بیٹھ کر ان کی باتیں سننا تھیں۔

☆☆☆

گھر میں بہت صفائی کروائی جا رہی تھی اور ایک کمرہ بھی سیٹ کیا گیا تھا۔ یقیناً کوئی مہمان آ رہا تھا مگر کون؟ یہ عدی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے کوئی جستجو تھی۔ اسے تو تب پتا چلا جب کام کرنے والی ماسی نے اسے بھی کام میں اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ بتا رہی تھی۔

"تمہاری پھوپھو کا بیٹا باسم آ رہا ہے، وہ عمر میں تم سے کچھ بڑا ہے۔ صمد کا ہم عمر ہے۔ تمہاری پھوپھو بہت امیر ہے۔ وہ ایک زمیندار گھرانے میں بیاہی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی اچھا اسکول نہیں۔ اس لیے اب باسم یہاں صمد اور عدنان کے ساتھ پڑھے گا۔"

اس نے سب خاموشی سے سنا۔ کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا۔ اس کی ناصرہ پھوپھو بہت امیر ہیں اور جب وہ گھر میں آتی ہیں تو دونوں خواتین ان کے آگے بچھی جاتی ہیں۔ بچے بھی ان دنوں بہت مودب دکھائی دیتے ہیں اور پھوپھو اپنے ساتھ بہت سا گھی، مکھن، خالص دودھ، چاول اور موسم کا پھل لے کر آتی ہیں۔ خالص دودھ کی تائی کھیر پکاتی ہیں۔ کھیر عدی کو بہت پسند ہے، یہ بات کوئی نہیں جانتا تو ایک بار تائی جان کھیر پکا کر کچن سے نکلی تھیں، تب عدی دبے پاؤں کچن میں داخل ہوا تھا اور چمچے سے کچھ گرم گرم کھیر ایک کٹوری میں ڈال کر واپس اپنے بستر پر آ گیا تھا۔ اسے کھانے کی جلدی تھی کہ پکڑے جانے کا خوف بہت شدید تھا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور گرم کھیر کسی طرح ٹھنڈی ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ بس یہ واحد چوری تھی جو بارہ سالہ زندگی میں اس نے کی۔

ناصرہ پھوپھو کا بیٹا یہاں آ رہا ہے۔ اس نے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کوئی آئے جائے بھلا اسے اس سے کیا۔

گرمی بہت تھی اور اسکول کھلنے میں بس ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے کوئی نہ کوئی کتاب کھولے پڑھتا رہتا۔ جبکہ گھر کے باقی بچے دن کا بیشتر حصہ کھیلتے کودتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے گزار دیتے۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے گھر میں اس نے محسوس کیا۔ بڑے کمرے میں کچھ غیر معمولی شور ہے مگر وہ اٹھ کر ادھر گیا نہیں۔ جیومیٹری کا سوال حل کرنے میں مگن رہا۔ ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا وہ سوال حل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ کتابیں سمیٹ کر احتیاط سے بیگ میں ڈالیں اور پیتا کی چپلیں پہن کر وہ کچن کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

"ممانی! بھوک سے برا حال ہے، کب تک کھانا تیار ہو گا؟" ایک بہت صحت مند، اونچا لمبا، گورا چٹا لڑکا اس سے پہلے کچن میں موجود تھا۔ اس کا لباس، اس کا انداز سب ایسا تھا کہ عدی رک گیا۔ آگے جا نہیں سکا۔

"جاؤ، تم کمرے میں جا کر بیٹھو، بس ابھی کھانا لگا دیتی ہوں۔" چھوٹی چچی کے انداز میں پیار ہی پیار تھا۔

"وہ جو میری امی نے کباب بنا کر بھیجے ہیں۔ وہ ضرور گرم کر لیجیے گا۔"

"ہاں، بالکل۔ وہ تو میں نے فرائی کر لیے ہیں۔ بھئی بہت ہی مزے کے ہیں۔ ناصرہ آپا کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔"

"اچھا تو یہ باسم ہے، اس کی پھوپھو کا بیٹا۔ اس سے تقریباً دو برس بڑا مگر اس کا قد، کاٹھ، قابل رشک ہے۔ وہ بہت مضبوط اور توانا دکھائی دیتا ہے۔"

"یہ کون؟" اس نے عدی کو دیکھ لیا تھا۔

"یہ عدی ہے۔" چچی نے مصروف سے انداز میں بتایا۔

"اوہ، میرے منجھلے ماموں کا بیٹا۔" آپ کے چچی نے جواب نہیں دیا۔ وہ توے پر روٹی ڈالنے لگی تھیں۔

"ہیلو، میں باسم ہوں۔" اس نے عدی کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا اور عدی نے محسوس کیا اس کی مسکراہٹ میں اور اس کے خلوص میں اپنائیت کا احساس نمایاں ہے یا پھر احساس کمتری کے مارے عدی کو ایسا محسوس ہوا۔ بہرحال وہ بہت حیرت اور خوشی سے باسم کے اس انداز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ باسم اتنی اپنائیت کا مظاہرہ کرے گا اور گھر کے دوسرے افراد کی طرح نظرانداز کرنے کے بجائے خود اس کی جانب ہاتھ بڑھائے گا۔

ملازمہ کھانا میز پر لگانے لگی تھی۔ باسم نے ڈش سے ایک کباب اٹھایا تھا اور کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"امی نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں صرف میری خاطر۔ ورنہ وہ اتنی گرمی میں کچن میں کہاں جاتی ہیں، سب کام ہمارے نوکر کرتے ہیں۔ پورے چار نوکر تو ہم نے کچن کا کام کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے گھر میں روزانہ پانچ کلو کا گوشت نہیں پکتا اور ہر وقت ہماری بیٹھک میں ملنے والے موجود رہتے ہیں۔ ہم انہیں کھانا کھلائے بغیر نہیں بھیجتے اور ہم جو شربت انہیں پلاتے ہیں، وہ صندل سے تیار کرواتے ہیں۔ روزانہ کی ایک بوتل تو پورے آرام سے ختم ہو جاتی ہے۔ ابھی میرے آنے پر جو شربت آپ نے مجھے پلایا تھا، مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ آپ نے شربت ڈالنے میں بہت کنجوسی کی ہے۔"

اس بات پر عدی نے گھبرا کر چچی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ ضرور ایک زوردار جھڑکی باسم کو دیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ شرمندہ دکھائی دے رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

"آئندہ شربت تمہاری پسند کے مطابق تیار کروں گی۔ آج تو مجھے تمہاری پسند کا اندازہ نہیں تھا۔ یہاں شہر میں تو ایسے ہی بنایا جاتا ہے۔"

"اوں ہوں، شہر پر الزام مت دیں۔ میں کیا جانتا نہیں ہوں شہر اور شہر والوں کو۔ میری پھوپھو بھی تو اسی شہر میں رہتی ہیں۔ ان کے ہاں آپ لوگوں کی طرح کنجوسی نہیں کی جاتی۔ اکرامی اور پھوپھو جان

اور اپنی پھوپھو کے گھر ہی رہتا۔ میری ... آپ کے لیے اور بڑی ممانی کے لیے جو سوٹ بھیجے ... کتنے میں ہوئی ہے؟"

"پھوپھو جان! بہت خوب صورت ہیں، میں فون پر شکریہ ادا کروں گی۔"

"ہمارے ابا نے پورا ایک مرتبان آم کے اچار کا بھیجا ہے۔ یہ آم ہمارے اپنے باغ کے ہیں اور ہمارے نوکر بناتے ہیں، یہ بھی ہمارے بنائے ہیں۔"

"ہاں، بہت تکلیف کی آپا جان نے۔ بھلا کیا ضرورت تھی اتنا کچھ بھجوانے کی؟"

"یہ کچھ زیادہ تھوڑی ہے۔ ہم تو دیتے ہی ہیں۔" اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔

ملازمہ کھانا لگا چکی تھی اور اب انہیں بلا رہی تھی۔ چچی اور باسم باہر نکلے۔ عدی بھی دروازے ہی پر کھڑا تھا۔

"عدنان، تم کیوں رک گئے؟" اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سر جھکائے ان کے پیچھے چل پڑا۔

سب ہی موجود تھے اور سب ہی باسم کا انتظار ہو رہا تھا۔

"ہم بھائی! آپ نے عدی کے جوتے دیکھے ..." بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ عدی کے قدم رک گئے۔ باسم نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی ... مسکراہٹ مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"آؤ، رک کیوں گئے؟" اس کی آواز میں ... عدی کے قدم پھر سے اٹھنے لگے۔

... میں بہت کچھ تھا۔ ناصرہ پھوپھو کے ... چنے کی دال، بھونے والے ... کھانے کے لیے رائتہ اور قیمہ کریلے۔

... بہت مزے کا تھا۔ عدی کا جی چاہ رہا ... کھائے۔ ڈش اس کے سامنے ہی ... اور ایک اور بوٹی لینے کے لیے جس ... وہ اس میں نہیں تھی۔

اس نے تھوڑا سا پلاؤ کھایا پھر نیلم نے اپنی روٹی اور قیمہ کریلے والی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کھا لو، میں اب چاول کھاؤں گی۔"

اسے کریلے پسند نہیں تھے مگر اس گھر میں اس کی پسند ناپسند کو کوئی نہیں جانتا۔

"تم نے اپنا بچا ہوا کھانا عدی کو دے دیا؟" باسم نیلم سے کہہ رہا تھا۔

"آں ...ہاں!" ایک لمحے کو نیلم گڑبڑائی پھر بولی۔ "یہ عادی ہے۔ ہم اکثر اسے دے دیتے ہیں۔"

"عدی! تم نے میری ماں کے ہاتھ کے بنے کباب کھائے؟ وہ کباب بہت اچھے بناتی ہیں۔" یہ کہہ کر باسم نے دو کباب اس کی پلیٹ میں رکھ دیے۔

"اوہ، تمہارا بہت شکریہ۔" عدی نے چمکتی آنکھوں سے کبابوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں باسم کا شکریہ ادا کیا۔

"باسم اچھا ہے، بہت ہی اچھا۔" بس دل نے اسی وقت یہ فیصلہ دے دیا۔

باسم اس سے پہلے کھانا کھا کر اس کمرے میں چلا گیا جو اس کے لیے سیٹ کیا گیا تھا۔

"امی! وہ مربہ کب ملے گا جو پھوپھو نے ہمارے لیے بھیجا ہے؟" اس کے جاتے ہی عدنان بے صبری سے کہہ رہا تھا۔

"صبح ناشتے پر سب بچوں کو مربہ ملے گا۔" چچی نے بتایا۔

"اور پھوپھو نے مکھن بھی تو بھیجا ہے۔" بینا نے کہا۔

"وہ بھی صبح ملے گا اور آم ٹھنڈے کرنے کو رکھے ہیں۔ شام کو جب تم لوگ سو کر اٹھو گے تو ملیں گے۔" تائی جان بتا رہی تھیں۔ عدی کھانا کھا چکا تھا۔ جلدی سے کمرے سے باہر نکلا اور ادھر چل پڑا جہاں باسم کا کمرہ تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ باسم اٹیچی سے کپڑے نکال کر وارڈ روب میں لگا رہا تھا۔ وہ قریب آ گیا۔ ہاتھ سے سوٹ لے لیا۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

"لاؤ، یہ کام میں کرتا ہوں۔" اس کی ذرا سی توجہ نے عدی کو با اعتماد کر دیا تھا۔ وہ دھیمی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اجازت مانگ رہا تھا۔ باسم نے رکی سا بھی انکار نہیں کیا، بولا۔

"ہاں، مجھے عادت نہیں ہے۔ گاؤں میں میرے سارے کام ملازم کرتے ہیں مگر میری امی چاہتی ہیں۔ مجھے اپنے کام خود کرنے کی عادت ہونی چاہیے، اسی لیے میرے ساتھ کسی ملازم کو نہیں کیا۔ جبکہ ابا ایک چھوڑ دو دو ملازم ساتھ کرنے کو تیار تھے۔ میرے ابا بہت بڑے زمیندار ہیں۔ بہت پیسہ ہے ہمارے پاس۔ ماموں کا یہ جو گھر ہے۔ اوفہ! اگر امی نہ کہتیں تو میں کبھی یہاں رہنے پر راضی نہ ہوتا۔" اسے اچھا خاصا گھر پسند نہیں آیا تھا۔ وہ جتا رہا تھا۔

"ادھر گاؤں میں میرے ابا نے اتنا عالی شان گھر بنوایا ہے۔ تم لوگ دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ اصل میں ساری بات پیسے کی ہے۔ جتنا پیسہ ہمارے پاس ہے، یہ لوگ بے چارے تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب میری امی نے جو چیزیں بھیجی ہیں، انہیں دیکھ دیکھ کتنے خوش ہو رہے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا، سارے آم ابھی کھا جائیں۔ جبکہ ہم تو اب آموں کو دیکھتے بھی نہیں۔ بس جی بھر گیا ہے۔"

عدی سارے کپڑے الماری میں لگا چکا تھا۔ بس اب اس کی باتیں سننے کو کھڑا تھا۔

وہ کتنا امیر ہے، اس کے پاس کیا کیا ہے، عدی یہ سن کر بالکل متاثر نہیں ہوا۔ اسے متاثر کیا تو باسم کے اخلاق نے۔ وہ اسے بھی اپنے دوسرے کزنز کی طرح سمجھ رہا تھا۔ اتنی ہی، بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ یہ بات عدی کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

"اوہ، ہاں رکو ذرا۔" عدی جانے لگا تو اس نے پکارا۔ وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کالا والا بیگ کھولو اور اس میں ایک سفید شاپر ہے، وہ نکالو۔"

عدی نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

شاپر نکال کر کھولا۔ اس میں بالکل نئے بہت اچھے سلیپر تھے۔

"ارے یہ نہیں، یہ تو نئے ہیں۔ میں نے ابھی پہنے بھی نہیں۔ دوسرا شاپر کھولو اور اس میں جو سلیپر ہیں وہ تم لے لو۔"

"اوہ۔" عدی کے لبوں پر بے اختیار تشکر کے کلمات آ گئے۔

"آپ کا بہت شکریہ باسم بھائی!" عدی سراپا شکر گزار تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔

"آپ اب ادھر ہی رہو گے؟" عدی کو بہت خوشی ہو رہی تھی۔

"ہاں، میری امی نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میں اپنی امی سے بہت پیار کرتا ہوں، ان کی ہر بات مانتا ہوں اور مجھے ان کی بات مان کر کبھی نقصان نہیں ہوا۔"

"مائیں بہت اچھی ہوتی ہے۔" عدی کے انداز میں پیاس بھی تھی، بھوک بھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟ تمہاری تو کوئی ماں نہیں ہے؟"

"اسی لیے تو مجھے زیادہ پتا ہے۔" عدی کی آواز ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ وہ بار بار پلکیں جھپکنے لگا تھا۔

کچھ دیر کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ باسم بستر پر دراز تھا۔ عدی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھائے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"اچھا اب تم جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

تب عدی اثبات میں سر ہلا کر باہر آ گیا۔ اب اس کے پاؤں میں باسم کے سلیپر تھے اور پرانے جوتے اس نے اسٹور میں پھینک دیے۔

اور پھر یہ بھی اسی شام کا ذکر ہے۔ ملازمہ بلانے پچھلے برآمدے میں آئی تھی۔ وہ ابھی ابھی فزکس کے سوال حل کر کے فارغ ہوا تھا۔ ابھی اسے ایک اسٹوری لکھنی تھی اور اسلامیات کا کچھ کام بھی کرنا تھا۔ وہ ایک روٹین سے پڑھنے کا عادی تھا اور یہ عادت کسی نے اس روٹین میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ گھر کے کام کاج کے لیے دو ملازم موجود تھے۔ بازار وغیرہ کے کام کے لیے دوڑیں نہیں لگانی پڑتی تھیں۔ ورنہ اس کی کمزور جان کہاں تک کر سکتی تھی۔

"باسم کا پیغام لے کر ملازمہ آئی تھی۔ بتا رہی تھی۔

"وہ ٹی وی لاؤنج میں ہیں اور آپ کو بھی بلا رہے ہیں۔"

"وہاں سب موجود ہوں گے اور اس کا مذاق نہ بنایا جائے، یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ کچھ بد دل ہوا۔ جانے میں تامل تو تھا مگر باسم نے بلایا تھا، اس لیے جانا ہی تھا۔

لاؤنج میں سب ہی چھوٹے بڑے موجود تھے۔

"ارے تم نے یہ اتنے اچھے جوتے کہاں سے لیے؟" سب سے پہلے عدنان کی نظر پڑی پھر سب ہی بےاختیار اس کے پیروں کی طرف دیکھنے لگے۔ واقعی بہت اچھے اور خاصے قیمتی لگ رہے تھے مگر تھے اس کے پیروں میں بڑے۔

"مجھے باسم بھائی نے دیے ہیں۔" وہ ہولے سے بولا۔

"اچھا اچھا باسم کے ہیں۔" سب ہی پھر کچھ کام میں لگ گئے۔

"عدی! میری امی نے سب بچوں کے لیے کچھ تحفے بھیجے ہیں، اسی لیے تمہیں بلایا تھا۔ تمہارے لیے سوٹ اور گھڑی ہے۔"

"ارے اتنا اچھا سوٹ اور گھڑی۔" گھڑی تو اس نے صرف خواب میں ہی سوچی ہو سکتی تھی۔

"سوٹ تو اچھا خاصا قیمتی لگ رہا ہے۔" چچی کو برا لگا تھا۔ وہ چاہ رہی تھیں جو سوٹ عدی کے لیے بھیجا گیا ہے، اس سے عدی کا سوٹ بدل دیں۔ عدنان والے سوٹ کا رنگ انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔

"کپڑے تو سارے ہی قیمتی ہیں۔ ہم کوئی فرق تو کرتے نہیں۔" باسم کے انداز میں

"عدی کو پھوپھو نے گھڑی بھیجی، ہمیں نہیں بھیجی۔" صمد اور عدنان نے اعتراض کیا۔

"جب تمہاری پھوپھو آئیں گی تو ان سے شکایت کرنا۔ مجھے کیا کہتے ہو۔" باسم کا انداز کتنا لاپروا تھا۔ اسے کسی بڑے چھوٹے سے کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔

"عدی! تمہیں پسند آئیں اپنی چیزیں؟"

"جی ہاں باسم بھائی! بہت، بہت زیادہ۔" خوشی اس کی آواز سے بھی چھلک پڑی تھی۔

"صبح میں نے اپنے کپڑے دینے ٹیلر کے پاس جانا ہے۔ تم بھی ساتھ چلنا۔ تمہارا سوٹ بھی سلوا دوں گا۔" اور چچی کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی کہ وہ عدی کے سوٹ کو بدل دیں گی۔

"تم تو کسی مہنگے والے ٹیلر سے سلواؤ گے؟ عدی کو رہنے دو، یہ گاموں کے ساتھ جا کر اپنا سوٹ دے آئے گا۔ گاموں کی بیوی بھی کپڑے سیتی ہے۔" صمد کے انداز میں عدی کے لیے حقارت تھی۔

"تو اتنا اچھا کپڑا گاموں کی بیوی سے سلوا کر خراب کروانا ہے کیا؟ اور سلائی کی تم کیوں فکر کرتے ہو، تمہاری جیب سے تھوڑا جائے گا۔ میں دوں گا عدی کے سوٹ کی سلائی۔"

"سلائی کی فکر والی بات نہیں، آخر اتنے سال سے ہم اسے پال ہی رہے ہیں۔ کوئی تھوڑا خرچ آتا ہے اس پر۔" تائی اماں نے صمد کی مدد کے لیے کہا۔

"ارے خرچ کی ہم بچے تو پروا ہی نہیں کرتے۔ بڑی ممانی! آپ نہیں کتنے ہیں جو ہمارے گھر سے صبح شام مفت میں روٹی کھا رہے ہیں۔"

"ہاں بچی، ناصرہ کو اللہ نے دیا بھی تو بہت ہے۔" ممانی نے سر ہلایا اور دل کی جلن کو چہرے پر نہیں آنے دیا۔ "ہائے کیا رکھا ہے اس ناصرہ میں۔ پتا نہیں اللہ کو کیا ادا بھائی جو اتنے اونچے گھرانے میں بیاہی گئی اور ہم جیسی رل رہی ہیں اس گھر میں۔" وہ بس سوچ کر ہی رہ گئیں۔

"کیا خیال ہے باسم بھائی! آئس کریم کھانے چلیں۔ یہیں قریب ہی بہت اچھی مارکیٹ ہے۔"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پھر چڑ جاتی ہے۔ آئس کریم، فالودہ، چکن تکہ، گول گپے، چاٹ وغیرہ۔'' نیلم بڑی چٹوری تھی اور اسے پتا تھا باسم کے پاس پیسہ خوب ہوگا۔

''اوں ہوں۔ کھانے پینے کی ہوس نہیں ہے مجھے۔ وہاں ہمارے گھر میں میرے کمرے میں جو فریج تھا، وہ ہر وقت بھرا رہتا تھا۔'' نیلم منہ بنا کر رہ گئی۔

''پھر کیا پروگرام ہے۔ کوئی گیم کھیلتے ہیں؟'' یہ تجویز عدنان کی تھی۔

''گیم تم لوگ کیا کھیلو گے۔ پتا ہے وہاں میرے پاس ایک گھوڑا بھی تھا۔''

''گھوڑا؟'' سب ہی کو تعجب ہوا۔

''جی ہاں۔ ایک جیتا جاگتا اعلا نسل کا گھوڑا۔ میں شام کو اسے لے کر نکلا کرتا تھا۔ اس پر سوار ہو کر جدھر سے گزرتا تھا، لوگ بس دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ امی نے مجھے یہاں بھیج دیا، میرا تو بالکل موڈ نہیں تھا مگر میں امی کی کوئی بات ٹال بھی تو نہیں سکتا۔''

باسم اپنی باتیں سناتا رہا۔ کچھ متاثر ہوتے رہے، کچھ دل ہی دل میں جلتے رہے۔ جبکہ عدی یہاں موجود ہونے کے باوجود موجود نہیں تھا۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ باسم کے پاس کتنی دولت ہے اور اس کے باپ کی پہنچ کہاں تک ہے۔

تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر اسکول کھل جائیں گے۔ جاتے ہی بیپر ہوں گے۔ میری تیاری تو کافی اچھی ہے۔ میرا خیال ہے میں انگلش پر زیادہ محنت کروں۔ مجھے انگلش کچھ مشکل بھی لگتی ہے۔ مگر اتنی نہیں جتنی بینا، صمد اور عدنان کو لگتی ہے۔ یہ لوگ ٹیوشن بھی پڑھتے ہیں پھر بھی ان کو کچھ نہیں آتا۔ ہر سبجیکٹ ان کے لیے بور اور مشکل ہے۔ مگر مجھے پڑھنا لکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اسکول جانا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ وہاں ٹیچر امیر غریب کو نہیں دیکھتے، وہ صرف اس سے پیار کرتے ہیں جو لائق ہوتا ہے اور میں بھی اپنی کلاس کا لائق لڑکا ہوں۔ بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر اسکول کھل جائیں گے۔ اب تو باسم بھائی بھی یہاں ہیں۔ میں پڑھائی میں ان سے بھی مدد لے سکتا ہوں۔ وہ بہت اچھے ہیں، ضرور میری مدد کریں گے۔

''میری امی نے اتنے سارے آم بھی تو بھیجے تھے آپ لوگوں کے لیے۔ کہاں ہیں وہ؟'' آم ٹھنڈے کرنے کو رکھے ہیں۔ ابھی لاتی ہوں۔'' تائی جان فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''چھوٹی ممانی! کھا کر بتایئے گا کیا ایسے آم آپ نے پہلے بھی کھائے ہیں؟ یہاں بازار میں ملنے والا مہنگے سے مہنگا آم بھی ہمارے باغ کے آموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے باسم بھائی!'' بینا خاصی مغرور سی لڑکی تھی۔ اب باسم کی مسلسل لمبی باتیں اس کی برداشت سے باہر تھیں، بول ہی پڑی۔

''ایسی ہی بات ہے، تم کھا کر بھی نہ مانو تو دوسری بات ہے۔'' وہ ایک دم سے بہت سیریس ہو گیا تھا اور بڑے طنز کے ساتھ اس نے بینا سے بات کی تھی۔

''آپ کا کیا خیال ہے، ساری نعمتیں صرف آپ کے گاؤں میں ہی ملتی ہیں۔ اصل میں آپ نے صرف گاؤں دیکھا ہے نا، اس لیے ایسا سمجھتے ہیں۔'' بینا نے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ اب غصے سے جھنجھلا کر بھی رہ گئی تھی۔

باسم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو، میں پہلی بار شہر آیا ہوں۔ ارے تم نے تو صرف اپنا یہ شہر ہی دیکھ رکھا ہے نا اور اس کی بھی صرف وہ جگہیں جہاں داخلے کے لیے ٹکٹ نہیں ہے۔ میں نے تو پورا پاکستان دیکھ رکھا ہے۔ بڑا ہی اچھی جگہ، بڑے بڑے ہوٹل اور سیر گاہیں۔''

''میرا خیال ہے کوئی اور بات کرتے ہیں۔ عدنان چینل چینج کرو، کیا بور پروگرام آ رہے ہیں۔'' صمد صرف بات بدلنے کو کہہ رہا تھا۔

''اسپورٹس چینل لگا دو۔'' باسم نے کچھ حکم کے انداز میں کہا تھا۔ صمد کو یہ تجویز پسند تو نہیں آئی مگر کہا کچھ نہیں اور اس کی پسند کا چینل لگا دیا۔

☆☆☆

رات کو باسم نے سب کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں ہمیشہ سے رات کا کھانا اپنے کمرے میں کھاتا ہوں۔ میرے لیے کھانا یہیں بھیج دیں۔''

''یہ تو بڑے نخرے کرتا ہے امی!'' بینا نے منہ بنایا تھا۔

''چپ کرو، لاڈلا ہے اپنی ماں کا۔''

''جو ماں کے لاڈلے ہوتے ہیں سب ہی ان کے نخرے اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں میں کیا بے مایہ، بے حیثیت۔'' ترسے ہوئے عدی نے سر جھکا کر یہ سوچا تھا اور اپنی خالی جھولی کی طرف دیکھا تھا۔

پھر آٹھ بجے کے قریب جب باسم اپنے بستر پر بیٹھا تو عدی کھانے کی ٹرے اٹھائے چلا آیا۔

''اچھا لے آئے ہو کھانا؟'' اس نے رکھی سا شکریہ ادا نہیں کیا۔

''جی باسم بھائی! دیکھ لیں۔ اگر کوئی چیز کم ہے تو میں لے آتا ہوں۔''

باسم نے ٹرے کا جائزہ لیا۔ ''ہاں یار! دیکھو اگر کباب رکھے ہوں تو وہ بھی لے آؤ۔''

''میں نے دیکھے تھے ملازمہ سے بھی پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کباب تو ان لوگوں نے سارے ختم کر دیے ہیں۔''

''کیا اتنے سارے کباب یہ لوگ اتنے سے لوگ ان میں کھا گئے۔ جنم جنم کے بھوکے لگتے ہیں۔'' اس نے مذاق اڑایا تھا۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' مؤدب کھڑے عدی نے اجازت طلب کی۔

''ہاں ٹھیک ہے، جاؤ مگر سنو۔'' پیچھے سے پکارا۔

''جی'' وہ سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''میرا ایک سوٹ تو استری کر دو۔ کپڑے استری کرنا آتے ہوں گے تمہیں؟''

''کبھی اس طرح کے کام کبھی کیے تو نہیں لیکن امی کو اکثر پچھلے برآمدے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا اور دیکھتا رہتا تھا کہ کپڑے کیسے استری کیے جاتے ہیں۔''

''ہاں تم کوشش تو کر کے دیکھو، یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ ادھر الماری سے یہ اسکائی بلیو سوٹ نکال کر استری کر دو۔''

''اس وقت کہاں جائیں گے آپ؟'' عدی نے یونہی پوچھ لیا۔

''کہیں نہیں یار! بس مجھے عادت ہے، اچھا لگتا ہے۔ ایک دو سوٹ بالکل تیار الماری میں ٹنگے ہوں۔ جب کہیں جانے کو دل چاہے، نکالو اور پہن لو۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' عدی نے اتفاق ہی کرنا تھا۔

''پرسوں میں اپنی پھوپھو کے گھر جاؤں گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔''

''مگر باسم بھائی! میرے پاس نہ تو اچھے کپڑے ہیں، نہ کوئی جوتے ہیں۔ میں تو اسکول کے علاوہ کہیں بھی نہیں جاتا۔''

''جوتوں اور کپڑوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں کل بازار لے جا کر نئے خرید دوں گا۔''

''مگر آپ مجھے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟'' وہ جھجک رہا تھا۔

''تم نے محسوس نہیں کیا شاید۔ یہ بینا لوگ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں میں ان سب پر یہ ثابت کروں گا۔ تم میرے لیے ان سے زیادہ اہم ہو۔ تم میرے دوست ہو، یہ سب اتنے اچھے نہیں ہیں کہ میں ان سے دوستی کروں۔''

''اوہ!'' بےساختہ مسکراہٹ عدی کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ ''آپ جو کہیں گے، میں وہ مانوں گا۔''

☆☆☆

عدی نے جو وعدہ کیا اس پر پوری طرح قائم بھی رہا۔ آج اتنے سال گزرنے کے باوجود وہ اپنے وعدے پر قائم تھا۔ پورے آٹھ سال کچھ کم عرصہ تو نہیں ہوتا۔ جب باسم یہاں آیا تھا، تب عدی بارہ سال کا تھا۔ اب پورا نوجوان لڑکا تھا۔ دبلا پتلا، سانولا سلونا، موٹی موٹی خوب صورت آنکھوں والا محنتی لڑکا جو آج باسم بھائی کی ہر بات کو ایمان سمجھنے لگا

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھا۔ اب وہ اور باسم ایک ہی کلاس میں تھے۔ وجہ یہ کہ باسم کو تعلیم سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ دو مرتبہ فیل ہو کر اس کے ساتھ آملا تھا۔ مگر دونوں کے کالج اور سبجیکٹ الگ الگ تھے۔ عدی نے پری انجینئرنگ میں بی ایس سی کرتا تھا، جب کہ باسم نے وہ سبجیکٹ چنے تھے۔ جن کے بارے میں ہر کوئی کہتا ہے۔ ان سے آسان اور کوئی مضمون نہیں ہے۔ ویسے باسم پڑھائی میں اتنا کمزور ہونے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔ وہ کہتا۔ ''مجھے کون سا ملازمت کرنی ہے۔ میرے بابا کہتے ہیں تم جہاں کہو گے جس چیز کی کہو گے، تمہیں مل لگا دوں گا۔

''ویسے باسم کے بابا اتنے بھی امیر نہیں جتنا کہ وہ ظاہر کرتا ہے۔'' یہ بات عدی کے علاوہ سب ہی کہتے تھے مگر عدی کو باسم کی ہر بات پر سو فیصد یقین تھا۔ باسم اس کا مہربان، ہمدرد اور مسیحا تھا۔ کئی بار وہ سوچتا۔

اگر یہ نہ ہوتا تو آج اس کی زندگی کیا ہوتی۔ اس کے آجانے سے یہ احساس جاگا تھا۔ کوئی اپنا بھی ہے اور یہ بھی کہ اپنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ باسم اور عدی قد میں اب برابر تھے مگر باسم کے مقابلے میں وہ بہت دبلا پتلا تھا، اس لیے باسم کے دل سے اتر جانے والے کپڑے اب بھی درزی سے ٹھیک کروا کر ہی وہ پہن سکتا تھا۔ ہاں جوتے کا نمبر اب ایک تھا اور اس سے عدی کو کافی فائدہ ہوا تھا۔

اسکول کے بعد پھوپھو ناصرہ نے کہا تھا۔ اگر باسم کالج کی تعلیم ہوسٹل میں رہ کر حاصل کرنا چاہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں، مگر اب وہ خود ہی اس ماحول کا عادی ہو چلا تھا۔ یہاں ماموؤں کے بچے اس سے کس قدر امپریس ہو چکے تھے۔ اس کے قیمتی قلم، فائل، کپڑے، جوتے۔ غرض وہ کون سی چیز نہیں جو انہیں حسرت میں مبتلا کر دے۔ اکثر وہ بہت مودبانہ لہجے میں اس سے گزارش کرتے تھے۔

''صرف ایک دن کے لیے اپنا قلم یا فائل اسے عنایت کر دے۔'' اب تو چنا بھی اس سے دبی دبی رہتی تھی پھر وہ ایسی زندگی کو چھوڑ کر ہاسٹل کیوں شفٹ ہوتا۔

ناصرہ پھوپھو نے باسم کے لیے اوپر کی منزل پر دو کمرے بنوا دیے تھے۔ صمد اور عدنان نے کہہ دیا تھا۔ جب یہ تعلیم مکمل کر کے یہاں سے جائے گا تو یہ کمرے ہمارے ہوں گے۔ وہ جس میں تالا لگا دیا گیا ہے۔ وہ کمرہ عدنان نے لینا تھا۔ دوسرا صمد کے حصے میں آئے گا۔ وہ بھی خاصا بڑا اور خوب صورت تھا۔ خاص کر وارڈ روب بہت اچھی تھی اور اس کمرے کی ایک کھڑکی پچھلی جانب کھلتی تھی جدھر لڑکیوں کا اسکول تھا۔ وہاں رونق بھی ہوتی تھی، درخت بھی بہت تھے، اس وجہ سے فضا اچھی رہتی تھی۔ اب تو انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو تھیں۔ خدا خدا کر کے باسم بی اے فائنل تک آ ہی گیا تھا۔ چلا جائے گا کچھ عرصے میں پھر یہ کمرے ہمارے ہوں گے۔

ویسے باسم کے یہاں رہنے سے گھر والوں کو فائدے بہت تھے۔ گاؤں سے موسم کا پھل موسم کے حساب سے آتا تھا۔ دودھ، مکھن اس کے علاوہ اور گاؤں کی بہت سی سوغاتیں، باسم کے نخرے سے اس کے کام کرنے کو تو عدی موجود تھا۔ وہی کپڑے استری کرتا، الماری میں رکھتا اور اس کی الٹی سیدھی بہت سی فرمائشیں بھی پوری کیا کرتا تھا۔ باسم کی بائیک کی صفائی، باسم کے کپڑے ٹیلر کو دے کر آتا، سامان کا دھیان رکھتا اور کبھی کبھی اس کے جوتے پالش کرنا بھی عدی کی ذمہ داری ہو جایا کرتی تھی۔ سب لوگ عدی کو طرح طرح کے طعنے دیتے مگر عدی نے پروا نہیں کی۔ کرتا بھی کیوں۔ یہ لوگ باسم کی میرے ساتھ اتنی محبت دیکھ کر جلتے ہیں۔ جس لڑکے کو انہوں نے گھر کے پچھواڑے میں کسی بے کار سامان کی طرف پھینک رکھا تھا۔ باسم نے اسے دوست بنا لیا ہے۔ اپنے برابر جگہ دی ہے مجھے باسم کے علاوہ کسی کی پروا نہیں۔

باسم اگر رات کو دس گیارہ بجے بھی جائے یا دودھ سوڈے کی فرمائش کر دیتا تو عدی بنانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ جواب میں اس نے بھی شکریہ ادا نہیں کیا اور شکریہ ادا کرنے کی بات بھی نہیں ہے۔ دوستوں میں یہ تکلفات بھلا کہاں چلتے ہیں۔ عدی

لگا کر پڑھ بھی رہا تھا۔ اور سنہرے مستقبل کے خواب بھی دیکھ رہا تھا۔ باسم نے کہا تھا تمہیں نوکری کے حصول کے لیے دردر ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں گی۔ میرے بابا بہت پہنچ والے آدمی ہیں۔ تم جہاں کہو گے تمہیں نوکری مل جائے گی۔ ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر جہاں کسی کی جھڑکیاں نہ ہوں سے جھجک نہیں ہوگی کہ اس پر چوری کا الزام آسکتا ہے۔ کیوں کہ اب وہ برآمدہ جہاں بچپن میں ٹک ڈال کر اس کے لیے کمرہ بنایا گیا تھا، اب اس کے آگے سیمنٹ کی جالی لگا دی گئی ہے اور تائی دونوں کہتی ہیں۔ ہم نے عدی کو ایک بہترین کمرہ دے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کہ ہمارے پاس کمرے کم ہیں مگر عدی کو ایک اچھے سے کمرے کی شدید آرزو ہے، جہاں بڑی بڑی کھڑکیاں ہوں اور دروازے بھی گے ہوں۔ برآمدے میں اس جالی سے سردیوں میں ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ گرمیوں میں اوستائی ہے۔

باسم کے پاس اوپر دو کمرے ہیں مگر دونوں ہی اس کے استعمال کے ہیں۔ اس کے ملنے والے بھی آتے ہیں۔ ایک کمرہ تو ملنے والوں کے لیے چھوڑا ہے اور عدی کی آرزو ہے اس کے پاس سواری ہو۔ چاہے سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل ہو مگر جب اسے بھی تائی کی فرمائش پر اتنی دور دور پیدل جانا پڑتا ہے کہ انہیں یہ وہم ہے آس پاس کے دکان دار کرنے والے سب کچھ رنگ کرتے ہیں۔ لے کے دیتا ہیں، کیسی کیسی چیزیں وغیرہ۔ اف کتنا مشکل ہے یہاں بغیر سواری کے ویگن میں دھکے کھاتے ہوئے جانا۔ بس دو چھوٹی چھوٹی خواہش ہیں۔ چھوٹا سا گھر، پرانی موٹر سائیکل، جیب میں پیسے اور باسم کہتا ہے میں تمہیں یہ سب دلوا دوں گا۔ بس باسم کا شکر گزار نہ ہو تو پھر کیا کرے۔

اوپر پہنچ گیں تو چچی کی کڑھائی والی قمیص دیکھا۔ چچا پر کچھ عورتیں ہاتھ کی کڑھائی کا کام کیا کرتی تھیں۔ چچی نے اپنی بہن کو لندن کچھ کڑھائی والے دوپٹے اور قمیص بھجوانی تھیں۔ ابھی صرف ایک قمیص تیار ہوئی تھی، باقی کے لیے اس عورت نے کہا تھا مہینے کے آخر تک ہی مل سکے گی چچی کو بڑی جلدی تھی۔ ویسے تو کسی کو کڑھائی ہوئی قمیص دینے کے لیے اتنی گرمی میں اسے بھیج دیا تھا۔ پر پیچ تنگ اور گندی گلیاں تھیں کہ اسے تو کبھی صفائی پسند خواتین نے گھروں کا سارا کوڑا کرکٹ گلی میں لا پھینکا ہے۔

''سنیئے، آپ کو پتا ہے مس صفیہ کہاں رہتی ہیں؟''

ایک نسوانی آواز۔ وہ شاید اسی سے پوچھ رہی تھی۔ وہ مڑا اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے بات سمجھا نہ ہو۔

''میں پوچھ رہی ہوں مس صفیہ کے گھر کا پتا ہے؟''

وہ چہرے کا پسینہ رومال میں جذب کرتی خاصی اکتائی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھی۔

''نہیں، میں تو نہیں جانتا۔''

''اف جس سے پوچھو یہی جواب دیتا ہے۔ اب کیا کروں، اتنی گرمی پھر یہ علاقہ۔ آپ ذرا سے پتا تو کریں اور ادھر کچھ لڑکے بیٹھے ہیں، بدتمیز سے لگ رہے ہیں۔ میں تو نہیں پوچھ سکتی، آپ ذرا پوچھ کر آئیں۔'' وہ گہری سانس کھینچ کر ادھر کو چل پڑا۔ لڑکوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

وہ واپس اس کے پاس آیا۔ ایک گھر کے سائے میں وہ کھڑی ایک بار پھر چہرے پر آیا پسینہ پونچھ رہی تھی۔

''لڑکے کہتے ہیں مس صفیہ کو ہم نہیں جانتے۔''

''عجیب بات ہے۔ وہ عابدہ تو کہہ رہی تھی بڑی مشہور ہیں اپنے محلے میں۔ جس سے پوچھو گی فوراً بتا دے گا۔''

''چلیے مل کر تلاش کرتے ہیں۔'' عدی کو یہ بے نیازی لڑکی چاہے کیوں اچھی لگی تھی۔ کچھ دور تک ہی سہی مگر وہ اس کے ساتھ چلنے کی خواہش اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ آپ شکل سے شریف آدمی لگتے ہیں۔ یہاں اس محلے کے لڑکے تو بڑے فضول سے ہیں۔ ایک دم سے لوفر آوارہ لگتے ہیں۔ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جس سے مس صفیہ کا گھر

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پوچھتی ہوں، وہی ادھر ادھر کی باتیں کر کے فری ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ ساتھ ہوں گے تو کم از کم ان کی بکواس سے تو محفوظ ہو جاؤں گی۔" وہ ساتھ چل پڑی۔ عدی کو محسوس ہوا سورج بادلوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ ابھی ہوا بدن جلا رہی تھی مگر اب کیسی سبک اور ٹھنڈی تھی۔ ارے صرف اس ایک لڑکی کے ساتھ کی وجہ سے اس نے حیران ہو کر اس دبلی پتلی ہونے سے قد کی سانولی لڑکی کو دیکھا جو بے نیازی سے اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔

"میرا نام عدی ہے۔ میں نے بی ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ آج کل فارغ ہوں۔"

"عابدہ نے کہا تھا۔ دروازے پر سبز پینٹ ہے۔ دیواروں پر سفید قلعی ہے اور یہ بھی کہ ان کے دروازے کے سامنے ایک درخت بھی ہے مگر اف! یہاں تو نہیں درخت کٹ گیا ہے، دروازے کا پینٹ بدل گیا ہے یا میں ہی غلط جگہ پر آ گئی ہوں۔" عدی کی بات شاید اس نے سنی ہی نہیں ہے۔

"آپ کا نام کیا ہے، پوچھتی ہیں آپ؟" اس نے ہمت نہیں ہاری۔

"ہوں، نہیں تو۔ اچھا اس گلی میں دیکھتے ہیں۔" وہ اس سے آگے چل پڑی۔ پھر پیچھے مڑ کر بولی۔

"بس منہ اٹھائے میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کسی سے پوچھ ہی لیں۔ بس آج کل کے لڑکے خدا کی پناہ، اوئی میں مری۔" دھڑام کے ساتھ وہ ٹھوکر کھا کر کچی پکی گلی میں گر پڑی۔

"اوہ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" عدی ہائے، اوئے کرتی لڑکی کے پاس کھڑا ہاتھ مل رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے موچ آ گئی ہے۔ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بہت افسوس ہوا۔"

"کیا مطلب ہے افسوس ہوا۔ ہاتھ پکڑو، مجھے اٹھاؤ تو۔ ہائے اللہ یہاں سے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ میں گھر کیسے جاؤں گی۔" عدی نے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے تھام لیا، جیسے تیسے اٹھی مگر پاؤں میں واقعی موچ آ گئی تھی۔

"آپ یہیں ٹھہرو، میں رکشہ لے کر آتا ہوں۔ مین روڈ یہاں سے کچھ دور ہے۔ دیر ہو جائے گی پریشان نہ ہونا۔ یہ مت سوچنا چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔" رکشہ لے کر آتے اسے پورے پچیس منٹ لگے۔ آگ برساتا سورج، تپتی زمین اور جہاں وہ بیٹھی ہے، سایہ بھی تو برائے نام ہی ہے۔ اسے یہی خیال آتا رہا۔ رکشہ ملا۔ اس کی خوشی بے انداز تھی۔ جلدی سے مطلوبہ گلی میں لے کر آیا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی۔ سہارا دے کر سوار کرایا۔ بولی۔

"راستے میں کسی میڈیکل اسٹور پر رکنا ہے مجھے اپنے پاؤں کے لیے دوا لینی ہے۔"

"جو کہاں جانا ہے، رکشے والے کو بتا دو۔"

"ہوں، ہاں۔" وہ چہرے پر آنے والے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے ہٹانے لگی۔

اس کا نام فروبیہ تھا، فروبیہ رحمان۔ اس کے گھر میں کل چھ افراد تھے۔ فروبیہ رحمٰن، اس کی دبلی پتلی مگر بے حد پرعزم ماں۔ ایک بوڑھی نانی، فروبیہ سے چھوٹی ثوبیہ رحمان۔ فروبیہ کے مقابلے میں اس کا قد تھوڑا لمبا اور رنگ صاف تھا۔ دو چھوٹے بھائی عثمان اور گڈو۔ عثمان آٹھویں میں تھا۔ گڈو شاید پانچویں یا چھٹی میں تھا۔ اس فلیٹ کے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں یہ سب رہتے تھے۔ دوسرے میں اس کی امی نے سلائی مشینیں، ہیمو مشین، کاج بٹن بنانے کی مشین رکھ چھوڑی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کی امی نے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ یہ مشینیں قسطوں پر لی ہیں۔ انہوں نے عدی کو دودھ کی میٹھی لسی پلائی تھی۔ کھانے پر زبردستی روکا تھا۔ کھانے میں مونگ کی دال جو خاصی پتلی تھی مگر عدی کو زندگی میں پہلی بار کھانا کھا کر اتنا لطف آیا تھا۔ فروبیہ کے پیر میں خاصی تکلیف تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

عدی نے امی کو بتایا، ہم دونوں نے مس صنیفہ کا گھر بہت ڈھونڈا مگر یوں لگتا تھا وہ گھر سرے سے موجود ہی نہیں۔

"مس صنیفہ۔" امی ہنس پڑیں۔

"ان کا نام صنیفہ نہیں صبیحہ ہے اور وہ مس صبیحہ نہیں بلکہ استانی صبیحہ کہلاتی ہیں۔"

"اوہ۔" عدی کے ساتھ ساتھ فروبیہ بھی ہنس پڑی۔

"چلو اسی بہانے تم سے ملاقات ہو گئی۔" وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

"کیا کسی، میرا مطلب ہے استانی صبیحہ سے ملنا بہت ضروری ہے۔ میں اس محلے میں جاتا ہی رہتا ہوں۔ گھر تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ہاں، عابدہ نے مجھے بتایا تھا استانی صبیحہ اچھی عورت ہیں۔ کسی زمانے میں مڈل اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہوا کرتی تھیں۔ خاصی جان پہچان ہے ان کی۔ وہ مجھے کسی جگہ جاب دلوا سکتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں کل ان کا گھر ضرور تلاش کروں گا۔ مجھے کل چچی کی فیس لینے ادھر جانا ہی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ آج باسم بھائی گاؤں سے آ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ان کے آنے سے پہلے گھر میں موجود رہوں۔"

اس مختصر سی ملاقات میں اس نے پانچ چھ مرتبہ باسم کا ذکر کیا تھا۔ اب خود ہی بتا رہا تھا۔ "باسم میرے پھوپھی زاد ہیں۔ بہت عظیم انسان ہیں۔ یہیں لاہور میں پڑھتے ہیں مگر اب انہوں نے سوچا ہے گاؤں جا کر والد کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔"

"کسان ہیں ان کے ابا؟" ثوبیہ کو کئی فلمیں یاد آ گئیں۔ غریب کسان کا بیٹا پڑھنے لکھنے شہر آیا مگر اپنی اوقات نہیں بھولا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس اپنے پیارے گاؤں چلا گیا اور والد کو گھر بٹھا کر ان کی بنجر زمینوں میں ہل چلانے لگا۔

"جی نہیں، ان کے والد بہت بڑے زمیندار ہیں۔"

"او پھر تو ظالم بھی ہوں گے۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔" اس نے حیرت سے ثوبیہ کی طرف دیکھا۔

"باسم بھائی جیسے اچھے انسان کے والد ظالم کس طرح ہو سکتے ہیں۔ باسم بھائی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ باسم بھائی نے ہر قدم پر میری مدد کی ہے۔ والدین تو جیسے آپ کو بتا چکا ہوں بچپن میں گزر گئے۔ اگر باسم بھائی نہ ہوتے تو میں شاید اس مقام پر کبھی نہ ہوتا۔"

"کون سے مقام پر؟" ثوبیہ نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے۔ میں اتنا پڑھ نہیں سکتا تھا۔ میں با اعتماد نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بہت اکیلا تھا مگر باسم بھائی کی وجہ سے مجھے ایک اچھا دوست، ایک بھائی، ایک مہربان مل گیا۔ وہ بھی صرف باسم کی وجہ سے۔"

اب سب کے روکنے کے باوجود کل آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ ابھی خاصی گرمی تھی۔ سورج پوری گرمی انڈیل رہا تھا۔ گھر آ کر وہ نہایا، کپڑے بدلے اور اپنے برآمدہ نما کمرے یا کمرہ نما برآمدے میں آ کر لیٹ گیا۔ اسے انتظار تو باسم کا تھا مگر وہ سوچ فروبیہ کو رہا تھا۔ اس کی باہمت فیملی، باعزم لوگ، کوئی بھی تو خوش نہیں مگر پھر بھی ہنستے مسکراتے۔ فروبیہ کا اعتماد، اس کی امی کا حوصلہ، ثوبیہ کی لاپروائی اور نانی کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ، دونوں بھائی ابھی چھوٹے ہیں۔ فروبیہ کتنی پرکشش ہے۔ اس کا سارا اٹریکشن اس کے اعتماد میں ہے۔ ایسا ہی اعتماد اگر میری ذات میں بھی آ جائے۔ نہیں، میں اتنا با اعتماد کس طرح ہو سکتا ہوں۔ یہ بھی شکر ہے آج فروبیہ کی فیملی کے ساتھ میں خاصے اعتماد کے ساتھ بول گیا۔

آج میں وہاں کتنا خوش تھا۔ ایسی خوشی میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔ اس چھوٹے سے گھر میں کتنی خوشیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ نہ گرمی کا احساس تھا، نہ اجنبیت، تھکن تو تھی ہی نہیں۔ کتنے اچھے لگتے ہیں با اعتماد چہرے، بہادر لوگ۔ کاش میں بھی ایسا بن سکوں۔ وہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔

جب آنکھ کھلی عصر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ سستی ابھی باقی تھی مگر نماز ادا کرنے کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ باسم آ گیا ہو گا۔ اس نے مسکرا کر سوچا تھا۔

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

پھر نماز پڑھتے ہی وہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر آیا تھا مگر باسم کے کمرے بند تھے۔ اس کا مطلب ہے وہ ابھی نہیں آیا۔ یہ بھی ممکن ہے ابھی ابھی پہنچا ہو اور سب کے ساتھ ابھی نیچے ہی بیٹھا ہو۔ وہ واپس ہوا، ہال کمرے میں جھانکا۔ مسز بیگم اور چھوٹی چچی موجود تھے۔

"ہاں، کہاں رہ گئے تھے تم۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔ لاؤ قمیص لا کر دو۔ دیکھوں کیسی بنی ہے۔" چچی الجھا بے چینی سے اپنے کپڑوں کی منتظر تھیں۔

"میں گیا تھا۔ وہ عورت کہہ رہی تھی بیمار رہی ہوں، ایک دو روز میں بنا کر دے دوں گی۔" پہلی بار اتنے اعتماد سے بولا تھا ان کے سامنے اور کہا بھی تو جھوٹ۔

"تو ان لوگوں کے بہانے تو سنو ذرا۔ پیسے لیتے وقت جان کو آ جاتے ہیں اور بیمار پڑ گئے ہیں۔ عدی! تم نے ذرا سختی سے بات کرنی تھی۔"

"عدی اور سختی، یہ تو ہاتھ باندھے مودب کھڑے ہوں گے اور درخواست کی ہوگی کہ جانی کے لیے جو کپڑا ابھی دے گیا تھا، واپس کر کے دعائیں لیں۔" سرمد کے کہنے پر نسیم ہنسنے لگی۔

عدی نے سنجیدگی سے ان سب پر نظر ڈالی اور بولا۔

"میں باسم بھائی کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔ انہیں آج آنا تھا ناں۔"

"ہاں، آنا تو تھا مگر فون آ گیا، پروگرام کینسل کر دیا ہے اور اب کب تک چکر لگے گا اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بھئی باپ کی دولت ہے، عیش کرنے کے لیے۔ نہ پڑھنے لکھنے سے مطلب، نہ کام دھندا بس بیٹھے ہیں لٹانے اڑانے کے لیے۔" چچی جل جل کر بول رہی تھیں۔ باسم کے بارے میں ان کا یوں کہنا عدی کو بہت برا لگا مگر وہ انہیں کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ باسم کے سامنے کیسے بھیگی بلی بن جاتی ہیں اور اب کتنی نفرت سے ذکر کر رہی ہیں، دوغلے لوگ۔ وہ نفرت سے سوچتا واپس آ گیا۔ اس کے نہ آنے کا سن کر دل بجھ سا گیا۔ کتنا انتظار تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا باسم یوں ایک دم سے جدا ہو جائے گا۔ سب چھوڑ چھاڑ پھر سے گاؤں جا بیٹھے گا۔ وہ تو بہت عادی ہو گیا تھا اس کا، بہت پیار کرنے لگا تھا اس سے اور سب سے بڑھ کر اس نے باسم کو اپنا راہبر، راہنما بھی تو مان لیا تھا۔ اب کتنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ سوچ کر ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ زندگی ایک بار پھر تنہا ہو گی۔

وہ زیادہ دیر بیٹھ کر اس کے نہ آنے کا سوگ نہیں منا سکا۔ اسے ٹیوشن پڑھانے جانا ہوتا تھا۔ وہ لوگ خاصے دولت مند تھے۔ ایک ہی لڑکا تھا ان کا۔ میٹرک کا اسٹوڈنٹ، نالائق اور ڈل۔ عدی اس پر خاصی محنت کر رہا تھا۔ چاہتا تھا وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے تاکہ عدی کو آئندہ کے لیے بھی اسے پڑھانے کا موقع میسر آ سکے۔ اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے اسے اس ایک گھر سے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس کے ساتھ سر کھپا کر وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں جاتا تھا۔ ان کے دو پیارے بچے ابھی چھوٹی کلاسوں میں تھے۔ بے حد مؤدب اور لائق بچے تو یہ ہے یہاں آ کر عدی کی ساری تھکن اتر جایا کرتی تھی۔ وہ بہت شوق اور لگن کے ساتھ انہیں پڑھاتا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز بھی عدی مطلوبہ قمیص اور فردوسیہ کی استانی صبیحہ کی تلاش کی مہم پر وہ ناشتے کے فوراً بعد روانہ ہو گیا۔ پہلے چچی کی قمیص لی اور پھر وہیں سے استانی صبیحہ کے بارے میں پتا کیا۔ "ہمارے گھر کے پیچھے والی گلی میں رہتی ہیں۔"

"اسے تو توقع نہیں تھی ایڈریس اتنا آسان ہوگا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا سورج کی تپش کو نظر انداز کرتا پہنچ گیا۔ استانی کے دروازے پر واقعی وہاں ایک درخت تو تھا مگر اب سوکھ رہا تھا۔ ایک پتا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دروازے کا رنگ ہرا نہیں، نیلا تھا۔ لگ رہا تھا حال ہی میں یہ تبدیلی عمل میں لائی گئی ہے۔ پہلے شاید ہرا ہوتا ہوگا۔

دستک پر جن خاتون نے دروازہ کھولا، انہی سے پتا چلا موصوفہ ہی استانی صبیحہ ہیں۔ گہرا سانولا رنگ، بھاری جسم اور خاصے بد رنگ پرنٹ کے سوٹ میں وہ دروازے پر ڈٹ کر کھڑی تھیں اور عدی کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا، اپنے آنے کا مقصد کیا بیان کرے۔

"اب کیا میری شکل ہی دیکھتے رہو گے۔" وہ بیزاری سے گویا ہوئی تھیں۔ عدی نے سوچا، ٹیچر رہ چکی ہیں۔ اپنے سے کم عمر ہر شخص کو دیکھ کر رعب ڈالنے کی عادت پڑ چکی ہے۔

"تو کیسے گھور رہے ہو، ارے جوانی میں دیکھتے اب دیکھنے کو کیا بچا ہے۔" عجیب سی لاپروائی اور بے نیازی کا انداز تھا۔ عدی گڑبڑا گیا۔

"وہ جی، مجھے فردوسیہ نے بھیجا ہے اور فردوسیہ کو عابدہ نے بتایا تھا آپ کے بارے میں۔"

"عابدہ میری بھانجی، وہی جو گوری سی ہے، ہے نا۔"

"جی، جی ہاں۔" اس نے جھٹ سے گردن ہلا دی۔

"باہر اتنی گرمی میں کھڑے ہو، لو لگ گئی تو بیمار پڑ جاؤ گے۔ بخار ہوا تو وہ بھی گردن توڑ سے کم نہیں ہوگا مگر تم نوجوانوں کو اپنی جوانی، طاقت پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں اندر آ جاؤ۔"

"وہ جی کیسے آؤں؟" اشارہ تھا کہ آپ راستہ روکے کھڑی ہیں۔

"تم اندر آنے کا ارادہ ظاہر کرو گے، تب ہی تو پیچھے ہٹوں گی۔" عدی خاموشی سے اس راستے سے اندر چلا آیا جو انہوں نے چھوڑا تھا۔

"آؤ ادھر آ جاؤ۔" انہوں نے دروازے کے ساتھ والے کمرے پر پڑی چک اٹھائی۔ عدی سر جھکائے کمرے میں آ گیا۔ خاصا اندھیرا تھا یہاں۔ انہوں نے لائٹ جلائی تب ہی کچھ دکھائی دینے لگا اور وہ کرسی پر ٹک گیا۔

"ہاں اب بتاؤ، کیا کہا ہے عابدہ نے میرے بارے میں۔ وہ ٹھیک تو ہے نا، پہلے بہت آیا کرتی تھی میری طرف، اب جب سے نوکری لگی ہے بے چاری کم آ پاتی ہے۔ میں بھی سروس کیا کرتی تھی۔ استانی اور پھر اسکول کی ہیڈ مسٹریس بھی بن گئی تھی مگر بچوں کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔ اپنے بچوں کی وجہ سے۔" وضاحت کی۔ "گھر میں ان کی چڑیل دادی تھی۔ دو ڈائنوں جیسی پھوپھیاں تھیں۔ سارا دن تینوں کم بخت ماریاں پلنگ توڑتی تھیں۔ میں نے نوکری چھوڑ دی۔ اپنے بچوں کو لے کر ادھر اپنی اماں کے مکان میں آ گئی۔ میرے خاوند نے ہاتھ پیر جوڑے۔ واپس آ جاؤ پر میرا نام بھی استانی صبیحہ ہے۔ اسکول کی لڑکیاں جانتی ہیں اصولوں کی کتنی پکی، مزاج کی کیسی سخت ہوں میں۔ پیٹھ پیچھے مجھے جنات کی آپا کہا کرتی تھیں اسکول کی لڑکیاں۔" لہجے میں عجیب سا غرور تھا۔

"میں یہاں آ گئی۔ تجربہ تو تھا، اپنا اسکول کھولا، تھوڑے دنوں میں چل سو چل، بڑا کمایا اور بڑا خرچا کیا ہے میں نے۔ اصل میں، میں بچپن سے ہی دل کی بڑی کھلی ہوں۔"

"ایک گلاس پانی مل جائے گا؟" عدی کو سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں، ابھی کل ہی فل سائز فرج خریدا ہے۔ پہلے والا ہمسائیوں کو بیچ دیا ہے۔ کم بخت پیسے کم دیتے تھے۔ میں نے کہا ڈنڈی ماری تو تمہارا ٹی وی اٹھا لاؤں گی۔" وہ قہقہہ مار کر اپنی ترکیب کی داد دیتے ہوئے ہنسیں۔ عدی مسکرا بھی نہیں سکا۔ یہ حقیقت ہے اس نے ایسی عورت پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

"بڑی واقفیت ہے میری۔ یہ سارا محلہ جانتا ہے استانی صبیحہ کون ہے اور کیسا رعب ہے اس کا۔ یہ اس علاقے کا ایس ایچ او یہ سگا بھانجا ہے میرا۔ میری بہن فوت ہو گئی۔ میں نے ہی پالا اسے۔ جب اس کی ماں مری، یہ آٹھویں میں تھا۔ اپنی دو بچیاں، ایک یہ بھانجا۔ دن رات ایک کیے میں نے۔ یہ تھا بھی بڑا شریر، بڑی جوتیاں کھائی ہیں اس نے میری۔ اب بھی کہتا ہے خالہ تیرا پیار انوکھا ہے۔ تیری محبت یاد آتی ہے۔ ساتھ ہی کمر درد کرنے لگتی ہے۔ پتا نہیں کون سی کمپنی کے جوتے استعمال کرتی تھی تو درد جاتا ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں الو کے پٹھے یہ ان جوتوں

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کا ہی نتیجہ جو تو نواب صاحب بنا کرسی میز پہ بیٹھا ہے۔ ورنہ تو ہوتا جیل میں۔ کہتا ہے، ہاں خالہ! میں بڑا احسان مند ہوں۔ میں بڑی لڑکی گڈو کی اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ پر گڈو ڈھیٹ بڑی، کہتی ہے یہ اول نمبر کا لفنگا ہے۔ وردی پہن لی، ذہنیت تو نہیں بدلی۔ اندر وہی ذلیل حاسد ہے۔ میں نہیں کروں گی شادی۔"

"اچھا وہ میں فروبیہ کو کیا جواب دوں۔"

"کون فروبیہ؟" قصہ ادھورا رہ گیا۔ بدمزہ ہو کر پوچھا۔

"وہی عابدہ کی بچی، اس کو جاب چاہیے۔ اس کا خیال ہے آپ اسے جاب دلوا سکتی ہیں۔"

"ہاں، کہہ تو رہی ہوں۔ بڑی واقفیت ہے۔ اب میرا خاند یہاں مجھ سے ملنے آتا ہے تو تنگ نہیں کرتا ہے اور بڑا امپریس ہوتا ہے میری اس ٹور سے۔ کہتا ہے۔ میری ماں نے مجھے دبانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ کتے کی دم سو سال بھی نلی میں رہے ٹیڑھی ہی رہے گی۔"

"پانی مانگا تھا میں نے۔"

"ارے تو ہاں، میں نے کب منع کیا ہے۔ کمرے سے باہر نکلو، بائیں ہاتھ پہ برآمدے میں فرج رکھا ہے۔ اس میں پانی کی پوری چھ بوتلیں ہیں، جتنا چاہے پی لو اور سنو۔ فرج کا دروازہ ذرا احتیاط سے کھولنا بند کرنا۔"

پانی پی کر وہ سوچ رہا تھا۔ اب جانے کی اجازت طلب کی جائے۔ ابھی برآمدے میں ہی کھڑا تھا۔ وہ چلی آئیں۔

"کرتے کیا ہو۔ کہاں رہتے ہو؟" آتے ہی سوال کیا۔

"پڑھتا ہوں۔"

"ہاں، اس عمر میں اور کیا کر سکتے ہو۔ باپ کیا کرتا ہے؟"

"میرے والد حیات نہیں۔ رشتہ داروں کے گھر رہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ بس دوسروں کے رحم و کرم پر ہو۔" کتنا بے رحم سا انداز تھا وہ خاموش رہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ، عابدہ کی بچی کو کہنا مجھ سے مل لے آ کے۔ تمہاری کیا لگتی ہے۔"

"میری رشتے دار۔" وہ ٹھٹک کر بولا۔

"اچھا خدا حافظ۔" وہ اتنا کہہ کر سامنے کمرے میں گھس گئیں۔ عدی کچھ شرمندہ سا ہو کر چلا آیا۔ کتنا عجیب سا رویہ تھا ان خاتون کا مگر ان کی باتیں دلچسپ بھی لگتی تھیں، ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے، ان کی بے نیازی بھی بری نہیں لگتی۔

☆☆☆

شام کو ٹیوشن سے فارغ ہو کر وہ فروبیہ کے گھر آیا اور کس بے تکلفی سے سب کے درمیان بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اس نے استانی صاحبہ کی ساری باتیں انہیں بتائی تھیں۔ سب ہی خوب ہنسے تھے، خاص کر ثوبیہ اور وہ کہہ رہی تھی "باجی! مجھے ان کے ہاں ضرور لے کر جانا۔ کیوں عدی بھائی! آپ بھی چلو گے ہمارے ساتھ۔" عدی نے فروبیہ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بول اٹھا۔

"ہاں، میں خود بھی دوبارہ ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چلوں گا تمہارے ساتھ۔"

"کب جاؤ گی فروبیہ؟" آنٹی (اس کی والدہ کو وہ آنٹی کہنے لگا تھا) پوچھ رہی تھیں۔

"کل اتوار ہے۔ میں شام کو فارغ ہوں گا۔ کل چلیں گے۔" عدی بول اٹھا۔ فروبیہ نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں اپنا گلابی اور سفید پرنٹ کا جوڑا پہن کر جاؤں گی۔" فروبیہ بہن کی بات پر ہنس پڑی۔

"ہم تو ان کے سامنے درخواست لے کر جا رہے ہیں، تم ایسے تیاری کر رہی ہو جیسے تمہارے اعزاز میں کوئی تقریب ہونے والی ہے۔"

"بقول ان کے مشہور معروف شخصیت ہیں پھر آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہوگا۔"

"امی کیا خیال ہے، عابدہ کو ساتھ لے لیا جائے۔" فروبیہ پرخیال انداز میں بولی تھی۔

"ہاں اس سے بات کر لو۔ اگر وہ ساتھ چلی چلے بہت اچھا ہوگا، اس کی موجودگی میں وہ تمہاری بات پر زیادہ دھیان دیں گی۔"

"میں یمنیٰ کے ہاں سے فون کر کے آتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پانچ منٹ میں ہی واپس بھی آ گئی۔ "عابدہ کہہ رہی ہے۔ میں تم لوگوں کی آمد سے پہلے ہی اپنی خالہ صبیحہ کے گھر پہنچ جاؤں گی۔"

"چلو یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔ آپ مقررہ وقت تک پہنچ جائے گا بھائی۔ ورنہ ہماری یہ باجی اکیلی ہی نکل کھڑی ہوں گی۔" ثوبیہ کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"فکر نہ کرو، میں آدھا گھنٹہ پہلے موجود ہوں گا۔" اگر اس روز فروبیہ کو استانی صبیحہ کا گھر تلاش کرنے میں اتنی مشکل نہ ہوتی تو شاید وہ عدی کا ساتھ جانا قبول بھی نہ کرتی۔

"اتنا خراب راستہ، اگر مجھے معلوم ہوتا تو کبھی نہ آتی۔"

اونچے نیچے راستوں پر اچھی خاصی ہچکل کے ساتھ چلنا ثوبیہ کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ اس وقت سہپہر ڈھل رہی تھی گرمی کا راج بھی معمول سے کہیں زیادہ تھا۔

"اور کتنا دور ہے؟" وہ ان دونوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

"بس تھوڑا آگے۔" عدی بار بار تسلی دیتا تھا۔

"افوہ... تھک گئی۔" "پتا نہیں عابدہ باجی آئی بھی ہوں یا نہیں۔" ثوبیہ پر نئی سوچ سوار ہوئی۔

"وہ ضرور آئی ہوں گی۔" فروبیہ پورے اعتماد کے ساتھ بولی تھی۔ دروازہ عابدہ نے ہی کھولا۔ بہت اچھے انداز میں ملی۔ اشارے سے عدی کے بارے میں پوچھا۔

"یہ کزن ہیں ہمارے۔" جواب ثوبیہ نے دیا۔

☆☆☆

چار سال ایک طویل عرصہ، باسم کو دیکھے بغیر... بھلا وہ سوچ سکتا تھا کہ باسم کے بغیر اتنا لمبا عرصہ گزارے گا۔ شروع شروع اسے بہت عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ جب بینا کسی بات پر طنز کرتی۔ صبا اور عدنان مذاق کرتے، اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر ہی باسم کو تلاش کرنے لگتی۔ مایوس ہو کر واپس پلٹتی مگر پھر آہستہ آہستہ اس نے اکیلے جینا سیکھ لیا یا پھر فروبیہ نے اسے باسم بھلا دیا۔ اتنی بااعتماد، اتنی بہادر، اتنی مخلص لڑکی۔ عدی صرف کورس کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ شعر و شاعری کیا ہے، ادب سے کیا انسان پر کیا دنیا ہیں آشکار کرتا ہے۔ اعتماد علم سے آتا ہے اور علم صرف کورس کی کتابوں میں تو نہیں ہے۔ وہ جاب کرتی تھی، گھر کی ذمہ داری اٹھا رہی تھی مگر اپنی ذات سے لاپروا نہیں تھی۔ اچھی کتاب پڑھنے کا شوق تھا اور مہینے کے شروع دنوں میں جب تنخواہ ملی، وہ کوئی نہ کوئی کتاب ضرور خریدتی، اسے لائٹ کلر کی نیل پالش اچھی لگتی تھی اور کتنے ہی خوب صورت کلپ اس نے اکٹھے کر رکھے تھے۔

اس کے چہرے کا اعتماد ہی شاید اس کی سب سے بڑی خوب صورتی تھی اور عدی اب اس کے سائے میں سانس لینے لگا تھا۔ وہ بہت متاثر تھا اس لڑکی سے۔ شاید اتنا تو باسم سے بھی نہیں ہوگا مگر یہ ضرور تھا۔ وہ فروبیہ سے اکثر غیر ارادی طور پر ہی باسم کی باتیں کر جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے ماضی میں باسم کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ فروبیہ اس کی ہر بات بہت غور سے بڑی دلچسپی سے سنا کرتی تھی۔

اسے جاب مل گئی اور وہ بھی باسم کی مدد کے بغیر۔ اپنی محنت، اپنی قابلیت کی بنیاد پر۔ اس روز وہ کتنا خوش تھا اور یہ خوشی اس نے فروبیہ کے گھر والوں کے ساتھ منائی تھی۔ مٹھائی عثمان کو پسند تھی گڈو کو چپس اچھے لگتے تھے۔ ثوبیہ کو پیٹیز، فروبیہ کو پائن ایپل کیک اچھا لگتا تھا۔ امی نے کہا تھا۔ "میں اپنی پسند کی چیز گھر پر اپنی طرف سے تیار کروں گی۔ آخر میرے بیٹے کی کامیابی ہے۔" اور عدی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"تائی! آپ کیا کھائیں گی؟" وہ ان کے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

قریب آبیٹھا تھا۔
"بیٹا! ہم اب اس عمر میں کچھ ایسا ویسا کھا لیں تو ہسپتال جانے کی نوبت آجاتی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
"چلیں نانی جان کو ہم چائے پلا دیں گے۔"
ثوبیہ نے کہا تھا۔
جاب اچھی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ رات دیر تک وہ ان کے ہاں بیٹھا رہا اور خواب سجاتا رہا۔ اپنے گھر آکر اس نے کسی کو بھی جاب ملنے کی خبر نہیں سنائی۔ یہاں تھا ہی کون جو اس کی خوشی میں خوش ہوتا۔
مگر یہ خبر کوئی چھپنے والی تھی بھلا صبح جب وہ اک ولولے اور اعتماد کے ساتھ تیار ہو کر آفس جانے کے لیے نکلا تو سب ہی نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا تھا۔
"آج کوئی خاص بات ہے۔ شاید اسے کوئی جاب مل گئی ہے، بغیر کسی سفارش کے بھلا کیا ملا ہوگا۔"
"مگر اس کے لیے ڈھائی تین ہزار بھی بہت ہیں۔" یہ چچی تھیں اور سب ہنس پڑے تھے۔
شام کو واپسی ہوئی۔ تب دونوں چچا تایا بھی گھر آچکے تھے۔ خبر ان تک پہنچائی جا چکی تھی۔ فوراً طلبی ہوئی اور اس نے بڑے اعتماد اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی جاب کے بارے میں بتا دیا۔ نیم سرکاری ادارے میں ایک اچھی جاب، ترقی کے بہتر مواقع، دونوں کی آنکھوں کی سردمہری اچانک ہی غائب ہوگئی۔
"تھکے ہوئے ہو بیٹھ جاؤ۔"
"مجھے کپڑے تبدیل کرنا ہیں۔" وہ واقعی جانا چاہ رہا تھا۔
"کر لینا یار! ذرا دم تو لے لو۔ چائے پانی پی لو۔ تمہاری تائی چائے بنانے ہی گئی ہے۔" زیادہ تکرار اسے مناسب نہیں لگی۔ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔
"تم نے سنا عشرت! اپنے عدی کو بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔" تایا جان کے لہجے میں مسرت سے زیادہ حیرت تھی۔ پھر یہ خبر آناً فاناً سارے گھر میں پھیل گئی۔ اسے کسی نے مبارک باد نہیں دی۔ کسی نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں ان سب کی آنکھوں میں جلن اور حیرت اس نے ضرور دیکھ لی تھی۔ اب اسے پروا بھی نہیں تھی۔ وہ ایک کیمل کے ساتھ اپنی خوشی شیئر کر کے آرہا تھا۔ وہ سب اس کے اپنے تھے۔ فرویہ کے حوالے سے وہ اسے بہت عزیز ہو چکے تھے۔
بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر میں اچھا سا گھر لے لوں گا۔ جہاں میرے پاس ایک خوب صورت کمرہ ہوگا۔ باسم کے کمرے جیسا۔ اسے خیال آیا باسم کو فون کر کے اس خبر کے بارے میں بتانا چاہیے مگر اس وقت ٹائم کافی ہو رہا تھا۔ آج اس نے سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ٹی وی دیکھا تھا۔ چچا اس سے باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ وہ اتنی دیر تک جاگنے کا عادی نہیں تھا۔ یہی سوچا صبح فون کر لوں گا۔
وہ اپنے محسنوں کو بھول جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ باسم کو تو وہ بہت چاہتا تھا اور احسان مند تھا اس کا۔ اس نے صبح فون کیا تب پتا چلا وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ کوئٹہ گیا ہوا ہے۔ اس شام بھی وہ فرویہ کے ہاں سے ہی گھر لوٹا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ یہاں آج سب اس کے انتظار میں سوکھ رہے تھے۔
"کہاں رہ گئے تھے۔ ہم تمہارے لیے اپنی اپنی مصروفیات چھوڑ کر بیٹھے ہیں۔" تایا شاید بے زار ہو گئے تھے۔
"میرے لیے، مگر کیوں؟" وہ حیران تھا۔
"تمہاری جاب کی خوشی میں ہم نے سوچا ایک اچھی سی چائے پی جائے۔" چچی مسکرائیں۔
"تو آپ پی لیتے، میرا انتظار کیوں؟" اگر فرویہ نے اسے حوصلہ نہ دیا ہوتا یہ نہ بتایا ہوتا خود کو منوانے کے لیے، اپنے وجود کو تسلیم کروانے کے لیے زبان کھولنی پڑتی ہے۔ وہ کبھی بھی ایسی بات نہ کر سکتا۔
"آخر ہو نا کم ظرف تمہاری جاب کی خوشی میں ہم چائے لیے بیٹھے ہیں اور کہہ رہے ہو تمہارے بغیر ہی پی لیتے۔" تایا کے انداز میں گہرا طنز تھا۔ آخر اتنے سال انہوں نے عدی کو مٹی کے مادھو سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اب ایک دم سے کس طرح باعزت مان لیتے۔ انہیں تو یہ غم بھی تھا کہ اس گھر کے چاروں لڑکے

کس قدر نالائق اور نکمے ثابت ہوئے تھے۔ حالانکہ بہت محنت ہوئی تھی ان پر اچھے اسکول، کالجز، ٹیوشن، روپیہ پیسہ، خواہشات کچھ بھی تو ادھورا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی ان کی شخصیات ادھوری رہ گئی تھیں اور یہ عدی جس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال تھا۔ اس کے سر میں بھیجا ہی نہیں ہے۔ وہ کہاں پہنچ گیا تھا۔
چچا نے اس کے آنے سے پہلے سب کو بتایا تھا اس جاب میں ترقی کے مواقع بہت ہیں۔ سہولتیں بھی بہت ملیں گی۔ تب سے سب کے دل جل رہے تھے مگر چچا کے کہنے پر چائے کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ چچا شروع سے ہی دوستیاں بنانے، مطلب نکالنے کے ماہر تھے۔ کوئی دور کا بھی رشتے دار اچھی پوسٹ پر ہوتا تو یہ زبردستی گلے کا ہار بن جایا کرتے تھے۔ عدی کے سر پر تو انہوں نے بچپن میں دست شفقت رکھا ہے۔ قدم کیوں پیچھے ہٹائیں۔ عدی کو یہ یاد دلانا چاہیے کہ اس پر پہلا حق ہمارا ہے۔ صمد اور عدنان، باسم کے بنائے کمروں میں شفٹ ہو چکے تھے اور کئی سالوں سے کمرے خالی پڑے تھے۔
آج چچا کہہ رہے تھے۔ "جس کمرے میں عدنان رہا کرتا تھا۔ وہ اب تمہارا ہے۔ چاہو تو کوئی تبدیلی کروا لو۔ آخر افسر ہو اور افسروں کے سو نخرے ہوتے ہیں۔" کمر پر ہاتھ مار کر بے تکلفی اور اپنائیت سے مذاق کیا تھا۔
"نہیں شکریہ۔ میں تھوڑے دنوں تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔"
"کہاں جاؤ گے؟" تایا پوچھنے لگے۔
"کرائے پر گھر لے لوں گا۔"
"شاباش یہی سعادت مند اور احسان ماننے والوں کی نشانی ہے۔ پیسہ ہاتھ آیا، اپنوں سے نگاہیں پھیر لیں۔" تایا کے انداز میں کاٹ تھی۔ اتنے سالوں ان سب کے سامنے سر نہ اٹھانے والا عدی شرمندہ ہو گیا۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکا اور فیصلہ ہو گیا۔ عدنان والا کمرہ اب وہ لے گا۔
جب فرویہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ اسے بتائی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں ان کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں۔ میں بولنا چاہتا ہوں مگر لفظ زبان پر نہیں آتے۔"
"کوئی بات نہیں۔ اتنا گھبراؤ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم خود پر بھروسا رکھو۔ تمہارے اندر اتنی پاور ہے کہ تم اپنے ارادوں پر ڈٹ کر کھڑے رہ سکتے ہو۔"
"تم مجھے بہلاؤ نہیں۔ میں ان کے سامنے ٹھہر نہیں پاتا۔" وہ گھبراہٹ کے عالم میں پیشانی مسل رہا تھا۔ اسے خود پر شدید غصہ بھی آرہا تھا۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ابھی آغاز ہے۔ تم بنیادی طور پر ایک شریف انسان ہو۔ بحث، ہٹ دھرمی تمہاری فطرت نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا سلوک ہے جو تمہیں ان کی ہر بات کی تعمیل پر اکسا رہا ہے۔ اپنے مزاج کے خلاف چلنا کسی بھی شخص کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ تم کوشش کرتے رہو اور سنو ان سب کے درمیان بیٹھو، ان کی باتیں سنو، ان سے باتیں کرو۔ اس طرح بھی جھجک دور ہو جائے گی۔ اب وہ تمہارے لیے جس طرح بنے ہوئے ہیں پھر نہیں رہیں گے۔"
"فرویہ! اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں کتنا تنہا ہوتا۔" اس کی باتوں سے متاثر ہو کر وہ کہہ رہا تھا۔
"میں نہ ملتی، کوئی اور مل جاتی۔" وہ مسکرائی تھی۔
"نہیں، کوئی اور نہیں تم..... تم ہو فرویہ اور میرے لیے تمہارے جیسا اور کوئی نہیں۔ میرے سارے جذبے تمہارے نام ہیں۔ تم سے دوستی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ تم میرے لیے کسی دولت سے کم نہیں فرویہ! میں تم سے دور ہوتا ہوں تب بھی تمہیں سوچتا ہوں۔ تم ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہو۔" اس کے ساتھ دل کی ہر بات وہ کتنی آسانی سے کر لیتا تھا، کبھی نہیں جھجکا تھا اور اب تو اسے فرویہ اپنی ذات کا حصہ محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پر وہ بھی تھکا ہوتا۔ فرویہ بھی دن بھر فیکٹری میں سر کھپانے کے بعد ذہنی طور پر بھی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حسن کا شاہکار ہوتی اور اس کے چہرے کی تازگی بھی اڑی اڑی سی دکھائی دیتی مگر وہ عدی کے لیے دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اب وہ مستقبل کا ہر خواب اس کے حوالے سے دیکھنے لگا تھا اور وہ اپنے ان جذبوں سے اسے آگاہ بھی کر دیا کرتا تھا۔

وہ اس سے کہتا۔ ”جب مجھے گھر ملے گا، میں سب سے پہلے تمہیں وہاں لے کر جاؤں گا۔ تم مجھے بتانا اسے کس طرح ڈیکوریٹ کرنا ہے۔ سب کچھ تمہاری پسند کے مطابق ہونا چاہیے۔ آخر تمہیں وہاں رہنا ہے۔ آفس والے مجھے گاڑی بھی دیں گے۔ سب سے پہلے تمہارے ساتھ لمبی ڈرائیو پر نکلوں گا اور مجھے پتا ہے، تم ساتھ ہوگی تو مجھے یہ سفر بہت مختصر لگے گا۔“

فروہ نے ہمیشہ اس کے ان جذبوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ وہ بے حد باشعور، بہت بہادر اور نڈر تھی۔ مگر اس نے کبھی بھی اپنی ذات کو عدی کی شخصیت پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے جو کچھ سمجھانا ہوتا بہت دھیمے لہجے میں اور پیار سے کہتی۔ ”میرا خیال ہے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم اتفاق کرتے ہو ناں۔“ اس نے کبھی بھی عدی کو یہ احساس نہیں دلایا کہ میں تم سے ذہین ہوں یا میں تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔

اب وہ مصروف تھا۔ ان کے آفس نزدیک تھے، اس لیے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ ورنہ شام کو ہر روز فروہ کے گھر جانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ہاں ویک اینڈ پر وہ ضرور چکر لگا لیتا تھا۔

ایک روز فروہ نے اسے بتایا ”ہمارے دور کے عزیز ثوبیہ کا رشتہ مانگ رہے ہیں مگر امی سوچ میں پڑ گئی ہیں۔ وہ بڑی سے پہلے چھوٹی کا ذکر کرنا بھی نہیں چاہتیں۔“

”تم نے بتایا نہیں، بڑی تو پہلے ہی بک ہے۔“ عدی کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرارت آگئی تھی۔ اس کا سانولا رنگ کچھ صاف ہو گیا تھا اور صحت پر بھی فرق پڑنے لگا تھا۔ جاب نے اسے جو اعتماد دیا تھا اس کا اثر اس کی شخصیت پر نمایاں طور سے دیکھا جا سکتا تھا۔

”یہ بات میم سے کہنے کی تو نہیں ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے پھر میں کہہ دوں گا۔“ وہ مسکرایا تھا اور فروہ نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

”اگر باسم یہاں ہوتا تو میں اسے بھیجتا رشتے کے لیے۔“

”تم ابھی تک انہیں بھولے نہیں۔ اب تو تین سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔“

”وہ بھولنے والی چیز نہیں ہیں اور میں احسان کرنے والوں کا ہمیشہ احسان مند رہتا ہوں۔“

☆☆☆

زندگی میں کتنی خوشگوار تبدیلیاں ایک ساتھ آگئی تھیں۔ عدی نے یہ کب سوچا تھا وہ گھر جہاں کے مکین اسے گھر کے فالتو سامان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، اس پر اتنے مہربان ہو جائیں گے۔ اسے آفس کی طرف سے گاڑی ملی تو سب ہی کس قدر خوش تھے۔ نیلم نے جھٹ کہہ دیا تھا۔ ”اب میں اپنی دوستوں کے ہاں عادل بھائی کے ساتھ گاڑی پر جایا کروں گی۔ صمد کی بائیک تو بالکل فضول ہے۔“

اس گھر میں چھ سال پہلے گاڑی موجود تھی مگر اب تایا ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ چچا کی تو خیر اتنی آمدنی تھی ہی نہیں۔ ساری امیدیں بیٹوں سے تھیں مگر دونوں کے دونوں ہی نالائق نکلے۔ اس کا لمبا قد، سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں۔ اب جنہیں جا کر سب اس کی خوب صورتی میں شمار ہونے لگا تھا ورنہ اس سے پہلے لمبا قد، اونٹ سے مشابہ، سانولا رنگ تو خیر ہر وقت ہی تنقید کی زد میں رہتا اور ان آنکھوں کو بھی اس کے چہرے کے لیے ان فٹ قرار دیا جا چکا تھا۔ چچی کہتی تھیں۔ ”کتنی خوف ناک، کیسی منحوس سی ہیں اس کی آنکھیں، جب میری طرف دیکھتا ہے۔ مجھے خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا ہے“ مگر اب دونوں لڑکیوں نے کہا تھا، ”آپ کی پرسنالٹی اتنی شان دار ہے، لباس کا بھی خصوصی طور پر خیال رکھا کریں۔ چار چاند لگ جائیں گے۔“ بلکہ نیلم نے تو یہاں تک کہا تھا۔ ”اس سلسلے میں آپ مجھ سے مدد لے سکتے ہیں۔“ بینا ذرا تنک چڑھی تھی پھر اسے اپنا پچھلا سلوک یاد تھا۔ جس لڑکے کو ہر دم مذاق کا نشانہ بنایا۔ اب سر آنکھوں پر بٹھا لوں، یہ بھی نہیں ہو گا۔ ویسے اسے افسوس تھا اگر پتا ہوتا عدی کی قسمت اتنی تیز ہو گی تو کبھی اس طرح کا سلوک نہ کرتی۔

پھر ان ہی دنوں باسم اچانک آ گیا۔ عادل آفس سے واپس لوٹا تو وہ موجود تھا۔ سب کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ اب عدی کا معمول تھا آفس سے واپسی پر لاؤنج میں جھانک کر اپنے آنے کی خبر ضرور کرتا تھا۔ یہ تاکید چچی نے کی تھی۔ ابھی تھیں۔

”تمہارے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلتا، ہم انتظار میں ہی رہتے ہیں۔“

آج باسم آیا ہوا تھا۔ عدی بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ ”کیسے ہیں باسم بھائی! آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔“

”ہاں بس مصروفیت کچھ کم ہوتی ہیں کیا ہم لوگوں کی۔ اب بھی ایک کام سے لاہور آیا ہوں۔ سوچا چلو ملتا چلوں۔“ باسم کا وہی انداز تھا۔ اظہار میں بہت مگر الفاظ میں بے نیازی۔ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا مگر لہجے میں کچھ بھی نہیں تھا۔

”عادل بھائی کو آفس کی طرف سے گاڑی ملی ہے۔“ نیلم نے اطلاع دی۔

”میں نے بھی نئی گاڑی لی ہے۔ قیمت سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے تم لوگ۔“ اس نے مبارک باد نہیں دی۔ کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

”آئیے باسم بھائی، میرے کمرے میں چلیں۔“ عدی نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”ہاں ہاں چلو۔“ وہ جھٹ سے ساتھ ہو گیا۔

”بہت بااعتماد اور خوش دکھائی دے رہے ہو۔“ عادل میں یہ تبدیلی اتنی واضح تھی کہ اسے ہر کوئی محسوس کر سکتا تھا۔

”ہاں بالکل، ایسی ہی بات ہے۔“ وہ دل سے مسکرایا۔ اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

”ہاں نوکری جو مل گئی ہے۔ تم لوگوں کا سب سے بڑا پرابلم یہی تو ہوتا ہے۔ چلو اچھا ہوا اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ گھر والوں نے بھی تمہاری اہمیت کو جانا اور اب یہ کمرہ تمہارے حصے میں آ گیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اوپر جو کمرے میں نے بنوائے تھے، ان میں سے ایک لے لو۔ وہاں میرا خریدا ہوا فرنیچر بھی موجود ہے۔ بہت قیمتی ہے، تم تو ویسا نہیں خرید سکتے۔“ پتا نہیں وہ شروع سے ایسی ہی باتیں کرتا ہو گا مگر عدی کو محسوس نہیں ہوا مگر آج دو تین بار عدی کو اس کی باتیں سنتے ہوئے گھٹیا پن کا احساس ہوا تھا۔

”خوشی کے لیے روپے پیسے سے زیادہ محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”تمہیں کس سے محبت ہو گئی بھئی۔“ قہقہہ لگا کر اس نے صاف مذاق اڑایا تھا۔

”اس کا نام فروہ ہے۔“ اس کی طنزیہ سی ہنسی کو عادل نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔

”وہ اتنی ذہین ہے کہ میں حیران رہ جاتا ہوں۔“ بس پھر عدی اس کی تعریفیں کرنے پر آیا تو کرتا ہی چلا گیا۔

باسم نے کہا تو یہ تھا ایک کام سے لاہور آیا ہوں۔ تھوڑا وقت نکال کر تم سے ملنے چلا آیا مگر وہ پورے دو روز سے یہاں تھا اور فروہ کے قصے سن رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا، عادل کی آنکھوں میں اب اس کے لیے عقیدت تو بالکل نہیں ہے۔ اب وہ اس کی ہر بات پر ایمان بھی نہیں لاتا اور دو تین بار اس سے اختلاف تک کر چکا ہے۔ وہ پورے اعتماد سے بات کرنے لگا ہے اور جب باسم نے اپنے دو تین جوڑے پیش کر کے اسے دیے کہ یہ بالکل نئے ہیں بس میرا دل بھر چکا ہے۔ تو اس نے شکریے کے ساتھ لوٹا دیے اور وہ سوٹ دکھائے جو اس نے فروہ کی پسند سے اپنے لیے خریدے تھے۔ دی ہوئی چیز لوٹانا باسم کے لیے نئی بات تھی۔ ایسا کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کے اندر آگ سی بھر گئی مگر وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنا

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

قصہ عدی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

عدی نے فروبہ کو باسم کے آنے کی اطلاع دی تھی اور فروبہ نے اسے چائے پر اپنے گھر بلایا تھا۔ باسم خاصے اہتمام سے تیار ہوا تھا، جبکہ عدی نے اس کا نیوی بلیو کڑکڑاتا شلوار قمیص رکھا تھا۔ اس نے باسم کے سامنے فروبہ کی شکل و صورت کی کوئی تصویر نہیں کھینچی تھی۔ جب بھی بات ہوتی اس کی ذہانت، باشعور اور باخبر ہونے کی ہوتی۔ باسم نہ تو باشعور تھا نہ باخبر۔ اس کی معلومات صرف پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہو جاتی تھیں۔

فروبہ بہت عام سی صورت والی لڑکی تھی، سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی مگر باسم کو لگا اس کی نگاہ گہری ہے اور وہ خود کو بہت کچھ سمجھتی بھی ہے۔ اس نے باسم کو بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ مسکرا کر سلام کیا۔ حال احوال پوچھا اور سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ مکمل طور پر عادل کی جانب متوجہ ہو گئی۔

باسم سے آنٹی اور عادل ہی باتیں کرتی رہیں۔ وہ ملکی و غیر ملکی سیاست پر باتیں کر رہے تھے۔ پھر بات کسی کتاب پر آ گئی جو فروبہ آج کل پڑھ رہی تھی۔ اور اسے بہت پسند آ رہی تھی۔ وہ عدی کو اس کے پیراگراف سنا رہی اور عدی نے کہا تھا۔ پڑھنے کے بعد مجھے ضرور دینا۔ اس روز باسم کو پتا چلا عادل بھی اب خاصا علم رکھتا ہے۔ جن لوگوں کی وہ باتیں کر رہے تھے۔ جن کی تحریروں کو سراہ رہے تھے باسم نہیں جانتا تھا وہ لوگ کون ہیں۔ اسے یہاں بیٹھے ہوئے ایک ہی خیال ستا رہا تھا عدی اب اسے اہمیت نہیں دے رہا۔ وہ اس کے حصار سے نکل چکا ہے۔ میری اترن پہننے والا، میری مہربانیوں سے یہاں تک آنے والا صرف اس لڑکی کی وجہ سے میری ذات سے لاپروائی برت رہا ہے۔ کیوں نہ اسے پھر سے اکیلا کر دوں۔ اس پرواز کو قطع کر دوں، میں اب بھی اس سے بہت بلندی پر ہوں۔ کچھ سوچ کر اس نے فروبہ کو خاص نظر سے دیکھا اور عجیب بات یہ کہ اسے وہ بہت پرکشش محسوس ہوئی۔ اتنی کہ حاصل کرنے کو اس کا دل مچل اٹھا۔ یہ کوئی اتنی مشکل بات بھی نہیں۔ اس نے کمرے کی معمولی اشیاء اور پھر چھت پر لگے پرانے سے پنکھے کو دیکھ کر اطمینان سے سوچا۔

واپسی پر عادل کی زبان ان ہی لوگوں کے گن گا رہی تھی۔ "باسم بھائی! سچ تو یہ ہے کہ میری شخصیت کو بنانے میں اس فیملی کا بہت ہاتھ ہے۔"

"بہت عام سی لڑکی لگی مجھے یہ فروبہ۔ اس سے خوب صورت ہمارے گاؤں میں مل جاتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر اڑا دیا تھا۔

عدی نے حیرت سے اور کچھ ترس بھری نظروں سے اسے دیکھا پھر سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "ظاہری خوب صورتی کچھ بھی نہیں ہوتی۔ یہ انسان کی طاقت نہیں بلکہ کمزوری ہوتی ہے۔ خوب صورت چہروں والے لوگوں کے پاس چہرے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اصل چیز ہے ذہانت اور شعور۔ یہی لوگ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ یہ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم سے قائم و دائم ہے۔"

"اوہ... کتابی باتیں۔" بہت برا سا منہ بنا کر باسم [illegible] اور بھی جلا گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ ایسی باتوں کو نہیں سمجھتے۔"

دکھ ہوا تھا اب اس کی [illegible] بے شعور، کم عقل انسان ہوں۔ میری اترن پہننے والا، میری بخششوں کے بل بوتے پر یہاں تک آنے والا، احسان فراموش نیچ انسان۔" دل ہی دل میں اس نے عدی کو خوب گالیاں دیں مگر وہ مطمئن بھی تھا۔ اس نے عدی کو بہت بڑی سزا دینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

بچپن ہی سے یہ کمزور سا بانس کی طرح لمبا لڑکا میرے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ میرے کپڑے استری کرتا، الماری میں رکھتا اور جوتے تک پالش کرتا، میں اس کی ذمہ داری دیا کرتا تھا۔ عدی فروبہ کی باتیں کرتا رہا۔ باسم اپنے خیالوں میں الجھا رہا۔ یہاں تک کہ گھر آ گیا۔

"اچھا باسم بھائی! اب صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تھا۔ باسم نے روک لیا اور اپنے کمرے میں لے آیا۔

"کوئی کام ہے بھائی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں، تم دیکھ تو رہے ہو۔ ہر چیز کیسے بکھری ہوئی ہے اور مجھے اپنا کام خود کرنے کی عادت کہاں ہے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" عدی نے مسکرا کر نگاہ دوڑائی۔ واقعی کپڑے جوتے سب بکھرے ہوئے تھے۔

"کپڑے الماری میں لگا دو۔ ابھی میں کچھ دن یہیں رہوں گا۔" اس نے بغور عادل کو دیکھ کر اس کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ عدی کچھ بھی کہے بغیر آگے بڑھا اور کپڑے تہہ کرنے لگا۔ پانچ منٹ میں اس نے سب الماری میں رکھ دیے۔ اب وہ اس کے جوتے اٹھا رہا تھا۔

"یار عدی! یہ دراز والے مجھے صبح پہننے تھے مگر دیکھو یہ پالش نہیں ہے ان پر پالش کر دو۔" اس کا لہجہ عام سا تھا۔ جیسے عادل سے یہ کام کروانا کچھ بھی نہیں ہے۔ عادل نے بھی انکار نہیں کیا۔ فوراً جوتے پالش کرنے بیٹھ گیا۔ باسم بغور اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"تم جوتے اچھے پالش کر لیتے ہو۔ جب تم یہاں تھے میرے جوتے تم ہی پالش کیا کرتے تھے۔"

"جی بھائی! یاد ہے مجھے۔ آپ کا کام کر کے تو مجھے راحت ملتی تھی۔"

[illegible] "[illegible]" [illegible]

سب کام [illegible] اپنے کمرے میں چلا گیا۔ [illegible] آفس کے کام میں بہت مصروف رہا۔ گھر بھی دیر سے آتا۔ اس سے بات ہی نہیں ہو سکی۔ باسم کی مصروفیات آج کل کیا تھیں۔ تیسرے روز تایا ابا گھر پر تھے اور انہوں نے اسے شام کی چائے پر روک لیا تھا۔ حالانکہ آج رات بعد اسے اسلام آباد جانا تھا۔ اس کے خیال میں مناسب کپڑے بے حد کم تھے اور آج اسے شاپنگ کرنے جانا تھا۔ چائے لان میں پی گئی۔ جو لان کیا بس ایک اجڑا ہوا سبزے کا ٹکڑا زیادہ دکھائی دیتا تھا۔

"میں جاتا رہا ہوں فروبہ کے پاس، بڑی دوستی ہو گئی ہے اس کی میرے ساتھ۔" باسم نے بڑے انداز سے اسے بتایا تھا مگر عدی بچے دل والا لڑکا تھا۔ سن کر خوش ہوا اور بولا۔

"پھر مان گئے، ہے ناں وہ بہت اچھی لڑکی۔"

"باتیں اچھی کرتی ہیں۔ میں تمہارے بارے میں اس کی رائے لینا چاہتا تھا مگر اس نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ اس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ بس اسی لیے شاید تمہارے ذکر کی بھی نوبت ہی نہیں آئی۔" باسم نے بھرا سے جانچا تھا مگر مایوسی ہوئی۔ وہ بڑے مزے سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا کیا باتیں ہوئی ہیں؟"

"بس اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا، اپنی زمینوں اور باغات کے بارے میں سن کر بہت متاثر ہوئی۔ میں نے آفر کی ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ میرے گاؤں آئے۔"

"کیوں نہیں باسم بھائی! ہم سب ضرور آئیں گے۔"

"فروبہ کی امی تو مجھ سے بہت متاثر ہیں۔"

عدی ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

"وہ بہت اخلاق والی عورت ہیں۔ سب کے ساتھ اچھی طرح ملتی ہیں۔ سب کو بہت عزت دیتی ہیں۔ چاہے کوئی عمر میں ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔"

"میری گاڑی ان سب کو بہت پسند ہے۔ خاص طور فروبہ کے بھائی بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔"

"اچھی چیز سب کو اچھی لگتی ہے لیکن باسم بھائی! آپ نے کلر اچھا نہیں لیا۔ شہر میں تو کوئی بھی ایسا کلر پسند نہیں کرتا۔"

باسم کو یہ تنقید سخت بری لگی اور بولا۔ "تم بھلا کیا

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جانو، ابھی تمہیں دیر ہی کتنی ہوئی اچھے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے کی اور خوب جانتا ہوں اس وقت کون سا گھر زیادہ پسند کیا جا رہا ہے۔"

"آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا۔ بیٹا اس رہی تھی کہ یہ باسم بھائی نے گاڑی، خیر چھوڑیں بیٹا کو تنقید کی عادت ہے۔"

"ہاں اور جب سے اس گھر کے لوگوں کو یہ پتا چلا ہے کہ میں بھی بھی اپنی ننھیال میں شادی نہیں کروں گا تب سے یہ بیٹا اور نیلم بے چاری کافی ڈس ہارٹ ہوئی ہیں۔ اب ایسی باتیں نہیں کریں گی تو کیا کریں گی۔"

"اچھا، میرا تو خیال تھا پھوپھو آپ کی شادی اپنی بھتیجیوں ہی میں سے کسی سے کریں گی۔"

"میں کوئی قربانی کا بکرا تھوڑی ہوں۔ میری بھی کوئی پسند ناپسند ہے اور یہ دونوں لڑکیاں اونہہ۔" باسم کے انداز میں نخوت تھی۔ عدی کو کون سا ان لڑکیوں سے ہمدردی کا بخار چڑھا تھا۔ وہ بھی پھر کچھ نہیں بولا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ آفس سے واپسی پر فروبہ کے گھر گیا۔ یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی باسم آج بھی یہیں موجود تھا۔

"آپ کے بھائی بھی آپ کی طرح بہت اچھے ہیں عدی بھائی۔" ثوبیہ تعریف کر رہی تھی۔

"وہ تو مجھ سے بھی اچھے ہیں۔" عدی کا واقعی بھی خیال تھا۔

"پتا ہے بھائی! آج باسم بھائی اتنے سارے فروٹ لے کر آئے ہیں۔ امی تو مان ہی نہیں رہی تھیں پھر ہم نے کہا یہ عدی بھائی کے کزن ہیں تو ہمارے بھی کزن ہوئے۔ تب امی نے رکھ لیے۔" عادل کمرے میں آیا۔ یہاں نانی، باسم اور فروبہ موجود تھے۔ آنٹی کچن میں چائے بنانے گئی تھیں۔

"عادل بیٹا! بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔" نانی دیکھتے ہی گویا ہوئیں۔

"آپ گلہ مت کریں نانی! یہ نئے نئے امیر ہوئے ہیں اور جب اچانک پیسہ مل جائے پھر دل و دماغ بدل جاتے ہیں۔" باسم نے بظاہر ہنس کر مذاق کیا تھا۔ عدی نے بھی مذاق میں ہی لیا تھا مگر فروبہ کو اچھا نہیں لگا تھا۔

"یار! اب تو لباس کا خیال رکھنا سیکھ لو۔ پہلے تو میرے ہی کپڑے چھوٹے کروا کر پہن لیا کرتے تھے۔ اس لیے کسی کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ کتنے کورے ہو اس کام میں مگر اب فروبہ! ذرا اس کی ہچکچاہٹ دیکھنا۔" باسم کا انداز کتنا عجیب تھا مگر عدی مسکرا رہا تھا۔ عاجزی سے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب آہستہ آہستہ ہی سیکھوں گا بھائی! ایک دم سے تھوڑی آ جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم کچھ زیادہ ہی آہستہ سیکھو گے۔ پتا ہے نانی جان! یہ عدی بچپن میں بالکل کمزور سا ہوتا تھا اور اس کی آنکھیں چھوٹے سے چہرے پر ضرورت سے زیادہ بڑی بڑی اور خوفناک لگتی تھیں۔ اسے دیکھ کر کسی سیارے کی مخلوق کا خیال آیا کرتا تھا۔"

"اب تو میرا عادل کسی شہزادے سے کم نہیں۔" نانی کے انداز میں محبت تھی۔ انہیں یہ مختلف سادہ لوح لڑکا بہت اچھا لگتا تھا۔

"عدی جھک کر کورنش بجا لاؤ، شکریہ ادا کرو۔ کسی نے تمہیں بھی شہزادہ کہہ دیا ہے۔"

"باسم بھائی! آپ ہمیں اپنے گاؤں کب لے کر جائیں گے۔ سچی آپ اتنی باتیں کرتے ہیں۔ اب تو دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔" ثوبیہ کہہ رہی تھی۔ وہ خوش ہو گیا اور کہا۔

"میری طرف سے کوئی پابندی نہیں، ہمارے ہاں یہ مسئلہ تو ہوتا نہیں کہ اچانک مہمان آ گئے کہاں سلاؤ، کیا کھلاؤ۔ بہت جگہ اور بہت کھانا ہے۔ میں تو کہتا ہوں پرسوں چلے چلتے ہیں۔"

"مگر میں تو اسلام آباد جا رہا ہوں۔" عادل بول اٹھا۔

"او یار! تمہیں ساتھ چلنے کو کہا کس نے ہے۔"

باسم کہہ کر خود ہی ہنس پڑا۔

"نہیں، عدی بھائی کے بغیر کیا مزہ آئے گا۔" ثوبان نے جانے سے انکار کر دیا۔

"ہاں جب بھائی فارغ ہوں گے پھر ہم جائیں گے۔" ثوبیہ بھی کہہ رہی تھی۔

"میری تو نئی نئی جاب ہے۔ ابھی چھٹی کرنا مناسب نہیں ہو گا آپ لوگ باسم بھائی کے ساتھ چلے جائیں۔ یہ ہر طرح سے آپ کا خیال رکھیں گے۔"

"نہیں گاؤں جانا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں پھر میرے لیے بھی چھٹی کا مسئلہ ہے۔" فروبہ نے قطعیت سے کہہ کر پھر کسی تکرار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اس روز باسم ہی بولتا رہا اور یہ سب سننے پر مجبور رہے۔ عادل سب سے ملنے آیا تھا۔ کچھ روز کے لیے اسلام آباد جو جا رہا تھا۔ وہ فروبہ سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر باسم موقع نہیں دے رہا تھا پھر جب جانے کے لیے اٹھا زبردستی عادل کو بھی ساتھ کھینچ لیا۔

راستے میں بتایا۔ "تمہارے آنے سے پہلے فروبہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ بس یونہی دکھانے کے لیے۔ کتابیں کافی ہیں اس کے پاس۔"

"جی ہاں۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا اسے بہت شوق ہے۔"

"مجھے کہہ رہی تھی۔ جی چاہتا ہے میرے پاس ڈھیروں پیسہ ہو اور میں اپنی مرضی کی ہر کتاب خرید لوں۔ میں نے کہا۔ فکر نہ کرو، مجھے بتاؤ کیا چاہیے، میں لا کر دوں گا۔"

"اچھا، پہلے تو کبھی اس نے ایسا نہیں سوچا۔ وہ کاش کا لفظ استعمال نہیں کرتی۔ کہتی ہے۔ خدا نے جو دیا ہے اس پر شکر کرنا چاہیے۔ آرزوؤں کو بڑھا کر خود کو اذیت میں ڈالنا دانش مندی نہیں۔"

"ظاہر ہے، اب تمہارے سامنے تو ایسی ہی باتیں کر سکتی ہیں۔ وہ جانتی ہے تم اسے کچھ نہیں دے سکتے۔ اظہار کر کے تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتی۔" عدی کو یقین تو نہیں آیا مگر بحث مناسب نہیں سمجھی۔

"اس نے زندگی بے سائبان گزاری ہے۔ اب اسے ایسا سہارا ملنا چاہیے جو اسے چھاؤں کا احساس دے سکے اور جس کا ساتھ فروبہ کے لیے سکون اور تحفظ کا باعث بن سکے۔" عادل شروع سے ہی باسم کے سامنے کم بولا کرتا تھا۔ صرف اس کی سنتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ کہتا رہا۔ سنتا رہا۔ اسلام آباد جانے سے پہلے عادل کی فروبہ سے تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی۔ بس فون پر مختصری بات ہوئی۔ وہ اس کی واپسی کا پوچھ رہی تھی۔ یہ بھی کہا تھا واپس آ کر گے تو سیدھے ہماری طرف آنا، کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا لیکن چچا سے پہلے ہی بات ہو چکی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ہم لوگ انتظار کریں گے۔ جس روز تم آؤ گے سب اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ فروبہ کو بتایا۔ وہ بولی۔ چلو ٹھیک ہے پھر میں اصرار نہیں کروں گی۔

اسلام آباد میں اسے پورا ایک ہفتہ لگا۔ اس نے فروبہ اور ثوبیہ کے لیے سوٹ اور اپنی جیب کے مطابق کچھ جیولری خرید لی۔ ایسے ہی کچھ تحائف اس کے باقی گھر والوں کے لیے تھے۔

واپسی پر گھر میں اس کا اچھا خاصا شان دار استقبال ہوا۔ آج تایا جی نے ایک بھی جملہ طنزیہ انداز میں نہیں کہا۔ وہ ان کی طنزیہ گفتگو سے بڑا گھبرایا کرتا تھا۔ آج ان کے اچھے موڈ کو دیکھ کر خاصا پرسکون بیٹھا تھا۔

"امی نے مرغ روسٹ کیا ہے۔" نیلم اطلاع دے رہی تھی۔

"باسم بھائی کس روز گئے تھے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"گئے کہاں، یہیں ہیں نواب صاحب۔" اب گھر والوں کو باسم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اونہہ رشتہ جوڑنا ہے اپنے ددھیال والوں سے اور مفت کے غلام لے ہیں ہم۔ یہ ان سب کی سوچ تھی اور ویسے اس

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مرتجہ باسم اپنے ساتھ گاؤں کی کوئی سوغات نہیں لایا تھا۔ کافی عرصے سے پھوپھو بھی لاتعلق سی تھیں۔ جب تک بیٹیاں ان کے ہاں رہ کر پڑھتا رہا تب تک وہ خود بھی چکر لگا لیتیں اور گاؤں سے تحائف تو آتے ہی رہتے تھے مگر اب جیسے بھول ہی گئی تھیں۔

"ابھی تک یہیں ہیں باسم بھائی۔" اسے حیرت ہوئی۔

"تو اور کیا، اسے بھلا کوئی کام تھوڑی ہے۔ اب یہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ روزانہ شام کو بج بن کے نجانے کدھر نکل جاتا ہے۔" تائی برا سا منہ بنا کر کہہ رہی تھی۔

"ہونہہ ہو کسی لڑکی کا چکر ہے۔ بڑا خوش رہتا ہے آج کل۔" چچی بڑے یقین سے کہہ رہی تھیں۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ واقعی لڑکی کا چکر ہے۔ ایک روز فون کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا میں بھی وہیں موجود ہوں۔ فروہ نام ہے اس کا۔" اور عدی کی ذات آندھیوں کی زد میں آگئی۔ باسم اور فروہ اس کی زندگی میں آنے والے دو اہم کردار، دونوں ہی اس کے محسن، دونوں ہی سے وہ بخت متاثر۔ اب وہ دونوں ایک بار پھر میری ذات کو ادھورا کر دینا چاہتے ہیں۔ تکمیل کے بعد پھر سے ادھورا پن، یہ تو بہت کٹھن ہوگا۔

"تم کھانا نہیں کھا رہے۔" چچا بہت نوٹ کرنے لگے تھے اسے مگر وہ جواب نہیں دے سکا۔

کچھ دیر بعد تھکن کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ باسم جانتا ہے میں فروہ کو بہت چاہتا ہوں پھر بھی اس نے فروہ کی جانب قدم بڑھائے۔ شاید یہ اس کی شعوری کوشش نہیں ہوگی۔ یہ جذبہ بے اختیار ہوتا ہے مگر میں اپنے دل کا کیا کروں، اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ کبھی دل چاہتا ابھی فروہ کے گھر چلا جائے اور اسے خود پوچھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس خیال کو جھٹک دیتا۔ اپنے طور پر اندازہ لگاؤں گا۔

اس سے ایسی بات کرنا فی الحال مناسب نہیں ہوگا۔ اتنے دنوں کے بعد ملنے کی خوشی اور بے تابی پر گرد پڑ گئی تھی۔ وہ کم سم سی کیفیت میں اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کا ذہن ان دو کو ہی سوچے جا رہا تھا۔

اسے پتا نہیں چلا باسم اس کے کمرے میں چلا آیا۔ لائٹ بھی اس نے آکر آن کی۔ "تم کب آئے اور اندھیرا کیے کیوں بیٹھے ہو؟"

"مجھے پتا نہیں چلا اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"کمال ہے، عجیب خبطی آدمی ہو یار رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔ اندھیرا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔" وہ اس کے سامنے بستر پر آبیٹھا۔

"کیسا رہا ٹور؟" پھر خود ہی بولا۔

"تمہارے لیے اچھا ہی رہا ہوگا۔ پہلی بار اسلام آباد گئے تھے ہر چیز نئی ہوگی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے۔" عادل کو آج پہلی بار اس کا مذاق اڑانا بہت برا لگا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

"تم سمجھ رہے ہوگے میں واپس چلا گیا تھا۔ چلے تو مجھے جانا تھا۔ معروف بندہ ہوں۔ اتنے دن نکالنا میرے لیے آسان بات تو نہیں مگر وہ عثمان کی سالگرہ تھی۔ گھر پر ہی منائی تھی ہم نے۔ سارا انتظام میں نے ہی کیا۔ بہت خوش تھے سب اور مجھے بھی بہت مزہ آیا۔ میں نے عثمان کے ساتھ باقی سب کو بھی گفٹ دیے۔ فروہ کا جو سوٹ لیا تھا۔ وہ پورے چھ ہزار کا ہے۔"

"چھ ہزار۔" عادل نے اپنے خریدے ہوئے تحائف کے بارے میں سوچا۔ شاید سارے تحفوں کی کل رقم اس کے قریب قریب ہوگی۔ اس کا جی چاہا وہ باسم سے سوال کرے۔ آپ میری خوشیوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں مگر اسے کسی کے سامنے اور خاص کر باسم سے اس طرح بات کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی تھی۔

"میں تقریباً روزانہ ہی ان کے گھر جاتا ہوں پھر ہم سب کہیں نہ کہیں سیر کے لیے نکل جاتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کی کمپنی نہ ہوتی تو یقیناً میں تمہیں مس کرتا

مگر اب تو ہم سب کو دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

عدی چپ چاپ بیٹھا۔ یہ سب سنتا رہا اور اس رات تنہائی کے احساس نے اپنی ذات کی کمزوری نے ہار جانے کے احساس نے اسے سونے ہی نہیں دیا۔ یہ رات بڑی لمبی اور حبس زدہ تھی اور جب دن ہوا تو عدی نے دیکھا روشنی پھر بھی نہیں پھیلی۔ اس نے سارے گفٹ اٹھا کر بے دلی سے الماری میں ڈال کر تالا لگا دیا اور بغیر ناشتا کیے آفس چلا آیا۔

وہ فروہ سے ملنا چاہتا تھا، اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ کیا پوچھوں گا۔ کس طرح پوچھوں گا۔ یہ تو سچ ہے کہ باسم کی شخصیت میرے مقابلے میں بہت زوردار ہے۔ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہے مگر فروہ ایسی لڑکی ہے تو نہیں۔ اس کا دل ابھی تک فروہ کی سائیڈ لیتا تھا۔ ہر کوئی اپنا مفاد عزیز رکھتا ہے اور پھر باسم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس روز ذہن و دل کی کشمکش میں دل ہار گیا مگر اگلے روز جب غصہ اور غم تھوڑے سے کم ہوئے۔ تب اس نے فروہ کے بارے میں بہت سوچا۔ اتنی سنجیدہ اصول پسند لڑکی کیا محبت میں دھوکا دے سکتی ہے۔ نہیں، یہ ممکن تو نہیں۔ مجھے ایک بار ضرور اسے ملنا چاہیے۔ اس سے کچھ پوچھنا ضروری بھی نہیں۔ بدلی ہوئی تو ہر انداز اس بات کا اعلان کرے گا۔

آفس سے واپسی پر اس شام جب وہ فروہ کے گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو پہلی بار وہاں جانے کے خیال سے اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ بغیر کسی اہتمام کے تیار ہوا تھا اور بڑی عجیب سی کیفیت کے ساتھ اس کے دروازے تک آیا تھا۔ دروازہ اس کے چھوٹے بھائی گڈو نے کھولا تھا۔

"آہا عدی بھائی آپ آئے ہیں۔ باسم بھائی تو روز ہی آپ کا انتظار کرتے ہیں۔" وہ تو بچہ تھا اس کے لیے کا اظہار کیا کرتا ہے۔ وہ اس سے ہاتھ ملا کر شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھا۔

"عدی بھائی، امی اور ثوبیہ باجی بازار گئی ہیں۔ نانی سو رہی ہیں۔ آپ ایسا کریں، ڈرائنگ روم میں آجائیں۔" عدی اثبات میں سر ہلا کر ادھر ہو لیا۔ گڈو یہ کہتا ہوا کچن کی طرف چل پڑا۔

"میں آپ کے لیے شربت بنا کر لاتا ہوں۔"

ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر اندر سے آتی آوازوں نے عادل کے قدم روک لیے تھے۔ اس نے فروہ کو اتنا تیز تیز بولتے کبھی نہیں سنا تھا۔ پتا نہیں وہ کس سے مخاطب تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آپ روزانہ یہاں کیوں آتے ہیں اور کل میری غیر موجودگی میں آپ نے عثمان کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنا لیا۔ اتنے سارے گفٹس بھی اٹھا لائے۔ آخر کیوں، ان سب عنایات کی وجہ کیا ہے آخر؟"

"وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کے گھر آنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"مگر ہم آپ سے یہ سب کچھ قبول نہیں کر سکتے۔" اس نے یقیناً کچھ باسم کے آگے پھینکا تھا۔

"مگر تمہارے گھر والوں نے تو اعتراض نہیں کیا تھا۔"

"آپ غلط بیانی سے کام مت لیں۔ میری امی اور نانی جان نے منع کیا تھا۔ تب آپ نے ان سے کہہ دیا میں یہ سب فروہ کی مرضی سے خرید کر لایا ہوں۔ مجھے حیرت اور بہت افسوس بھی ہے کہ آپ نے میرا نام لے کر جھوٹ بولا۔"

"تم مجھے اچھی لگتی ہو فروہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اور عدی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"عدی۔" وہ ہنس پڑا۔

"تم عدی کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ ارے دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والا وہ بے وقوف سا لڑکا۔ جرأت اور ذہانت تو اس میں نام کو نہیں، وہ بھی کیسے سکتی ہے۔ ذرا سہا تو رہا ہے ہر کسی کے

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سامنے۔ پتا ہے اسے ہمیشہ اترن ہی ملی ہے۔ یہاں تک کہ پاؤں میں اپنی تایازاد بینا کے جوتے ہوتے تھے۔ جو بھی گھر آتا تھا اسے لڑکیوں والے جوتے پہنے دیکھ کر خوب ہنستا تھا اور اس کے کپڑے ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے اور بڑے ہوتے تھے۔ کیونکہ یہ اپنے تمام کزنز میں دبلا پتلا، مریل سا تھا۔ ان کے کپڑے کسی کسی طرح اسے ٹھیک سے بیٹھتے ہی نہیں تھے۔"

"میرے والد میرے بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ باسم صاحب! میری امی ہمیں نانی جان کے پاس لے آئیں۔ امی جاب کرنے لگیں۔ نانی جان ہمیں سنبھالتیں، ہماری دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ میری امی کی جاب معمولی اور تنخواہ بہت کم تھی۔ مجھے یاد ہے اسکول جانے کے لیے میرے پاس سوئٹر نہیں تھا تو میری امی نے ابا مرحوم کا ایک سوئٹر جتنا چھوٹا ہوسکتا تھا کر کے مجھے دے دیا۔ وہ سوئٹر مجھے بہت کھلا اور لمبا سا تھا۔ خاص کر بازو تو بہت لمبے تھے۔ لڑکیاں بہت مذاق اڑایا کرتی تھیں میرا اور پتا ہے شام کو سبزی والوں کے پاس باسی سبزی جو بکنے سے رہ جاتی تھی۔ وہ ہم بہت سستے داموں لے لیا کرتے تھے۔ ایسا وقت بھی آیا کہ ہم چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار ہی کھانا کھا سکتے تھے۔"

"پرانی باتیں ہیں، بھول جاؤ۔ فروبہ۔" باسم نے ہمدردی سے کہا۔

"نہیں، ہمیں اپنے ماضی پر شرمندگی نہیں ہے۔ نہ مجھے، نہ عدی کو، یہ جو بینا کے جوتوں والی بات آپ مجھے بتا رہے ہیں یہ عادل بہت پہلے مجھے بتا چکا ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محنت کر کے اپنا مقام بنایا ہے۔ آپ تو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والوں میں سے ہیں۔ ایسے لوگ احساسات سے عاری اور اوسط ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ جایئے کوئی اپنے جیسی لڑکی تلاش کیجیے اور جاتے ہوئے اپنے یہ تحفے ضرور لے جایئے۔ ہمارے کسی کام کے نہیں۔"

"ارے عادل بھائی! آپ ابھی تک یہیں پہنچے

ہیں۔ میں تو شربت بنا کر لے بھی آیا۔" گڈو کی آواز نے باسم اور فروبہ کو بھی چونکا دیا۔

"عدی آیا ہے۔" وہ بے تابی سے دروازے کی جانب لپکی۔ باسم چپکے سے اپنا سامان اٹھا کر نکل گیا۔

"آؤ ناں، اتنے دنوں کے بعد آرہے ہو۔ کیا لیٹ ہو گئے تھے۔ ہم سب تو کل تمہارے منتظر ہیں۔" وہ کتنی خوش تھی اس کی آمد پر۔

اور عدی اپنی سوچ پر شرمندہ تھا۔ "فروبہ! ابھی مجھے تمہاری شاگردی کی مزید ضرورت ہے۔" اس نے ساری بات اس کے سامنے رکھ دی۔

"دکھ ہوا مجھے مگر خوشی بھی۔ تم یہاں تک چلے تو آئے۔"

"ہاں، میں بے یقین تھا کہ فروبہ بھی دھوکا دے سکتی ہے۔"

"کیا لائے ہو ہمارے لیے اسلام آباد سے۔" وہ کتنی امید اور جوش سے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ زیادہ تو نہیں لایا مگر لایا ہوں۔"

"بات زیادہ کی نہیں ہوتی بس کچھ لے کر آنا ہی اہمیت رکھتا ہے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔"

"ہاں، مگر پہلی اور آخری بار، آئندہ اعتماد کا ساتھ نہیں چھوڑنا۔ یقین کو ساتھ رکھنا ہے۔"

"وعدہ کرتا ہوں، ایسا ہی ہوگا۔"

"ہاں، ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اعتماد، یقین، دوسروں کی نیک نیتی کا یقین ہی زندگی کی خوشیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ زندگی بہت تھوڑی ہے۔ کیوں نہ اسے اعتماد، یقین اور محبت کے ساتھ بسر کیا جائے۔"

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ..... فریحہ اعجاز
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حنا بُشریٰ

بھرم

"حد ہوتی ہے ندیدے پن کی!"
گلی میں آئے سبزی والے سے آلو، میتھی، ٹماٹر اور پیاز لے کر حبیبہ کچن میں بڑبڑاتی ہوئی آئی تھی۔

"عجیب عادات و طور طریقے ہیں!" سبزی ٹوکری میں ڈالنے کے بعد اس نے میتھی سنبھال لی تھی۔

"پتا نہیں کیسی ان کی تربیت ہوئی ہے!" وہ ابھی تک کھول رہی تھی۔

میتھی کی ایک گٹھی وہ بنا چکی تھی کہ چولہے پہ رکھے پریشر کوکر نے سیٹی بجا کر گوشت گلنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ آج دوپہر کے کھانے میں اسے دو سالن بنانے تھے۔ آلو گوشت بچوں کی فرمائش اور آلو میتھی شوہر کی پسندیدہ تھی۔ لہٰذا آج اس نے جلدی ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ تاکہ شوہر اور بچوں کے آنے سے پہلے سب تیار ہو۔ گوشت گل چکا تھا۔ اور ساتھ ہی ڈور بیل نے ماسی کے آنے کی بھی اطلاع دے دی تھی۔

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

☆☆☆

"بچوں کے کمرے کا باتھ روم صاف کر دیا زبیدہ!"

دن کے بارہ بجے تک تیزی سے ہاتھ چلاتے حبیبہ شوہر اور بچوں کی فرمائش تیار کر چکی تھی۔ آلو گوشت بھی تیار تھا اور آلو میتھی بھی۔ خاتون خانہ بہت حد تک مطمئن ہو چکی تھی۔ اب اس کا سارا دھیان زبیدہ کی طرف تھا جو ہفتہ بھر کی چھٹی کے بعد کام پہ دوبارہ آئی تھی۔ حبیبہ نے زبیدہ کے ساتھ لگ کر آج پورا گھر خوب اچھی طرح سے چمکایا تھا۔

"جی باجی......!"

صفائی ستھرائی کے بعد کچن میں پڑے برتنوں کا ڈھیر دھونے کے بعد زبیدہ نے کچن کی بھی خوب اچھی طرح سے دھلائی کر دی تھی۔

"چائے پی کر جانا!" زبیدہ سب کام دن بارہ بجے تک نمٹا لیا کرتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، برتن دھونا اور ہفتے میں ایک بار واشنگ مشین لگانے کے علاوہ اکثر وہ مصروفیت کے دنوں میں حبیبہ کے ساتھ سبزی بھی بنا دیتی تو نرم طبیعت کی مالک حبیبہ اسے اس اضافی کام پہ ہر ماہ کی تنخواہ میں دو تین سو اضافی دے دیتی تھی۔

"جی باجی!"

کاموں سے فارغ ہو کر وہ جانے سے پہلے چائے پی کر جاتی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ چائے پینے کے دوران دونوں میں کبھی نہ کسی موضوع پہ ہلکی پھلکی بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ اور پھر زبیدہ اگلے کام کے لیے نکل جاتی تھی۔

"باجی بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں!"

جس طرح روز بارہ بجے حبیبہ اس کی چائے نہیں بھولتی تھی بالکل اسی طرح روز جانے سے پہلے زبیدہ یہ پوچھنا نہ بھولتی تھی۔

"ہاں......!" حبیبہ کو ایک دم سے کچھ یاد آ گیا تھا۔

"دودھ کے دو ڈبے لا دو!"

زبیدہ اپنی آخری ڈیوٹی پوری ذمے داری سے ادا کرنے کے بعد باہر دروازے سے ہی رخصت ہو گئی تھی۔ مگر دروازہ بند کرنے سے پہلے حبیبہ کی آنکھ نے پھر وہی منظر دیکھا تھا۔ جو پچھلے ایک ہفتے سے اسے کوفت کا شکار کرنے کا باعث بنا تھا۔

"پتا نہیں کس قسم کے لوگ آ گئے ہیں محلے میں!" بھنک کر بڑبڑاتے ہوئے حبیبہ نے دروازہ قدرے سختی سے بند کیا تھا۔

"بھٹے والے..."

بھٹے والے سے دو بھٹے لینے کے بعد پیسے ادا کرتے ہوئے بے اختیار حبیبہ کی نگاہیں سامنے والے گھر کی طرف اٹھیں۔ تو وہ اچھی خاصی ٹھٹک گئی تھی۔ وہ آنکھیں سامنے والے گھر کی چھت سے چپکے چپکے روز حبیبہ کو دیکھتی تھیں۔

حبیبہ سبزی لے رہی ہوتی۔ وہ آنکھیں اسے دیکھتی رہتیں۔ وہ گلی میں آئے بھٹے والے سے بھٹے لیتی تو وہ آنکھیں محویت سے اسے تکتی رہتیں۔ قلفی والا، آئس کریم والا غرض کے حبیبہ جو کچھ بھی اپنا خریدتی وہ دو آنکھیں بھی اس بات سے غافل نہ رہتی تھیں۔

وہ ہر ہر چیز کو پوری توجہ سے دیکھتی۔ اور یہ دیکھنا معمول بن گیا تھا۔ شروع میں تو وہ سامنے آ جاتی تھی۔ مگر جب اسے احساس ہوا کہ حبیبہ کو اس کا دیکھنا ناگوار گزرتا ہے تو وہ اب چھپ کر دیکھتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے حبیبہ نے ایک غصے بھری نگاہ ڈالی اور دروازہ بند کر لیا تھا۔ حبیبہ کا غصہ دیکھ کر وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی، امید تو یہی تھی کہ ایسی "غضب ناک گھوری" کے بعد وہ اپنی عجیب و غریب اور ناقابل فہم حرکتوں سے باز آ جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

حبیبہ کے ساتھ اگلے آنے والے دنوں میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا تھا۔

"حد ہے بھئی ڈھیٹ پن کی......!"

☆☆☆

"زبیدہ! سامنے والے گھر میں کون لوگ آئے ہیں!" معمول کی طرح زبیدہ سب کاموں سے فارغ ہوئی تو چائے تیار تھی۔ آج چائے کے علاوہ حبیبہ نے اس کے لیے چھلی بھی لے رکھی تھی۔

"کون وہ سامنے گھر والی اماں جی!"

بھٹہ کھاتے زبیدہ کا سوال نا سمجھی کا شکار لگا تھا۔

آج تو سامنے والی نے حبیبہ کو چڑانے کی انتہا کر دی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ شوہر اور بچے گھر پہ تھے۔ حبیبہ سبزی والے سے ساگ لے رہی تھی۔ اسے لگا کہ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ حبیبہ کا شوہر چھلی فروش سے چھلی خریدنے لگا تو تب بھی دیکھنے والی متوجہ تھی۔ دوپہر میں پھل والے سے امرود اور مالٹے خریدے تب بھی وہ لڑکی وہیں موجود تھی۔

"آخر یہ ماجرا کیا ہے؟" حبیبہ اب الجھ رہی تھی۔

"اس کو سارا دن کوئی کام نہیں جو یوں ہمارا ہی تعاقب کرتی رہتی ہے!" حبیبہ اب پوری سنجیدگی کے ساتھ اس بارے میں غور کر رہی تھی۔

حبیبہ اس محلے میں کچھ عرصہ پہلے ہی آئی تھی وہ یہاں زیادہ لوگوں کو نہیں جانتی تھی۔ ایک دو گھروں کے علاوہ حبیبہ کی کسی سے کوئی خاص سلام دعا نہ تھی۔ سامنے والے گھر میں یہ لڑکی کون تھی اور اس کا آخر مسئلہ کیا تھا؟ وہ حبیبہ کو کیوں چوری چھپے دیکھتی تھی۔ حبیبہ کے کچھ پلے نہ پڑا تھا۔ تو اس نے زبیدہ سے ہی پوچھ لیا۔ جو اس محلے کے ہر گھر کو جانتی تھی کیونکہ دو چار گھروں میں تو وہ کام بھی کرتی تھی۔

"جی اماں جی ہیں، وہ سامنے والے گھر میں رہتی ہے!" حبیبہ کو یہ تو نہیں پتا تھا کہ وہاں کون کون رہتا تھا مگر اس لڑکی سے کافی دنوں سے آمنا سامنا ہو رہا تھا۔

ان دس دنوں میں مجال ہے کہ وہ لڑکی ذرا بھی غافل رہی ہو۔ قلفی والا، پاپڑ والا، شکر قندی والا، گول گپوں والا آواز لگاتا۔ حبیبہ کے بچے اکثر ہی کچھ نہ کچھ لینے کی ضد کرتے تو حبیبہ کو وہ لڑکی جھانکتی نظر آتی۔ سنجیدہ سے چہرے پہ حبیبہ نے کبھی بھی مسکراہٹ نہ دیکھی تھی۔

"اچھا وہ......!" زبیدہ بھٹہ ختم کر چکی تھی۔

"اماں جی کی بہو ہے سونیا......!"

اور پھر زبیدہ کی زبانی اصل قصہ حبیبہ کے علم میں آیا تو اس روز دوپہر کے سالن میں اس نے شوربہ بڑھا کر سالن کی مقدار زیادہ کر لی تھی۔

☆☆☆

حبیبہ کے سامنے والے گھر میں چار افراد تھے۔ ضعیف بیمار ماں، ان کا پچیس چھبیس سالہ بیٹا اسعد، بہو سونیا اور دو سال کا پوتا۔ گھر میں تنگی تھی۔ اسعد جو کے دیہاڑی دار مزدور تھا۔ اس کی آمدنی کچھ خاص نہ تھی۔ جو کمایا کھا لیا۔ آمدنی نہ ہوتی تو فاقہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ وہ بمشکل زندگی کی گاڑی چلا رہا تھا۔ گھر میں مسائل کا انبار لگا تھا۔

مہنگائی کے اس دور میں اسعد اپنے گھر والوں کے اخراجات ہر ممکن حد تک پورے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر مہنگائی کے اس دور میں افراد خانہ محرومیوں کا شکار تھے۔ چھوٹی بڑی ہر ضرورت کے لیے ترس رہے تھے۔ بیس سالہ سونیا ان مصائب کے باوجود صبر سے گزارہ کر رہی تھی مگر انسان تھی۔ تنگی ترشی اور محرومی نڈھال کیے رکھتی تھی۔

☆☆☆

"اوہ اچھا تو یہ معاملہ تھا......!" آلو گوشت تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ حبیبہ نے بس اب گڑ والے چاول پکانے تھے۔ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے حبیبہ نے ایک نگاہ گھڑی پہ ڈالی تھی۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ رات کے کھانے کے لیے سالن اسی وقت سے چولہے پہ چڑھا دیتی تھی۔

سونیا کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ دل میں اب ہمدردی سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے سنجیدہ سے چہرے پہ محرومیوں کی داستان حبیبہ نے پڑھ لی تھی۔

وہ گلی میں آتے جاتے لوگوں کو خریداری کرتے دیکھتی رہتی تھی۔ مگر خریدنے کی خواہش کے باوجود وہ

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کچھ نہیں خریدتی تھی۔

"باجی ...... بیچاروں کے ہاں بڑی تنگ دستی ہے!" زبیدہ کے الفاظ حبیبہ کے کانوں میں گونجے تھے۔

"اوہ خدایا...... میں کتنا غلط سمجھ رہی تھی......!" گڑ والے چاول دم پہ رکھتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

ایک چھوٹے ڈونگے میں آلو گوشت اور ایک بڑی پلیٹ میں گڑ والے چاول نکالتے ہوئے حبیبہ کے دل نے اسے ملامت کی تھی۔

"ندیدی...... بدنظر!" سونیا کی تانک جھانک حبیبہ کو بہت ناگوار لگتی تھی۔ وہ ان سب چیزوں پہ گندی نظر کے اثرات دور کرنے کے لیے نا جانے کیا کیا پھونکا کرتی تھی۔

"ابھی ہمارے پیٹ میں اترا نہیں۔ بدنظروں نے نظریں بھی لگانا شروع کر دی......!" حبیبہ اصل صورت حال سے لاعلم تھی اس لیے ناگواری سی ہوتی تھی۔

"کوئی ڈھیٹ ہڈی لگتی ہے!"

حبیبہ کبھی اسے گھوریوں سے ڈراتی تو کبھی دروازہ زوردار انداز میں بند کر کے اپنی ناگواری اور غصے کا اظہار کرتی۔ مگر اب دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

کھانا ٹرے میں رکھ کر وہ گیٹ کی طرف بڑھی تھی کہ ٹیوشن سے اس کا بیٹا بنٹی بھی آ گیا تھا۔

"ماما کہاں جا رہی ہیں؟" یقیناً اسے بھوک لگی تھی۔

"بس میں پانچ منٹ تک آئی بیٹا۔ وہ سامنے والی آنٹی کو کھانا دے کر آ!"

"ماما! لیکن مجھے بہت بھوک لگی ہے!" وہ بھوک کا بہت ہی کچا تھا۔

"ان آنٹی کو کھانا بعد میں دے دینا......!" بنٹی نے بھوک سے منہ بسور لیا تھا۔

"ہو سکتا ہے بیٹا...... کسی کو ہم سے بھی زیادہ بھوک لگی ہو!"

ایک ہاتھ میں کھانے کی ٹرے اور دوسرے ہاتھ سے بنٹی کے گال کو تھپکتی حبیبہ کے قدموں کا رخ باہر کی طرف تھا اب بھلا اپنے پانچ سالہ بیٹے کو کیا محروم ہمسائے کے "بھرم" کی ساری کتھا کیا سناتی جو اسے سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

"جب اللہ نے تمہیں رزق کشادہ اور ضرورت سے زیادہ دے رکھا ہو تو اس میں سے سب سے پہلے ضرورت مند ہمسائے کے لیے حصہ نکالو......!" حبیبہ کو امی کی نصیحت یاد آ رہی تھی۔

"اور ہمسایہ بھی ایسا ضرورت مند جو اپنی محرومی کا "بھرم" رکھتے ہوئے نہ تو ہاتھ پھیلا رہا ہو اور نہ ہی منہ سے کچھ مانگ رہا ہو۔ اس کا تو زیادہ حق ہے۔" امی کی ایک اور نصیحت یاد آئی تو اس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ باہر نکلی تو روز والا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ گلی میں مالٹے والا آیا تھا اور عورتیں مالٹے خرید رہی تھیں سونیا اپنی چھت سے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے یہ دیکھ رہی تھی۔ حبیبہ کو ایک دم سے دیکھا تو وہ گھبرا کر دیوار کے پیچھے ہو گئی تھی۔ اب وہ حبیبہ سے چھپنے لگی تھی۔

مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ حبیبہ نے سونیا کے گھر کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ عہد بھی کیا تھا۔ کہ آئندہ سے اپنے کھانے میں سے ہمسائے کا حصہ نکالنا نہ بھولے گی۔ جو نہ تو اپنی ضرورت کا اظہار زبان سے کر رہا ہو اور نہ ہی ہاتھ پھیلا رہا ہو۔ اور خاموشی سے اپنی محرومی و عزت کا "بھرم" رکھے ہوئے ہو۔

"یہ کھانے کی ٹرے لے لو......!"

چھت سے جھانکتی سونیا کو کہتے ہوئے حبیبہ کے دل اور آواز میں ڈھیروں سکون اتر آیا تھا۔

☆☆

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

گھنگھور گھٹا سیاہ رات میں تسلسل سے برس
رہی تھی، آسمان سے گویا یک لخت تمام ستارے ہی
ٹوٹ کر برس رہے تھے۔ ٹوٹ کر گرتے موتی ٹپ
ٹپ بوندوں کی صورت فضا میں خنکی لے آئے تھے
بنا پلک جھپکائے، کھڑکی کے کھلے پٹ سے آتی

قرۃ العین خرم ہاشمی

فیصلہ

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

ہواؤں میں نم آلود چہرہ لیے کسی مٹی کی مورت کی مانند وہ نجانے کب سے بارش کو برستے دیکھ رہی تھی۔

یونہی یادوں کی پوٹلی میں سے وقت کے گھڑیال نے کچھ ان گنت یادوں کے سنہرے لمحات ڈال دیے تھے اور ماضی میں کہ وہ رو رہی تھی، گریہ وزاری لیے ماضی میں گم ہو چکی تھی۔

”تاجور، مجھے بھی مہندی کا کوئی اچھا سا ڈیزائن بنا دو ناں۔“ سلمٰی نے تاجور سے کہا تو وہ جو سب لڑکیوں کو مہندی لگا لگا کر اپنی دوہری ہوتی کمر کو ذرا ٹیک لگا کر سیدھی کرنے کو تھی ایک دم اپنی جگہ پہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

”اچھا لگا دیتی ہوں۔“

وہ پہ مشکل لبوں پر مسکان سجائے بولی تھی

”ہماری تاجور کے تو ہاتھ میں جادو ہے ہر فن مولا ہے ہماری تاجور، جو کام کو جھٹ پٹ کر ڈالتی ہے اس لیے تو خاندان بھر میں تاجور کے چرچے ہیں۔“

یہ رشتے کی دور پرے کی عزیزہ تھیں۔

یہ سن کر جہاں فرح بیگم کے چہرے پر طمانت پھیلی تھی۔ وہیں جیٹھانی نادیہ کے چہرے کے عضلات تن سے گئے تھے۔

”ہائے کتنا پیارا ڈیزائن بنایا ہے تم نے۔ اچھا سا دولہا ملے تمہیں دل سے دعا دی ہے۔“

میک اپ سے تیار دلہن ندا نے دل سے دعا دی تھی۔ ندا کی دعا پر وہ جھینپ سی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر دھنک رنگ بکھر گئے تھے ”آمین امین“

فرح تو خوش ہو گئی تھیں لیکن نادیہ کو اپنی مہندی جیتی بیٹی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بالکل خوشی نہ ہوئی تھی اور یہ تاثر اس کے چہرے پر بھی ملتا تھا۔

خود اس وقت اپنی خواہش کو دبائے وہ جیتی ہوئی تھی۔ بھلا کس لڑکی کی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کے بھی ہاتھوں میں مہکتی مہندی رچے، کلائیوں میں چوڑیاں بجیں، اور ہری، نیلی پیلی چوڑیاں تو تاجور کی ازل سے کمزوری رہی تھیں۔ لیکن وہ سب کی خوشی میں خوش ہونے والی لڑکی تھی سو اس لیے اس نے سب کی فرمائش کو باری باری پورا کیا تھا۔

جب اس کی مہندی لگانے کی باری آئی تو فرحاد نے آواز لگائی تھی۔

”لڑکیو! کوئی چائے تو پلا دو۔“

مردانے سے آتی فرحاد کی آواز رات اس پہر میں آئی تھی۔ جب فنکشن اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ وہ اکیلی واحد تھی جس کے ہاتھ مہندی سے رچے نہ تھے۔ اب جبکہ وہ خود اپنے ہاتھوں میں مہندی لگانے کا سوچ ہی رہی تھی تو فرحاد کی آواز پر اسے رکنا ہی پڑا تھا۔ اول تو وہ سدا کی ٹھہری بامروت دوسرا آواز لگانے والا کوئی اور نہیں فرحاد تھا۔ جس کی اک اک آواز پر رکنا ٹھہرنا وہ از خود فرض عین سمجھتی تھی۔

”بچیوں نے مہندی لگا لی ہے اب یہ کونسا وقت بھلا فرمائش پروگرام کا۔ تیسرا دور ختم ہوا ہے چائے کا۔ اب بس سب سونے کو تیار گرتی پڑتی جا چکی ہیں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ اب میں کچن کی راہ لوں۔“

نادیہ بیگم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اچھا خاصا لیکچر پلا دیا تھا۔ وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑی ساری بات سن رہی تھی۔

”اوہ اماں آپ بھی ناں۔ ہر وقت ڈانٹنے کے در پہ رہتی ہیں، شور شرابے سے میرے سر میں شدید درد ہے۔ اس لیے کہہ رہا تھا۔“

وہ ناگواری سے بولا تھا۔ لیکن نادیہ نے تو اس کی بات پر ذرا بھی کان نہ دھرے تھے۔ اصل میں مہندی کا فنکشن تو کل کا تھا۔ آج تو بس خاندان میں سب مدعو تھے کل لڑکے والوں نے بھی باقاعدہ آنا تھا۔ تو کل دن زیادہ مصروف گزرنے والا تھا۔ اس لیے وہ اب آرام کرنا چاہتی تھیں تا کہ کل آنے والے مہمانوں کو اچھی طرح سے ویلکم کر سکیں۔

☆☆☆

نادیہ کے جاتے ہی وہ خود چپکے سے کچن میں گھس گئی تھی۔ جہاں شکورن بیگم برتنوں کو دھو دھا کر ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا تھا۔ تب تک ماسی سارے کام نمٹا کر جا چکی تھی۔ وہ دو کپ چائے بنا کر پلٹی ہی تھی جب اسے خیال آیا کہ نجانے فرحاد نے کچھ کھایا بھی ہو گا کہ نہیں۔ اس نے دیکھا بریانی فریج میں رکھی تھی گرم کر کے چائے کے ساتھ وہ ٹرے میں سجائے وہیں اک جانب میز پر رکھ کر فرحاد کو بلانے چل دی تھی۔

اب یہ بھی اک مرحلہ تھا کسی خیال کے پیش نظر اس نے اپنا سیل فون اٹھایا تھا اور فرحاد کا نمبر پریس کیا تھا دوسری ہی کال پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔

”خیریت ہے؟“

وہ چونکا تھا۔

گھر میں پہلے بھی جب کوئی کام ہوتا تو وہ فرحاد کو اسی طرح میسج یا کال کر لیا کرتی تھی۔

”چائے پی لو آ کر۔ اب ادھر آئی تو پھر سب ہی دوبارہ فرمائشیں نہ کر لیں۔“ واقعی اب تو وہ تھکن سے خود چور چور تھی۔ یہ تو اس کے دل میں احساس تھا۔ فرحاد دو منٹ میں ہی آ گیا تھا۔ وہ میز پر اس کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ چائے کے ساتھ گرما گرم بریانی دیکھ کر وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

”مجھے معلوم تھا اور کسی کو میرا خیال ہو نہ ہو تمہیں تو ضرور ہو گا۔“

وہ بے حد دھیمے سے بولا تھا لہجہ گہرا جبکہ الفاظ سادہ تھے۔

”اس لیے کہا ہی تمہیں“ وہ کچھ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

”آواز تو لگائی تھی سوچا سن ہی لو گی۔“

وہ بھی حاضر جوابی میں ایک ہی تھا۔ شوخ سے لہجے میں دوبدو تھا۔

”اچھا جی“ وہ بس یہ ہی کہہ کر رہ گئی تھی۔ اسے فرحاد کی نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ بے حد گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

”تم نے مہندی نہیں لگائی؟“ خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا تھا۔

”ہاں مہندی“ وہ چونکی تھی۔ اس نے اچانک دونوں ہتھیلیاں پھیلا دی تھیں۔

”یہ کیا نہ مہندی نہ چوڑیاں، تم جانتی ہو نا مجھے یہ دونوں چیزیں بہت پسند ہیں۔“

اک خاموش رشتے کی ڈوری میں بندھا، اک ان دیکھی انجانی محبت سے گندھا لہجہ محبت سے پُر تھا۔ وہ اچانک بات کرتے کرتے رک سی گئی تھی اس کی سرمئی آنکھیں اٹھی تھیں کچھ کہنے کو مگر پھر حجاب آڑے آ گیا اور پھر جھکتی چلی گئی تھیں۔ کبھی کبھی محبت بھی انسان کو کمزور بنا ڈالتی ہے فرحاد کی مشتاق نگاہیں تاجور کی نگاہوں سے ہم کلام ہوئی تھیں۔ محبت بھرا پیغام فصاحت، بلاغت دوسرے دل میں منتقل ہوا تھا۔

تاجور کو فرحاد کی چمکتی آنکھیں شعاعوں جیسی لگتی تھیں، جو تاریکی کو تاراج کر کے روشنی کر رہی تھیں۔

”تاجور! جب تم مسکراتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میرا دل تمہاری آنکھوں کی مسکان میں دھڑکنے لگتا ہے، جانتی ہو جب اداس لمحات میں من پسند کا ساتھ میسر ہو۔ تو توجہ اور محبت کے اصول سونی اس کو دان کرنا چاہئیں۔“ وہ بے حد محبت سے سرگوشی کر رہا تھا، اس سے پہلے تو اس نے اتنے واشگاف لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ شادی کے ہنگامے ختم ہوتے ہی تھے کہ گھر میں اک نیا ہنگامہ سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شادی میں تاجور نے محسوس تو کیا تھا کہ وہ جگمگاتی نگاہیں اس کو مسلسل اپنے حصار میں لیے رکھی ہیں۔ لیکن وہ تو فرحاد کی محبت میں اتنی گم تھی کہ اسے اور کسی شے کا ہوش بھی کہاں تھا۔

”فاروق احمد اونچے گھرانے کا بچہ ہے، خوب کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ میں نے تو اپنی طرف سے ہاں کر دی ہے وہ لوگ آئیں گے کسی دن۔“ ابا کے الفاظ تھے جو تاجور نے دروازے کی اوٹ سے سنے تھے۔ کانوں میں گویا سیسہ پگھلتا ہوا انڈیل دیا ہو۔

”میں تب ہی کہوں کہ صبا بیگم بار بار مجھ سے تاجور کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھیں۔ مگر تاجور کے ابا۔ وہ تو بہت امیر گھرانہ لگتا ہے۔“

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

فرح کشمکش کا شکار تھیں، کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہ پہنچ پا رہی تھیں۔

"دیکھو نیک بخت، یہ تقدیر کا کھیل ہوتا ہے۔ تم کو تو اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں کل دکان پر تھا۔ جب فاروق خود ملنے آیا تھا۔ اسے میں نے خود بلوایا تھا۔ اتنا امیر لڑکا، پڑھا لکھا، باشعور بچہ ہے۔ اکڑ تکبر چھو کر بھی نہیں گزرا ہے۔"

تاجور کے دل میں وسوسوں نے جنم لیا تھا فرحاد کو کسی طرح معلوم ہونا چاہیے تھا مگر اسے کوئی موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی فرحاد کو معلوم ہو گیا تھا۔

"یہ مٹھائی کون لایا ہے۔"

برفی کا ٹکڑا سر شام منہ میں ڈالتے فرحاد نے پوچھا تھا۔ ایک ہی تو گھر تھا۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔

"ہونا کیا ہے۔ مقابلے بازیاں۔ اب تاجور کا رشتہ میری ندا سے بھی اونچے گھرانے میں طے کیا ہے فرح نے" نادیہ نے تو ساری زندگی اپنی زبان پر پہرے نہ بٹھائے تھے خواہ اس زبان سے کسی کا بھی کلیجہ چھلنی ہوتا رہے۔ اب جب سے بے حد خوبرو فاروق کو انہوں نے دیکھا تھا اور یہ جان کر کہ فاروق نے خود چاہت سے تاجور کا رشتہ طلب کیا ہے اور ہونے والی ساس بھی تاجور کو شادی کے موقع پر کام کاج کرتے پسند کر چکی ہیں۔ تب سے وہ تو حسد اور جلن کا شکار تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح اس رشتے میں روڑے اٹکائیں۔ فرحاد کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ مٹھائی اس کے لیے زہر بن چکی تھی۔

☆☆☆

"تاجور تم اس رشتے سے انکار کر دو۔" فرحاد کا میسج اسے ملا تھا۔ تب سے وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔

"آپ رشتہ مانگ لیں تو بات از خود ختم ہو جائے گی۔" اس نے جوابی میسج کیا تھا۔

"میں اماں سے بات کروں گا۔ تم چاچی سے کہو کہ تم یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی ہو۔"

وہ کشمکش کا شکار تھی۔ اس نے تو سنا تھا کہ محبت کرنے والے ہر مشکل کو خود پر سہہ لیتے ہیں۔ مگر یہ گھر کا ہی معاملہ تھا۔ اگر ایک بار بھی فرحاد یا نادیہ بیگم اس کے لیے رشتہ بھیجتیں تو تاجور کو معلوم تھا کہ ابا جان اپنے رشتوں کو ہی ترجیح دیتے۔ مگر دوسری جانب سے ہنوز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ دکھی تھی۔ فرحاد نے اسے کڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"کیا سب کو ہی عشق رنگ چڑھا لگتا ہو گا یا آج کل مجھے ہی اس کے رنگ چھلکنے لگ رہے ہیں۔"

اس نے خود کلامی کرتے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں دیکھا تھا۔ آسمان پر سیاہ و سرمئی بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں تیرتی دکھائی دی تھیں۔ موسم کے تیور خطرناک تھے۔ خود اس کے دل کا موسم بھی بگڑا ہوا تھا۔ تاجور نے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ باقاعدہ منگنی کی رسم سے پہلے انکار کر دے گی۔

اے گردش ایام مجھے رنج بہت ہے
کچھ خواب تھے ایسے جو بکھرنے کے نہیں تھے۔

وہ درمیانی راہداری عبور کر کے فرحاد سے بات کرنے آئی تھی اس نے سوچ لیا تھا کہ آج وہ ہر حال میں اماں سے صاف کہہ ڈالے گی کہ اسے فاروق سے شادی نہیں کرنی ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ فرحاد کے کمرے کے پاس پہنچی اسے محسوس ہوا کہ فرحاد کسی سے بات کر رہا ہے۔

"نیلی تم جانتی ہو نا اماں اتنی جلدی میری شادی کے لیے نہیں مانیں گی۔"

دوسری جانب سے شاید منت سماجت کی جا رہی تھی۔ دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔

نیلی کون ہے؟

یہ سوچ کر ہی کہ کوئی لڑکی فرحاد کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑے بیٹھی ہے، تاجور کی سانس رکنے لگی تھی اس کو لگ رہا تھا جیسے اس کی آتی جاتی سانسوں کا تسلسل ٹوٹ رہا ہے۔

سب خواب، ارمان ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔

بس ایک درد، اک غم، اک آہ لبوں سے نکلی تھی۔

"ارے تم پریشان نہ ہو، ایک بات سن لو میں جب بھی شادی کروں گا صرف تم سے ہی کروں گا۔"

فرحاد کا لہجہ محبت سے لبریز تھا۔ وہی لہجہ وہی انداز جو اس نے ہمیشہ تاجور کے ساتھ روا رکھا تھا۔ آج اس لہجے کی حق دار کوئی اور لڑکی بن چکی تھی۔

☆☆☆

وہ وہیں پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ دل البتہ زور زور سے دھڑک کر کسی انہونی کا پتہ دے رہا تھا۔ دوسری طرف سے نجانے کیا کہا تھا کہ فرحاد نے قہقہہ لگایا تھا۔

"شادی اور تاجور سے۔ تم نے سوچا بھی کیسے؟ وہ صرف میری کزن ہے۔"

وضاحتی لہجہ اپنایا گیا تھا۔

تاجور کی آنکھ کا پانی آنسوؤں کی صورت بہنے لگا تھا۔ وہ لوٹ جانا چاہتی تھی مگر قدم جیسے جم سے گئے تھے۔

"تم نے ضرور دیکھا ہو گا شادی میں بھی۔ مگر وہ تو ہی میرے آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ میں ہوں ہی اتنا ڈیشنگ۔"

اس سے اوپر زیادہ اس میں سننے کی سکت ہی نہ تھی۔ اس لیے وہ بنا آہٹ واپس لوٹ آئی تھی۔ دل بوجھل تھا اپنے بستر پر ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

نجانے کتنی دیر بیٹھی رہی تھی۔ جب فرح بیگم نے آ کر کمرے کی بتی جلائی تھی۔

"کیا بات ہے تاجور، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

اس کا زرد چہرہ دیکھ کر فرح کو تشویش ہوئی تھی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر تاجور کا ماتھا چھونا چاہا تھا مگر تاجور بستر پر ڈھے سی گئی تھی۔

بے ہوش نیم جاں سی تاجور کو فرح نے جھنجھوڑ کر دیکھا تھا۔ آناً فاناً ہاسپٹل لے جایا گیا تھا۔ تاجور کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔

ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ تاجور کو کسی بات سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ تاجور پورے دو دن بعد ہوش میں آئی تھی۔ چپ چاپ لیٹی رہتی تھی۔ خاموش نگاہوں سے ماں کا روتا چہرہ ابا کے جھکے کندھے دیکھتی۔ اسے پچھتاوے نے گھیر لیا تھا۔ شکر کے کرنے سے پہلے اس کو اس کے رب نے تھام لیا تھا۔ ورنہ بڑا خسارہ ہو جاتا۔

فرح اس کے لیے یخنی بنا لائی تھیں۔ ابا فروٹ لا کر اس کے پاس بیٹھے تھے۔ یہ اس کے اپنے تھے۔ اس کی تکلیف میں درد محسوس کرنے والے تھے۔

"میری بچی کتنی کملا سی گئی ہے۔ تاجور، تجھے کیا روگ لگ گیا ہے۔ کیا تو اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔ اگر تو ناخوش ہے تو کہہ دے، ہمیں تیری خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی پیارا نہیں ہے۔"

فرح نے اس کے ماتھے کے بال سہلاتے ہوئے بہت پیار سے کہا تھا۔ تاجور کا دل بھر آیا تھا اس کی ماں کی محبت کی حد تھی اور وہ کیا کرنے والی تھی۔ اک شخص کی فریبی محبت کا شکار ہو کر اپنے ہی والدین کا دل دکھانے والی تھی۔

"اماں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو یہ کیوں خیال آیا؟" وہ اب مسکرائی تھی۔ اتنے عرصہ میں ہی اس نے جان لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"بس بیٹا! فکر تو رہتی ہے۔ کل تجھے چھٹی مل جائے گی اور دو دن بعد تیری منگنی ہے۔ تیاری بھی کرنی ہے۔ تیری ساس کی اپنی طبیعت خراب تھی اس لیے ہاسپٹل نہ آ سکی۔ میں نے کہا کہ تاجور یوں بھی کل گھر آ جائے گی۔ وہ بے حد فکرمند تھیں تیرے لیے۔"

اسے اچانک احساس ہوا کہ جب سے وہ یہاں آئی ہے۔ نہ تو فرحاد آیا تھا اور نہ ہی تائی اماں نے آ کر حال پوچھا تھا۔

"اماں! کیا میری بے ہوشی کے وقت میں تائی اماں آئی تھیں۔"

دل کا سوال نہ چاہتے ہوئے بھی لبوں پر آ ٹھہرا تھا۔

"ارے وہ کیوں آنے لگیں۔ جوڑوں کے درد

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کا بہانہ بنا لیا۔ کہنے لگی مجھے تو ہاسپٹل جاتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے اور فرحاد تو ماں کے کہنے میں ہے کب آتا بھلا۔"

وہ حیران تھی کہ اسے صاف منظر پہلے کیوں دکھائی نہیں دیا تھا۔ فرحاد تو ماں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ وہ جو اپنی ماں کے سامنے اس کا نام نہ لے سکا ساری عمر اس کا ساتھ بھلا کیا نبھاتا؟

وہ سوچوں میں گم تھی، جب دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی تھی اور فاروق اندر آیا تھا۔

وہ ایک خوبرو اور بے حد پرکشش نوجوان۔ اس کے چہرے پر بکھری اپنائیت بھری مسکان دیکھ کر وہ چونک گئی تھی۔ اس وقت ابا اور اماں دونوں ہی موجود نہ تھے۔ ابا اماں کو گھر چھوڑنے گئے تھے تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر لیں۔

"آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔"

وہ بے حد تہذیب سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تازہ گلاب کا گلدستہ تھا۔ اس نے سامنے بڑھایا تھا۔

تاجور نے ہولے سے مسکرا کر تھام لیا تھا۔

"ویسے جو لوگ آپ کو اتنا ڈسٹرب کر چکے ہوں کہ آپ کے دل و دماغ پر قابض ہو چکے ہوں۔ ان کو اتنا سا ڈسٹرب کرنا تو بنتا ہی ہے۔"

فاروق کے سچے لہجے نے تاجور کو نظر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اب جلدی سے اچھی ہو جائیں۔"

فاروق کو اس نے پہلی مرتبہ بغور دیکھا تھا۔ فاروق کا فرحاد سے کسی معاملے میں کوئی بھی مقابلہ نہیں تھا۔ مسابقت ہر لحاظ سے ناموزوں تھی۔

☆☆☆

پھر وہ دن بھی بالآخر آ ہی گیا۔ فرحاد نے اس سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی تھی اس کا فون فرحاد کے میسجز سے بھرا پڑا تھا۔ بالآخر اس نے فرحاد کو بلاک کر دیا تھا۔ جب در دل کے ہر راستے پر پہرے بٹھا لیے ہوں تو پھر یہ رستہ بھی کیوں؟

وہ منگنی کے لیے بالکل تیار بیٹھی تھی۔ سسرال والے آ گئے تھے۔ اماں نے کہا تھا کہ وہ لوگ منگنی کی بجائے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ تاجور نے مسکرا کر حامی بھر لی تھی۔

اس وقت پنک کلر کے خوب صورت دیدہ زیب لباس میں ملبوس وہ قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ جب اس کے عقب میں آہٹ ہوئی اور فرحاد سخت تیور لیے کمرے میں بنا دستک کے چلا آیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے تاجور! تم میرے میسجز کا جواب نہیں دے رہی اور ادھر باہر پھپھو بتا رہی ہیں کہ آج تمہارا نکاح ہے۔"

فرحاد کے چہرے پر غصے کا رنگ تھا۔ انانیت کا، حکمرانی کا رنگ جو ہر رنگ پر غالب آ چکا تھا۔

اس نے پلٹ کر فرحاد کو دیکھا تھا۔ اپنے سر پر پنک دوپٹے کو مزید انداز سے ٹھیک کیا تھا اور بولی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں فرحاد بھائی؟"

تاجور کے انداز سے زیادہ لفظ بھائی نے فرحاد کو چونکایا تھا۔ فرحاد کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔

"تم ہوش میں تو ہو تم نے تو مجھ سے محبت کے دعوے کیے تھے وہ سب کیا ہوا؟"

فرحاد کا لہجہ غصیلا ہو چلا تھا۔

"میں نے نہیں آپ نے۔ آپ نے دعویٰ کیا تھا محبت کا۔ اور وہ بھی نام نہاد محبت کا۔ لیکن میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میں ساری زندگی اسی شخص کے ہمراہ اپنی زندگی بسر کروں گی جہاں میرے والدین نے کہا ہے۔"

وہ اک اعتماد سے اور انداز بے نیازی سے باہر نکل گئی تھی۔

بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دینے سے زندگی روشن اور منزل سہل ہو جاتی ہے۔

☆☆

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

شازیہ الطاف ہاشمی

کاہش تمنا

شمسہ نے نماز پڑھ کر اپنی انگلیوں کو غور سے
ا اور نجانے کیا سوچ کر رونے لگی آنسو بے اختیار
یہ انگلیاں بالکل میرے ابا جیسی ہیں۔ کتنے دن
ے ان سے بچھڑے، ان سے بات کیے۔ یہ سوچ
ں کے آنسو رکے نہیں سارے بند توڑ کر بہہ گئے
اس کی اکلوتی نند شبو بھی بیٹھی ہوئی تھی، مجھے اس
بے حد ناگوار گزری تھی، جس کالاڈ کی وجہ سے
ا ٹیڑھا میڑھا سا ہو گیا تھا، اسے اپنی بھابھی پسند

نہیں آرہی تھیں اور شمسہ سوچ رہی تھی کہ وہ ایسا کیا
کرے کہ اسے اچھی لگے کسی بھی طرح۔
شادی کے پہلے دن ہی شبو کے بھائی نے
صاف صاف لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ میری بہن اگر
خوش نہ رہی تو تم بھی خوش نہیں رہ سکو گی جو بھی ہو جس
طرح بھی ہو اسے خوش رکھنا ہی ہوگا۔
وہ محبت کے جن نغموں کا تصور لے کر آئی تھی
جس چاہت کی اسے تمنا تھی وہ خاک ہوئی پڑی

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھی۔ راکھ اڑانے کا فائدہ اپنے سر کو ہی گندا کرنا تھا۔ وہ بے انتہا صابر تھی اس نے صبر کرلیا مگر شبو صرف اس کی صبر کی پہچان تھی اس کی موقع شناسی کی نہیں۔

شبو نے جی بھر کر اسے ذلیل کیا تھا۔ قدم قدم پر ٹھکرایا تھا اور شوہر نے بھی صرف شبو کو ہی دیکھا اس کی خوشی کی کسی کو ضرورت نہیں تھی وہ پہلا شادی کا دن جس میں ادریس اس کے لیے ناشتا لینے گیا اور واپسی پر شبو کی پسند کی حلوہ پوری لے آیا بد قسمتی سے اس نے پہلے اپنی پلیٹ میں ایک پوری نکال لی تھی جس پر شبو کی حالت غیر ہوگئی تھی۔

وہ اتنی کم سن نہیں تھی جتنی بن رہی تھی اس عمر کی لڑکیاں تو چھوٹا موٹا گھر کا ہر کام کرلیتی ہیں مگر وہ صرف کام کے وقت ہی ننھی سی بنا کرتی تھی۔ آگے پیچھے ہر وقت جو کسی ساس کی طرح پہرے داری کرتی تھی۔ ادریس نے اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر شبو کو دے دی تھی پھر اسے منانے لگا تھا جب پھر اسے دیکھا، بہت محبت سے کہا بھی تو کیا۔

''کوئی بات نہیں شبو تمہاری بھی تو بیٹی ہے۔''

اسے یہ جملہ زہر لگا تھا ابھی ایک رات شادی کو گزری ہے اور میں پلی بڑھی اتنی بڑی بیٹی کی ماں بھی بن گئی۔ اس طرح کی میری بیٹی ہو تو کس کے لگاؤں منہ پر دو تھپڑ۔۔۔ مگر تردید کرنا گویا اپنی شامت بلانے کے مترادف تھا اس لیے چپ رہی کہ جھلا کھالیا اور مزید صبر کی خود کو تلقین کی تھی۔

شمسہ نے صبر۔۔۔ کرنے کے باوجود یہ بات اپنی ماں کو بتائی تھی جسے سن کر وہ بھی حیران رہ گئی تھیں بالشت بھر کی لڑکی اور یہ حرکتیں مگر جب بیٹی دے دی تو پھر صبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کی امی بھی بے انتہا صبر والی خاتون تھیں اور اس کمرے کے اندر کیسا آتش فشاں پھٹنے کو بے تاب بیٹھا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا کوئی بھی تو نہیں۔

سالوں گزر گئے اس بد شکل کو جھیلتے نہ بہنوں کی ڈھنگ سے عزت کرسکی، نہ کھلا دیا دلاتا ہوا زندگی خاک ہو کر رہ گئی تھی، میرے دل کے جذبات

کا کوئی کیا کرسکتا ہے دھوپ چھاؤں بارش طوفان میں کی گئی ہر خدمت پر شبو کو آگ پڑ رہی تھی وہ دن بدن شمسہ کا جینا حرام کر رہی تھی، بھابھی کی بےعزتی تذلیل بھی اس کی ایک ادا ٹھہری۔ وہ ہنس کر برداشت کر جاتی کہ ہر بہلا وا ہر محبت کا نفسیاتی حربہ بے کار تھا۔ وہ جس قدر اسے اپنانے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ دور بھاگ کھڑی ہوتی۔

شمسہ کا چھوٹا بھائی سالوں میں وہ بھی بڑا ہوگیا تھا۔ اس سے ملنے آیا تھا یوں تو وہ ہر کسی کی بے عزتی کرکے کاکی بن جاتی تھی مگر اس دفعہ کاکی کے بجائے الہڑ مٹیار بن گئی تھی شمسہ کو معلوم تھا کہ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے اب اللہ جانے اس نمونے کو کون بیاہ کر لے جائے گا تمام عمر اس نے شمسہ پر غور کیا تھا خود پر غور کرنے کی اسے فرصت نہیں تھی۔ اسے بلیقہ خوب صورتی چھو کر بھی نہیں گزری تھی مگر شمسہ نے کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

رات کے وقت وہ اور اس کا بھائی چہل قدمی کرتے کرتے لڑ پڑے تھے شاکر بھائی نام ہی کا شاکر تھا ورنہ اس سے زیادہ خود غرض اور بے شرم اور کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ ہر کسی سے ہی روپیہ بٹورنا چاہتا تھا چاہے جس بھی طریقے سے حاصل کرسکے پیسوں کے معاملے میں وہ کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ وہ تو اپنی ماں کو کھری کھری سنا دیتا تھا کیا بڑی بہن۔ اس وقت بھی شمسہ اس سے بات کرکے اپ سیٹ رہی تھی ان کے ہاں الٹا حساب تھا کہ بھائی بہنوں سے پیسے نہ ملنے پر لڑتے تھے اور ماں بہن ایک کرکے چھوڑتے تھے۔

بہرحال شمسہ نے اسے کسی طرح واپس بھیج کر جان چھڑائی تھی۔ اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا ایسے بھائیوں کی چھاؤں سے اللہ بچائے۔

اس دوران شبو نے ذرا بھی مداخلت نہیں کی پھر جب ادریس نے اسے خود بلا کر اس کی زوردار دعوت کی اور اسے سیر بھی کروائی اور شبو نے اعتراض بھی نہ کیا۔ تب اس کے دماغ میں ایک خیال آیا تھا کہ شبو

لی جاسکے خود ادریس نے پہنایا تھا وہ تو سننے کا عادی نہیں تھا۔

''شبو اور شاکر کی شادی کروادو۔ تمہاری بھی تو بچی ہے۔'' اور شمسہ اس دفعہ انکار بھی نہیں چاہتی تھی اس نے فوراً اپنی ماں سے اپنی بیٹی شبو کی بات کی تھی البتہ شاکر جتنے دن بھی رہا مہمان نوازی کا خوب لطف اٹھایا۔ اپنی پسند کی ہر چیز سیروں کے حساب سے کھائی تھی اور ان کے گھر میں موجود ایک ایک چیز کی قیمت کا پوچھتا رہا کہ یہ کتنے کی ہے یہ کتنے کا ہوگا۔

اس کی دلچسپی شبو میں نہیں تھی البتہ شبو اب تیزی چھوڑ کر اپنی ماں کا بھائی ڈھونڈ چکی تھی وہ چپکے چپکے اسے دیکھتی رہتی اسے سوچتی رہتی اور ساتھ ساتھ شمسہ کی گود میں بھی بلا تکلف گھسنے کی کوشش کرتی کہ مجھے اپنے بھائی سے بیاہ دو شاکر اس کا خواب بن چکا تھا۔

اور پھر شمسہ کی امی ایک دن آئیں اور اس خواب کو تعبیر دے کر اسے اپنے ہمراہ لے گئیں۔ شبو کا رخصتی کے وقت ایک بھی آنسو نہیں نکلا وہ بھاگ کر کار میں جا بیٹھی تھی نئی سلطنت کی ملکہ کو بننا تھا۔

جیسی بھابھی ہے ویسا ہی اس کا بھائی بھی ہوگا مہربان محبت کرنے والا، باتیں پی جانے والا اور بھابھی کی امی اس کی سازش کی چاپ جیت بلائیں لے رہی تھیں اسے اپنے خیال پر بار بار یقین آرہا تھا کہ وہ راج کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

دور کھڑی شمسہ نے بالآخر اس گند سے نجات حاصل کرلی تھی۔ فتح کا یقین ہو تو بندہ ایک نہ ایک دن ضرور جیت ہی جایا کرتا ہے وہ بھی جیت کر پرسکون تھی کہ جتنا بھی جیوں گی اپنی مرضی سے سانس تو لے سکوں گی جاتے جاتے شمسہ کی امی نے اس کا بوسہ لیا اور اس کے گھر سے شبو کو لے کر رخصت ہوگئیں۔

شبو بے تابی سے حجلہ عروسی میں شاکر کا انتظار کررہی تھی اسے اپنی پہلی محبت پر دل سے اعتبار تھا وہ کوئی گری پڑی شبو نہیں تھی وہ کہ کرنا نہیں کرنا جانتی تھی وہ طاقت ور تھی اور شاکر سے زیادہ پیسے والی۔ شاکر

کرتو اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اسے میں ملی ہوں یہ غرور تھا اسے۔

یہ شادی کا تیسرا دن تھا جب شاکر کی امی شاکر کو کوئی بات مسلسل سمجھا رہی تھیں اور وہ مسلسل انکار کررہا تھا وہ ہاں کرتا ہی نہیں جانتا تھا اسے صرف اپنی ماں سے محبت تھی چاہے غلط ہو یا درست۔

''وہ کھاتے پیتے گھر سے ہے شاکر اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔''

اس طرح امی نے شاکر کو وہ راہ دکھائی تھی جہاں منزل نفرت کے سوا اور کچھ نہیں ان کا مسلسل سمجھانا بلکہ راہ سے بھٹکانا جاری تھا۔

اس دن شبو صبح ہی صبح اٹھ کر منہ دھو رہی تھی جب ساس امی نے جاکر دوپہر سے بے ہوش پڑے شاکر کو اٹھایا تھا حالانکہ وہ مردوں سے شرط لگا کر سویا تھا اس وقت اسے کوئی بھی نہیں جگا تا تھا۔

''اٹھو شاکر! شبو کے لیے بازار سے کوئی اچھا سا ناشتا لے آؤ جلدی کروں بھوکی بیٹھی ہے کب سے!''

امی نے زور دے کر کہا تھا کیونکہ وہ واقف جو تھیں۔

''میں ناشتا لاؤں اس نواب زادی کے لیے۔'' اس کہتے کی''اس کے بعد اس نے شبو کو جوتوں سے ناشتا کروایا تھا کہ شمسہ تو اپنے ناشتے کو شاید بھول گئی ہوگی شبو کو اپنے ناشتے کا سوچ کر ہی خوف آیا تھا۔

''یہ کیا ناشتا ہے امی''

اس نے شمسہ کو فون کیا تھا جہاں شمسہ نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی تھی کیونکہ سننے میں ہی بھلائی تھی ورنہ امی نے تو اس کے ناشتے کا پورا پورا حساب لے لیا تھا۔

''میں کرتی ہوں شاکر سے بات، میری بیٹی کوئی گری پڑی تھوڑی ہے تم فکر نہ کرو۔''

شبو اسے ماں کی تڑپ سمجھ رہی تھی مگر فون کے دوسری طرف شمسہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا تھا کیونکہ ایسے ہی اور ناشتے شبو کے منتظر جو تھے۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

فریحہ اشتیاق

آشیانے کا دکھ

ٹیرس کی مدھم روشنیاں آسمان کی سیاہی کے مدمقابل بہت کم تھیں۔ ٹیرس کی گرل پر بازو ٹکائے وہ بے معنی منظروں میں کھوئی تھی۔ ٹریفک کا مخصوص شور تھوڑے سے فاصلے پر موجود پٹرول پمپ کی تیز روشنیاں، پٹرول کے حصول کے لیے لوگوں اور گاڑیوں کی لمبی قطاریں، اپنے عقب سے آتی بچوں کی آوازیں، ٹی وی کی آواز غرض کائنات کی ہر شے اس کا ارتکاز توڑنے میں ناکام ٹھہری تھی۔ اس کے اردگرد رونق تھی، آوازیں اور شور بھی تھا۔ مگر وہ ”عدم“ تھی۔

تب ہی اس کے تین منزلہ کرائے کے گھر کے ساتھ خالی پلاٹ پا اگے درخت نے اس کی توجہ کا رخ اپنی طرف موڑا۔

دو نوعمر لڑکے، ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے لالٹین کی مانند لٹکتے ننھی چڑیوں کے آشیانے پر حملہ آور تھے۔ رات کی تاریکی نے ہڑبڑا کر چڑیوں کے شور کو سنا تھا۔ ساری فضا ان کی احتجاج سے بھری آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔ وہ لڑکے ایک گھونسلے کو نیچے اتارنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ ان کے قہقہے گونج دار اور جوش سے بھرے تھے۔ ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے ایک کا دکھ دوسرے کی خوشی کا باعث کیوں بنتا ہے۔ کیوں؟

☆☆☆

خوشی ارتقا کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ اس نے اور خوب صورت گھر پر سفید رنگ کا راج تھا۔ چھوٹا سا گھر سبزے اور رنگ برنگے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ نرم و ملائم گھاس پر سفید کین کی کرسیاں اور چھوٹی سی گول میز رکھی تھی۔ ایک ہفتہ ہو گیا تھا ارتقا اور شاہ زیب کو اپنی یہ ننھی جنت سجاتے سنوارتے۔ ننھا ارتضیٰ پاؤں پاؤں چلتا گھر بھر میں بھاگتا پھرتا۔ مرتضیٰ کو اس سال اسکول میں داخل کروایا تھا۔ شاہ جہاں نے ممتاز کے لیے تاج محل بنوایا تھا اور شاہ زیب نے ارتقا کے لیے یہ چھوٹا سا سفید گھر تعمیر کروایا تھا۔ گھر چھوٹا تھا مگر ارتقا کا اپنا تھا۔

گھر کے گیٹ کے ساتھ نیم پلیٹ لگی تھی جس پر یہ الفاظ جگمگا رہے تھے۔ ’ارتقا کا سفید محل‘ ارتقا اور شاہ زیب کی نسبت بچپن سے طے تھی۔ دونوں کزنز تھے۔ کم عمری سے جانتے تھے کہ ارتقا شاہ کی ہے اور شاہ تقی (ارتقا) کا ہے۔ تقی کا یہ خواب تھا کہ اس کا اپنا ایک خوب صورت اور منفرد سا گھر ہو۔ وہ سب جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے۔

شادی ہوتے ہی ارتقا اور شاہ نے گھر کے لیے بچت شروع کر دی تھی۔ اگرچہ بچت کا آغاز بہت کم رقم سے ہوا تھا مگر وہ مستقل اس کام میں لگے رہے تھے۔ بچت والی بات کو سب گھر والوں نے ان دونوں کی چھیڑ بنا ڈالا تھا۔ بہت سی خواہشیں دل میں دبا کر بہت سی ضرورتوں کو مار کر انہوں نے ”ایک گھر کے خواب“ کو زندہ رکھا تھا۔ شاہ بہت اچھی پوسٹ پر تھا تقی بھی آن لائن جاب کر رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ آہستہ آہستہ اس جوائنٹ فیملی کے سب ممبران صلح و صفائی سے اپنے اپنے حصے لے کر الگ ہو گئے۔ گھر کے بڑے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

تقی کو آبائی گھر سے جو حصہ ملا وہ بھی اس نے بچت کے ڈبے میں ڈال دیا۔ شاہ نے بھی اپنی اکلوتی بہن نورین کو اس کے حصے کی رقم سونپ کر اپنا گھر بنانا شروع کر دیا۔ وراثت میں ملی رقم اور بچت کا ڈبا اب ان دونوں کے خواب کو حقیقت بنا سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا تقی کا سفید محل تیار تھا۔

☆☆☆

سفید محل کی تابناکیاں عروج پر تھیں۔ دونوں نے نقل مکانی کرانے سے پہلے اپنے بہن بھائیوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک دعوت کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ وہ بہت روشن اور چمکیلا ساون تھا۔ ڈنر کا کھانا شاہ نے آرڈر پر تیار کروایا تھا۔ فروٹ ٹرائفل، فرنی دو طرح کا رائتہ اور سلاد تقی نے گھر پہ تیار کیا تھا، پانچ بجے تک سب مہمان بھی پہنچ چکے تھے۔

وسیع و عریض لاؤنج میں تقی سب کو مختلف ڈرنکس سرو کر رہی تھی۔ تقی کی دو بہنیں اور دو بھائی اپنی فیملیز کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ خوش گوار ماحول میں اسنیکس اور کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہوا گیا۔ شاندار ڈنر کے بعد تقی کی بہنیں رخصت ہو گئی تھیں۔ البتہ شاہ کی تقی کے بھائیوں سے کافی دوستی تھی۔ دونوں قریباً شاہ کے ہم عمر تھے۔ خلاف معمول نورین کافی خاموش تھی۔ ملازمہ سارا پھیلاوا سمیٹ رہی تھی۔ بچے بھی تھک کر سو چکے تھے۔ اس لیے ارتقا بھی قدرے مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔

”شاہ بھائی! آپ نے اپنا گھر تو بنا لیا مجھے میرا حصہ کب دیں گے آپ؟“

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

نورین کا طنزیہ انداز و لہجہ سب نے سنا اور سب ہی حیرت کا شکار ہوئے۔ "کون سا حصہ نورین پہلے تمہارا حصہ ہی تو دیا تھا ہم نے تمہیں۔ بعد میں گھر بنوایا ہے۔"

شاہ نے نا سمجھنے والے انداز میں پہلے نور پھر رمضان (نورین کا شوہر) کی طرف دیکھا۔ جو خود منہ کھولے بیوی کی لن ترانیاں سن رہا تھا۔ لمحوں میں ماحول کی خوش گوار یت اڑن چھو ہوئی تھی۔

"مجھے ایک دھیلا نہیں دیا آپ نے، کیوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ جھوٹوں کی بھی کوئی پہچان ہوا کرتی ہے؟ مرے اور کمرے کا کوئی علاج نہیں۔ مجھے وراثت میں سے اپنا حصہ چاہیے۔"

نورین نے چبا چبا کر کہا۔

"نورا تم کیسی باتیں کر رہی ہو تمہارے گھر میں اور شاہ خود آئے تھے تمہیں رقم دینے تم یہ۔"

"کوئی گواہ، کوئی شہادت کوئی ثبوت ہے تم لوگوں کے پاس؟ کس کے سامنے میرے ہاتھ میں رقم تھمائی تھی؟" نورین تقی کی بات کاٹ کر دھاڑی۔

"یہ من گھڑت کہانیاں مجھے مت سناؤ تم دونوں مجھے اپنا حق چاہیے۔" نورین نے ہوا میں ہاتھ جھلایا۔ "تین دن کا وقت دے رہی ہوں مجھے میرا حصہ دے دو۔ ورنہ عدالت کے راستے سے واقف ہوں میں۔"

نورین نے اپنا بیگ اٹھایا اور چلتی بنی، رمضان ہکا بکا اس کے پیچھے لپکا۔ تقی کے بھائی حیران پریشان ساری صورت حال دیکھ رہے تھے۔

"بھائی! آپ یقین کریں ہم خود اس کے گھر جا کر رقم دے کر آئے تھے پتا نہیں یہ کیوں ایسا کر رہی ہے۔ ہاں جب رقم دی تھی تب گھر پر دوا ہی گئی تھی مگر ہم نے اس کا حق نہیں مارا۔"

تقی روتے ہوئے یقین دہانی کروا رہی تھی۔

"ہمیں تم دونوں پر بھروسا ہے تقی! تمہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ حسد میں کر رہی ہے [illegible]

ہیں کہ کس نیچر کی ہے وہ، اسے بیاہتا شان دار گھر تم لوگوں کی خوشیاں حسد میں مبتلا کر گئی ہیں۔

حاکمانہ طبیعت اور ضد کر چکی ہے چاہے جھوٹی ہو۔ تم لوگوں کو چاہیے تھا کسی نہ کسی کے سامنے اسے حصہ دیتے تاکہ یہ مسئلہ نہ ہوتا۔"

شاہ بالکل چپ تھا۔ تقی کی آنکھیں بھر بھر آنسو بہا رہی تھیں۔ تقی کے بھائی کافی دیر دونوں کے پاس بیٹھے تسلیاں دیتے رہے اور بڑوں کو اس ساری بات میں ڈال کر معاملہ سلجھانے کی راہ دکھائی۔ تقی اور شاہ کے والدین تو حیات نہ تھے ہاں ایک پھوپھو تھیں۔

☆☆☆

پھر کوئی بھی ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔ نورین کو ہدایت نہ ملنا تھی نہ ہی ملی نہ بزرگوں اور شوہر کا سمجھانا کام آیا نہ بھائی، بھاوج کی پریشانی اس کا دل موم کر سکی۔ عدالت کی طرف سے پہلا نوٹس آیا تو شاہ نے اپنے پراپرٹی ڈیلر دوست کے توسط سے اس گھر کے بدلے پیسے لے لیے۔ ساتھ ہی ایک ڈیل بھی کی کہ تین سال تک وہ یہ گھر کسی کو نہیں بیچے گا۔ تین سال بعد دوبارہ لکھوا کر دوبارہ خود یہ گھر خریدے گا نورین کو دوسری بار اس کا حصہ دیا گیا۔ گھر اب باقاعدہ اسٹامپ پیپر والا پکا کام کرنے کے بعد رقم دی گئی باقی رقم محفوظ کر دی گئی۔

محبتیں رخصت ہو گئیں رنجشیں باقی رہ گئیں۔

"تمہارا دل کرتا ہے تو تم مل لیا کرو شاہ، نورین تمہاری بہن ہے۔ مگر مجھے فورس مت کرنا، نہ وہ میرے گھر کبھی آئے گی نہ میں اس کے گھر جاؤں گی۔"

تقی نے حد بندی کر دی تھی، جتنی گنجائش نکلتی تھی نکال لی تھی نورین نے خود رشتوں پر جھوٹ کو ترجیح دی تھی۔ تقی کو بہت دیر لگی خود کو سمیٹنے، سنبھالنے میں اب بھی کبھی کبھی وہ پرانی والی کیفیت میں چلی جاتی تھی۔ شاید اگلے دو سالوں میں وہ اپنی جنت دوبارہ پا لیں مگر نورین کی بدبختی اسے سارک اآئندگی بننے والی تھی۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ سہانا کی بدولت میرے روز و شب سہانے ہو گئے تھے۔ زندگی جیسے ستاروں کی سیج بن گئی تھی۔ بلاشبہ وہ صورت اور سیرت دونوں میں یکتا تھی۔

اور کوئی شک نہیں کہ ہر رشتہ نبھانے میں بے مثال میرے لیے وہ جس جوش و وارفتگی کا اظہار کرتی میں خود پر نازاں ہو جاتا۔ جنت کی حور تھی جو مجھے زمین پر مل گئی تھی۔

"لڑکی سولہ جماعت پاس ہے۔ ایم اے نفسیات......" امی نے جب بتایا تو بے اختیار یونی ورسٹی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ یاد آ گئے۔ عجیب خبط الحواس اور سنکی سے تھے۔ میں جو نام کی خوب صورتی میں کھویا ہوا تھا اور بالمشافہ ملاقات پر غور کر رہا تھا۔ بدمزا ہو گیا۔

"نفسیاتی مریضوں کا علاج بھی کرتی ہے۔" حفصہ باجی نے مزید معلومات دیں۔ ان کے ذریعے رشتہ طے ہوا تھا۔ میرے ذہن میں کرخت نقوش اور الجھے بالوں والی وہ ڈاکٹر آ گئی جو ہماری لائن کے آخر میں رہتی تھی۔ کھردرا لہجہ...... بھاری آواز......

اس سے پہلے کہ میں اپنے خیالات بلکہ خدشات کا اظہار کرتا۔ بہن نے موبائل پہ تصویر دکھا دی۔ کومل سی، تیکھے نقوش والی لڑکی مسکرا رہی تھی۔

"دیکھنے میں اور زیادہ دلکش ہے" میری مسکراہٹ پر بہن نے تبصرہ کیا۔

امی بھی رطب اللسان تھیں اور جب وہ میرے حجلہ عروسی میں داخل ہوئی تو بے اختیار اپنے نصیب پر رشک آ گیا۔

وہ ہم سب کے ساتھ یوں گھل مل گئی جیسے یہیں رہتی آئی ہو شروع سے گویا راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ جب اس جھیل کی پرسکون سطح پر ایک پتھر آ کر گرا۔ اور یہ پتھر سہانا نے ہی پھینکا تھا۔

"آپ سب انکل کو اگنور کیوں کرتے ہیں؟"

[illegible]

باپ سراں دے تاج

عندلیب زہرا

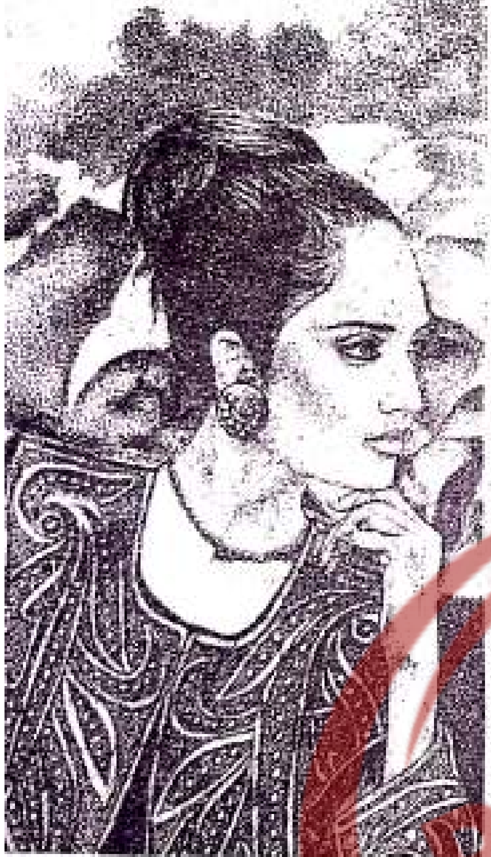

اپنے پرندوں کی دیکھ بھال میں۔ اخبار پڑھتے ہوئے میں نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

جو اپنی بات کہہ کر پرسکون کھڑی تھی۔

"کل انہوں نے آپ سے میڈیسن منگوائی

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تھی۔ شاید آپ بھول گئے تھے۔" اس نے میری
کوتاہی گنوائی۔
"آ...... ہاں...... وہ بس کام تھا۔" میں بہانہ بھی
نہ بنا سکا۔ تاہم سہانا کا رویہ پسند نہ آیا۔ بات آئی گئی
ہوگئی۔ چند دن گزرے تو محترمہ فرمانے لگیں۔
"اسفر کو چاہیے وہ انکل کو ڈاکٹر کے پاس لے
جائے۔ کل اکیلے باتیں کر رہے تھے۔ اور مونا بھی
سسرال سے آ کر آنٹی کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ یاد ہی
نہیں رہتا کہ "کوئی اور رشتہ" بھی اس کا منتظر ہے۔"
مجھے اس کا لہجہ کھلنے لگا۔ سو وہیں ڈانٹ دیا۔ یہ
پہلی تلخی تھی جو ہم دونوں کے مابین پیدا ہوئی تھی۔ پھر
وہ خود ہی بابا کو کام دینے لگی۔ انہیں ٹی وی لاؤنج میں
لا کر بٹھاتی۔ پسندیدہ چینل ڈھونڈ کر لگاتی۔ باتیں
کرتی۔ جس کا جواب ہوں ہاں میں ہی ملتا۔
"انکل تنہائی کا شکار ہیں انہیں لوگوں میں بیٹھنے کی
ضرورت ہے۔" ایک رات اس نے مجھ سے ڈسکس کرنا چاہا۔
وہ اپنے کالج کی البم دکھاتی...... اپنے ماضی کی
باتیں کرتی۔
اب بابا رفتہ رفتہ گفتگو میں حصہ لینے لگے تھے۔
"وہ اتنے چپ رہنے لگے تھے۔" مجھے اب
احساس ہو رہا تھا۔
"اپنا باپ نہیں ہے ناں، تو بس اپنی محرومی مٹاتی
رہتی ہے۔"
امی نے تبصرہ کیا تھا۔ مجھے ان کے لہجے میں
کڑواہٹ لگی تھی جیسے انہیں سہانا کا رویہ پسند نہ آ رہا ہو۔
سچ تو یہ تھا کہ امی، ہمارے گھر میں وہ مینار تھیں یا
مرکز جس کی مقناطیسیت سے ہم سب بہن بھائی
بندھے ہوئے تھے۔
میں آفس سے آ کر انہیں آواز دیتا۔ اسفر کو
سیاحت کا شوق تھا سو سب سے پہلا گفٹ اور سوغات
امی کے لیے لاتا۔ مونا سسرال جا کر بھی روز امی کو فون
کرتی...... ہفتے میں دو چکر لازمی لگتے۔
"میرا وعدہ ہے خود سے...... میں ویک اینڈ امی
کے ساتھ گزاروں گی۔"

وہ پیار سے گلے میں بانہیں ڈالتی۔
بابا شروع سے جاب کے سلسلے میں گھر سے باہر
رہتے۔ پولیس میں تھے...... اس لیے شروع سے امی
ہمارے لیے ہر رشتہ تھیں۔ مکمل اور پرسکون۔
انہوں نے بھی ہمارے سہارے شوہر کی بے
اعتنائی سہی تھی۔ سسرال کے ناروا رویے......
تنہائی...... سو یہ جذباتی تعلق عجیب نہ تھا۔ ہاں
عجیب تو سہانا کے تبصرے تھے جو اب چبھنے لگے تھے۔
"بابا تمہیں مِس کرتے ہیں۔ تم ان کے
پاس بیٹھا کرو......" ایک روز میں نے سنا وہ مونا کو
سمجھا رہی تھی...... اس کے ماتھے پر واضح بل تھے۔
"تمہارے بچپن کے قصے سناتے ہیں اکثر......"
"کیا انہوں نے ہمارا بچپن دیکھا ہے؟ حیرت
ہے۔" مونا کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ اور آنکھوں میں ناگواری
کے رنگ تھے جو یقیناً بھابی کے لیے ہی تھے۔
بظاہر سہانا میں کوئی برائی نہ تھی۔ بس اس کا
ٹوکنا...... یا شاید ہمیں لاپرواہ اور خود کو زیادہ اچھا
ثابت کرنا کسی کو پسند نہ آ رہا تھا۔
اس دن تو حد ہوگئی۔
چھوٹے ماموں کی بیٹی کی مہندی تھی۔ ہم سب
مدعو تھے...... جب بابا کی شوگر ڈاؤن ہوگئی۔ کسی نے
اسے سیریس نہ لیا تھا۔
یہاں تک کہ امی بھی ملازم کو خیال رکھنے کا کہہ کر
ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ سہانا کے چہرے
پر حیرت تھی اور کسی قدر افسوس بھی۔ تاہم وہ خاموش
رہی۔ کچھ دیر فنکشن میں بیٹھ کر وہ میرے ہمراہ ہی گھر
واپس آ گئی۔
"آنٹی کو انکل کے پاس رکنا چاہیے تھا۔" اس
نے سنجیدگی سے کہا تھا۔
اور واقعی گھر میں بابا کی طبیعت بہت خراب
تھی...... بروقت طبی امداد سے طبیعت تو سنبھل گئی۔
لیکن مجھے پہلی بار، ہاں پہلی بار امی سے گلہ ہوا اور میں
نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ پھر جو گھر کی فضا مکدر تھی۔
اب مزید تلخ ہوگئی۔ امی اور مونا کا خیال تھا کہ وہ دلوں

میں خلاف پیدا کر رہی ہے۔ امی رونے لگیں۔
اپنے مصائب...... بیتا تنہا وقت...... قربانیوں
کا ذکر......
"میرا وہ مطلب نہیں تھا امی!" میں بوکھلا کر ان
کے قدموں میں بیٹھ گیا۔
"سوری امی! میں...... وہ......" سہانا زرد چہرہ
لیے پراساں سی کھڑی تھی۔ سب کی شعلہ بار نگاہیں
اس پر تھیں۔
میں نے اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ وہ ساکت
کھڑی تھی۔ کچھ دن بعد کشیدہ صورت حال ٹھیک
ہوگئی...... تاہم سہانا اب...... خاموش رہتی۔
☆☆☆
اکتوبر کے آخری دن تھے۔ جب سہانا کے ابو
کی برسی آئی۔ وہ مجھے لے کر قبرستان گئی۔ اس نے قبر
پر پانی ڈالا...... وہ بہت اداس نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس
کی اداسی، اداس کر گئی۔ قبرستان میں خاموشی تھی لیکن
اس خاموشی میں بھی کلام تھا...... نجانے کتنے رشتے
اپنی بے نور آنکھوں کے ساتھ مدفن تھے...... اپنوں کی
دعا کے منتظر......
واپسی پر میں اس کا ہاتھ تھام کر چل رہا تھا......
پگڈنڈیاں...... دونوں اطراف میں قبریں......
خاموش درخت...... اداس روشنی......
"آپ سب مجھے غلط سمجھتے ہیں شاید۔" اس کی
آواز ابھری......
"آپ مجھے سن لیں ایک بار......" اس نے
مجھے کچھ مزید کہنے سے روکا......
"ایک عورت جب عملی زندگی میں قدم رکھتی
ہے تو سسرال میدان جنگ ہوتا ہے...... اتنے اجنبی
رشتوں میں...... واحد رشتہ اولاد کا ہوتا ہے۔ خون کا
جذبات کا...... تنہائی کا۔ وہ اپنا ہر دکھ...... تنہائی......
آنسو اولاد کے دامن میں ڈال دیتی ہے...... یوں
اولاد ماں کو ہمیشہ دکھی سمجھتی ہے......
ایک ملکہ کی اولاد بھی اپنی ماں کو کمزور...... دکھی
جانے گی...... باپ بھی ہمیں مضبوط نہیں لگا...... تنہا......

کمزور نہیں دکھتا......" اس کا لہجہ تلخ تھا۔
"اصل! یہ ماں سے محبت یا اس کی خدمات کا
اعتراف نہیں ہوتا بلکہ وہ جذباتی ہتھکنڈے ہوتے
ہیں جنہیں ماؤں نے استعمال کیا ہوتا ہے...... جیسے
میری دادی......"
اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف
کیے...... میں دم بخود تھا...... ہم قبرستان سے باہر
درختوں کی چھاؤں میں چل رہے تھے۔
"وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے پھپھو
اور ابو کو محنت مزدوریاں کر کے پالا۔ ہر تکلیف سہی...... جب
ابو کمانے کے لیے باہر چلے گئے تو حالات جادو کی چھڑی
کی طرح بدل گئے...... اب وقت ان کا تھا۔ ابو کو کھونے
کا خوف بھی تھا۔ اس لیے میرے امی ابو میں کبھی ہم
آہنگی نہ ہونے دیتیں۔ کوئی نہ کوئی غلط
فہمی...... ناراضی...... شکوہ ہمارے گھر میں براجمان
ہوتا...... پھپھو بھی ان کے ہم قدم۔ امی ہمیشہ بس
منتظر رہتیں...... مالی مشکل تو کوئی نہ تھی لیکن جذباتی تنگی
ہمیشہ دامن گیر رہتی۔ پھر امی نے ہم بہن بھائیوں کو ہی
محور جان لیا...... اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابو جب اپنے حصے کے
فرائض ادا کر کے اپنی فیملی کی جانب پلٹے ناں، تو امی کا
دامن ابو کے لیے خالی تھا۔
ہم بہن بھائی بے نیاز...... خود میں مگن......
ابو پردیس کاٹ کر آئے تھے۔ تنہائی، مشقت،
تھکاوٹ کے بعد آسودگی کے متمنی...... جذباتی
سہارا...... اب بھلا کیسے ملتا انہیں؟"
ساری فضا اداس ہوگئی تھی...... گھر واپس آ کر بھی
سہانا کی خاموشی قائم رہی...... میں جانتا تھا ادھوری
داستان سنائی ہے۔ شاید کچھ بھرم یا کچھ چھپانے کا پردہ۔
کسی مشترکہ جاننے والے کے ذریعے مجھے علم ہوا
تھا کہ سہانا کے ابو کی وفات کے بعد، اس کے بھائی
ساری جائیداد بیچ کر کینیڈا چلے گئے...... گھر اس لیے بچا
کیونکہ انکل اپنی بیوی کے نام کر دیا تھا۔ اور کچھ رقم جو
بینک میں رہ گئی...... سہانا اور اس کی چھوٹی بہنوں کے
لیے بڑا مشکل وقت تھا...... جو جیسا تیسا گزر ہی گیا۔ کچھ

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

عرصے بعد اس کی والدہ بھی فوت ہو گئیں۔

☆☆☆

زندگی مصروف ہو گئی تھی۔

سہانا بابا کا خیال رکھتی...... ان کی پسندیدہ ڈشز بناتی۔

بابا کا رویہ نارمل ہو رہا تھا...... میں بھی ان کو کمپنی دیتا...... مجھے سہانا کی باتوں سے احساس ہوا کہ یہ کہانی تو گھر گھر کی ہے......

شاید ہر باپ...... ہر شوہر کی......

بابا سرکاری ملازم تھے...... پوسٹنگ ہوتی...... سو گھر پر دادا دادی کا ہولڈ رہتا۔ بابا اپنی افسری گھر میں بھی نافذ کرتے۔

”آنے دو باپ کو......“ دادی ڈراتیں۔

”ارسل اسوہ اتنا گندا رزلٹ...... بتاتی ہوں بابا کو......“ امی جھنجھلا جاتیں۔

”اظفر اتیرا لڑکا کنٹرول سے باہر ہے......“

پھپھو بات بابا کے کان بھرتیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ کا رشتہ ہم سب بہن بھائیوں کے لیے خوف کی علامت بن گیا...... ایک مہیب تاثر...... بارعب رشتہ......

ان کی آمد پر ہم سب باادب، خاموش اور سہمے ہوئے رہتے۔ سانس روکے...... دل میں دعا کو کہ جلدی سے وہ واپس چلے جائیں۔ امی بھی سہمی رہتیں۔

جب وقت نے پلٹا کھایا...... حکومت امی کے ہاتھ میں آئی تو ہم بہن بھائی امی کی کابینہ میں شامل تھے...... وفادار اور درد مند...... دادا دادی راہ عدم سدھار گئے تھے۔ پھپھو کے اپنے مسائل...... بابا کی افسری کا سورج غروب ہو چکا تھا۔

ہم سب میں دوریاں تھیں...... وہ اسٹڈی میں تنہا بیٹھے رہتے۔ اپنی پنشن کے منتظر...... امی اور ہم مگن...... امی نے بابا سے جو گلے شکوے ہمارے دل میں بٹھائے تھے۔ انہوں نے بابا کے دل تک پہنچنے کا ہر راستہ مقفل کر دیا تھا۔

حالانکہ ہم سب کی تعلیم...... جاب...... شادیاں...... عالی شان گھر ان کے مرہون منت تھا۔ لیکن اس وقت یہ باتیں کہاں یاد تھیں بھلا؟؟ میں بابا کو ٹائم دینے لگا...... وہ تمام باتیں جو بچپن اور لڑکپن میں نہ کر سکا اب کرتا تھا۔ امی کا مقام کم نہ ہوا تھا۔ بس بابا کی اہمیت پتا چل گئی تھی......

سردیوں کی دھوپ تھی۔ چھٹی کا دن تھا...... بابا اور مجھ میں مالٹے کھانے کا مقابلہ جاری تھا...... وہ ہنس رہے تھے۔ اسفر اور سوہا بھی امی کو وہیں لے آئے...... سہانا نے آج نئی ڈش ٹرائی کی تھی وہ چاہتی تھی اسے داد ملے...... میں مسلسل زچ کر رہا تھا......

امی نے مجھے گھورا...... بابا نے اسے پیار سے ساتھ لگا لیا...... آسمان پر پرندوں کی واپسی کا عمل اب شروع تھا...... شاید غلط ماں بھی نہیں ہوتی...... بے مہر رشتوں میں اسے اولاد ہی سے تحفظ ملتا ہے...... زندگی کا مقصد...... سہارا......

برے یا ظالم باپ بھی نہیں ہوتے...... اپنے باپ سے گلے شکوے رکھتے وقت اس رشتے کا دیا آرام...... سہولتیں کیوں فراموش ہو جاتے ہیں پردیس کی مشقت......

کڑے موسموں کی سختی...... روٹی کے لیے کی جانے والی تگ و دو...... کچھ یاد نہیں رہتا۔ ذہن میں یاد رہتی ہے ان کی ڈانٹ ڈپٹ...... یا مار دھاڑ

والدین سے محبت میں اولاد کو غیر جانبدار ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی گھر ان ہی دو رشتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔

بابا کی بیماری، سہانا کی باتوں نے ذہن کو نئی سمت عطا کی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر بابا کی پیشانی پر ٹھنڈا بوسہ دیا تھا۔

”اوہ جنٹل مین!“ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور گرم جوشی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔

بند دروازے اب کھل گئے تھے۔

باپ سراں دے تاج محمد
ماواں ٹھنڈیاں چھاواں

☆☆

سائباں بے گماں

الاماں الاماں
اس زمیں پر ہوا
خونِ ناحق روا
چار جانب دھواں
اس طرف ایک خلقِ خدا بے اماں
خوں بہا کون دے
قاتلوں کا بیاں
منصفوں کے لیے
جب کہ ہو معتبر
خلق خاموش ہے
سرخ ہے آسماں
دھوپ کی رہ گزر
راستے بے شجر
سائباں کی طلب، سائباں بے گماں
شہر جلتے رہے، زخم پلتے رہے
بے یقینی کا پھیلا ہوا آسماں
درد کا کارواں بے کراں، ناگہاں
اس خرابے میں آیا ہے تو بے طلب
اور میں بے نشاں

خالد معین

ٹھیک ہے خود کو ہم بدلتے ہیں
شکریہ مشورت کا، چلتے ہیں

ہو رہا ہوں میں کس طرح برباد
دیکھنے والے ہاتھ ملتے ہیں

ہے وہ جان اب ہر محفل کی
ہم بھی اب گھر سے کم نکلتے ہیں

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں

ہے اسے دور کا سفر درپیش
ہم سنبھالے نہیں سنبھلتے ہیں

میں اسی طرح تو بہلتا ہوں
اور سب جس طرح بہلتے ہیں

ہے عجب فیصلے کا صحرا بھی
چل نہ پڑتے تو پاؤں جلتے ہیں

جون ایلیا

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کر دیکھا تو سب خسارہ ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں کسی کنول میں تم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمہارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارہ کہ یہ دوبارہ ہے

عجب اصول ہیں اس کاروبار دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے

نجانے کب تھا کہاں تھا مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے

یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے، ہم تم
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے

امجد اسلام امجد

گر دعا بھی کوئی چیز ہے تو دعا کے حوالے کیا
جا تجھے آج سے ہم نے اپنے خدا کے حوالے کیا

ایک مدت ہوئی ہم نے دنیا کی ہر ایک ضد چھوڑ دی
ایک مدت ہوئی ہم نے دل کو وفا کے حوالے کیا

اس طرح ہم نے تیری محبت زمانے کے ہاتھوں میں دی
جس طرح گل نے خوشبو کو باد صبا کے حوالے کیا

بے بسی سی عجب زندگی میں اک ایسی بھی آئی کہ جب
ہم نے چپ چاپ ہاتھوں کو رسم حنا کے حوالے کیا

خون نے تیری یادیں سلگتی ہوئی رات کو سونپ دیں
آنسوؤں نے ترا درد، دکھ بھی ہوا کے حوالے کیا

فرحت عباس شاہ

[illegible]

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب اللہ بندے کو کوئی نعمت دیتا ہے اور بندہ الحمدللہ کہتا ہے تو بندے نے جو شکر ادا کیا وہ ملنے والی نعمت سے افضل ہوتا ہے۔"

فائدہ:۔
بندہ دنیا کی ظاہری نعمت کو اہمیت دیتا ہے حالانکہ اس نعمت پر جو شکر کی توفیق ملی اور شکر کے نتیجے میں ملنے والی آخروی نعمتیں وہ اس دنیوی نعمت سے بدرجہا بہتر اور افضل ہیں۔ لہٰذا نعمت حاصل کرتے ہی شکر ادا کرنا ضروری ہے اور بندے کے لیے مفید بھی۔

ذمہ داری،

فتح اسکندریہ کی خبر لے کر جب ایک قاصد مدینہ میں آیا تو اس نے اس خیال سے کہ دوپہر کا وقت ہے، امیر المومنین آرام فرما رہے ہوں گے تھوڑا دم لینے کے لیے بارگاہ خلافت کے بجائے مسجد نبوی کا رخ کیا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کی ایک لونڈی بھی وہاں آ نکلی۔
اس نے باتوں باتوں میں جب معلوم کیا کہ وہ اسکندریہ سے آیا ہے اسی وقت جا کر خبر کی اور ساتھ ہی واپس آئی کہ چلو تمہیں امیر المومنین بلا رہے ہیں۔"
حضرت عمرؓ نے فتح کا حال سن کر سجدہ شکر ادا کیا اور جو حاضر تھا، مہمان کے آگے رکھا اور کہا کہ تم سیدھے یہاں کیوں نہ چلے آئے؟
قاصد نے کہا۔
"میں نے خیال کیا کہ یہ آرام کا وقت ہے۔ شاید آپ سوتے ہوتے ہوں۔"
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"افسوس، تمہارا میری نسبت یہ خیال ہے۔ میں دن کو سوؤں گا تو خلافت کا بار کون سنبھالے گا۔"

فرمان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

☆ جب تک کسی سے بات چیت نہ ہو اسے حقیر نہ سمجھو۔
☆ جب عقل کامل ہو جائے، بولنا کم ہو جاتا ہے۔
☆ شرافت عقل و ادب سے ہے نہ کہ مال و نسبت سے ہے۔
☆ علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔
☆ جلد باز آدمی اگر اپنے کیے پر نادم ہوتا ہے۔ اگر نادم نہ ہو تو سمجھو اس کا جنون مستحکم ہو گیا۔
☆ دوسروں کے عیبوں سے ہر اس وقت درگزر کرو جب تم اپنے عیبوں کی صفائی کر چکو۔
تزئین خانم لغاری۔ مظفر گڑھ

سوال سے پہلے دینا،

حضرت سعید بن العاص نے وفات کے وقت اپنی اولاد سے کہا۔
"میری وصیت کون قبول کرے گا؟"
بڑے بیٹے نے کہا "میں۔"
کہنے لگے "میرا قرض ادا کرنا ہو گا۔"
پوچھا "کتنا ہے؟"
کہا "اسی ہزار درہم۔"
پوچھا "کیوں لیا؟"

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

جواب دیا: "دو قسم کے آدمیوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔ شریف النفس حضرات اور جیسے سوال نہ کرسکنے والوں کی۔ جو مجبور ہو کر آتے تھے مگر شرم سے مانگ نہ سکتے تھے۔ فرط حیا سے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں سوال کرنے سے پہلے انہیں دے دیتا تھا۔"

طاؤس کا جذبہ ایمانی

ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک حج کو جانے لگا تو طاؤس یمانی کو طلب کیا۔ انہوں نے دربار میں پہنچ کر فرش کے کنارے جوتیاں اتاریں پھر السلام علیک کہہ کر اس کے برابر بیٹھ گئے اور کہا۔

"کیوں ہشام تیرا مزاج کیسا ہے؟"

ہشام کو سخت غصہ آیا اور کہا: "یہ کیا گستاخانہ حرکتیں ہیں۔ نہ مجھ کو امیر المومنین کہہ کر خطاب کیا، نہ کنیت کے ساتھ نام لیا، نہ میرے ہاتھ چومے۔"

طاؤس نے کہا: "ہاتھ تو میں نے اس لیے نہیں چومے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ کسی شخص کا ہاتھ چومنا جائز نہیں۔ بجز بیوی یا بچے کے اور امیر المومنین کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ تمام مسلمان تجھ کو امیر المومنین نہیں سمجھتے اس لیے میں اگر یہ لفظ استعمال کرتا تو جھوٹا ہوتا اور کنیت کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انبیا اور اولیا کے نام بغیر کنیت کے لیے ہیں۔ مثلاً داؤد، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ اور کافروں کو کنیت کے ساتھ خطاب کیا مثلاً ابولہب۔"

ہشام متاثر ہوا اور کہا: "کوئی اور نصیحت بھی کرو۔"

طاؤس نے کہا: "میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ دوزخ میں بڑے بڑے سانپ اور بچھو ہوں گے جو ان سلاطین کو کاٹیں گے اور ڈنک ماریں گے جو رعایا پر ظلم کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور چلے گئے۔

بیٹے کی تعلیم و تربیت

خلافت بنی امیہ کے زمانے میں ایک بزرگ عبدالرحمان فروخ نامی شخص فوج میں ملازم تھے۔ وہ دور اسلامی کی فتوحات کا تھا اور مسلمان فوجیں بحر و بر کو اسلامی پرچم کے نیچے لانے کا تہیہ کر رہی تھیں۔

چنانچہ خراسانی مہم میں ان کو ستائیس برس لگ گئے۔ جب لوٹے تو جس بچے کو ماں کے پیٹ میں چھوڑ کر گئے تھے، وہ بڑا ہو کر ربیعۃ الرائے کے نام سے موسوم ہو چکا تھا اور امام مالک اور خواجہ حسن بصری اس کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ فروخ جاتے وقت تیس ہزار اشرفیاں اپنی بی بی کے سپرد کر گئے تھے۔ انہوں نے اس کی نسبت استفسار کیا۔ بی بی نے کہا۔

"گھبرایئے نہیں، محفوظ ہیں۔"

اسی اثنا میں فروخ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گئے تو دیکھا کہ ایک شیخ سر جھکائے اونچی ٹوپی پہنے حلقہ درس میں مشغول ہیں اور خواجہ حسن بصری اور امام مالک جیسے اجلہ شامل درس ہیں اور تلامذہ کا ایک ہجوم چاروں طرف سے شیخ کو گھیرے ہوئے بیٹھا ہے۔ پوچھا۔

"یہ کون شیخ ہیں؟"

سامعین نے جواب دیا۔

"ربیعہ ابن عبدالرحمان۔"

فروخ کی حسرت کا اندازہ اس وقت سوائے عالم الغیب کے اور کون کر سکتا تھا۔ گھر آئے۔ بی بی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا۔

"بیٹے کی یہ شان پسند ہے یا تیس ہزار اشرفیاں؟"

شوہر نے کہا: "واللہ میں اس شان کو پسند کرتا ہوں۔"

بی بی نے کہا: "میں نے وہ اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم میں صرف کر دیں۔"

بے شک یہ اس عہد کی عورتوں کی عقل اور علم درست ہونے کی دلیل ہے۔

مثبت رویہ

نپولین ہل مشہور امریکی مصنف ہیں۔ اپنی کتاب "گرو رچ ود پیس آف مائنڈ" میں اپنی سوتیلی والدہ کے مثبت رویے کے بارے میں لکھتے ہیں، جس نے ان کی شخصیت بدل کر رکھ دی۔

"میرے رشتہ داروں نے سوتیلی والدہ کے حوالے سے میرے ذہن میں اتنی باتیں بھر دی تھیں کہ اگر میں ان سے پہلے ہی دن سے نفرت کرتا تب بھی حیرت کی کوئی بات نہ ہوتی۔ ویسے بھی نفرت کرنا بہت آسان کام ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جس دن میرے والد سے ان کی شادی ہوئی، اس دن میرے ایک رشتہ دار کے گھر میں تقریب تھی۔ میرے والد نے اپنی نئی دلہن سے میرا تعارف ان الفاظ میں کروایا۔

"اور یہ ہے تمہارا سوتیلا بیٹا نپولین، جو وائز کاؤنٹی کا شاید سب سے شریر لڑکا ہے۔ اس سے مجھے کسی خیر کی توقع نہیں۔ ہاں اگر یہ کل صبح سے تم پر پتھر برسانا شروع کر دے تو مجھے قطعاً بھی حیرت نہیں ہوگی۔"

یہ باتیں سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو۔ سوتیلی والدہ پر میرا ابتدائی تاثر اس طرح قائم کیا جا رہا تھا کہ میرے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔

میری نئی ماں نے ثابت کیا کہ وہ میرے لیے نئی زندگی ہیں۔ انہوں نے میری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر میرا چہرہ اوپر کیا اور میری آنکھوں میں جھانک کر چند الفاظ ادا کیے اور یہ الفاظ میری زندگی میں انقلاب برپا کر گئے۔ انہوں نے کہا۔

"یہ بچہ اس کاؤنٹی کا شریر ترین بچہ نہیں، بلکہ سب سے ذہین اور باصلاحیت ہے۔ اس کو اگر واضح مقصد مل جائے تو یہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے میرے لیے کوئی اچھی بات کہی تھی۔ میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھ میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا کہ جس عورت کو لوگ سوتیلی کہہ کر مجھے ڈرا رہے تھے، وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جو دوسروں کو ان کی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے میں غیر معمولی مدد فراہم کرتے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ میل جول کا وہ میرا آخری دن تھا۔

میں نے زندگی نئے سرے سے شروع کی۔ رفتہ رفتہ مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ مجھ میں تو اچھا لکھنے کی خداداد صلاحیت موجود ہے۔ میری نئی ماں نے مجھے ٹائپنگ سکھائی۔ ٹائپ رائٹر کی مدد سے میں نے تیزی سے لکھنا سیکھا اور پھر میں اخبارات کے لیے مضامین لکھنے لگا۔

میں کامیاب افراد کے انٹرویو کرنے کا ہنر بھی سیکھ گیا۔ اینڈریو کارنیگی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اینڈریو سے میری پہلی ملاقات دراصل ایک انٹرویو پر مشتمل تھی اور یہ انٹرویو تین دن اور تین رات جاری رہا۔ اس انٹرویو کے بعد ہی میں نے یہ سوچا کہ مجھے انتہائی کامیاب افراد سے ملاقات کر کے ان سے ان کی کامیابی کا راز معلوم کرنا چاہیے۔"

اسی شخص نے آگے چل کر انفرادی کامیابی کے علم سے متعلق تنظیم کو جنم دیا جو آج دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔

ترجمہ: محمد ابراہیم خان

مہکتی کلیاں

- سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے۔ اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے اور نہ خوش۔
- دنیا کو جب رات کی تاریکی کے بعد روشنی میسر آتی ہے تو اس کی نظریں خود بخود روشنی کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔
- جس انسان کے دل میں روشنی نہ ہو، وہ چراغوں کے بدلے میں کیا حاصل کرے گا۔

(واصف علی واصف)

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مسکراہٹیں

مقصد

ایک فلاحی تنظیم کا ایک کارکن دور دراز مقامات پر تعلیم کے فروغ اور اسکولوں کے قیام کی غرض سے چندہ جمع کرنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ ایک اسکول میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"پیارے بچو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ براعظم افریقہ میں چھ ہزار مربع میل کا ایک علاقہ ایسا بھی ہے، جہاں کوئی چھوٹا سا بھی اسکول نہیں ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا۔

"اب آپ بتائیں کہ ہمیں کس مقصد کے لیے پیسے جمع کرنے چاہئیں؟"

"افریقہ جانے کے لیے۔" کئی طالب علموں نے ایک آواز ہو کر جواب دیا۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں

ایک عورت اپنے شرابی شوہر کو راہ راست پر لانا چاہتی تھی۔ نفسیاتی ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا کہ لڑائی جھگڑے کے بجائے وہ شوہر کے ساتھ پیار و محبت کا برتاؤ کرے۔ ایک رات شوہر نشے میں دھت گھر واپس آیا تو بیوی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اس کے موزے اتارے، کپڑے تبدیل کرنے کو دیے اور پھر بڑے پیار سے کہا۔ "ڈیئر اب تم سو جاؤ۔"

شوہر نے گھبرا کر کہا۔ "جان من! کمال کرتی ہو تم بھی اگر میں سو گیا تو میری بیوی مجھے کچا ہی چبا جائے گی۔"

دھمکی

ایک ریستوران میں دو سہیلیاں بیٹھی تھیں۔ کھانے پینے کی چیزیں آئیں تو کھاتے کھاتے ایک نے دوسری سے کہا۔ "کیا بات ہے تم نے کچھ کھایا نہیں، کیا کوئی تکلیف ہے؟"

دوسری بولی۔ "کیا بتاؤں! مجھے ایک دھمکی آمیز خط ملا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ اگر تم نے میرے شوہر سے ملنا جلنا بند نہ کیا تو میں تمہیں قتل کر دوں گی، بس اسی وقت سے میری بھوک مر گئی ہے۔"

پہلی نے کہا۔ "تو تم ملنا جلنا چھوڑ دو، یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

دوسری پریشان ہو کر بولی۔ "مگر مشکل یہ ہے کہ یہ خط گمنام ہے...... پتا نہیں کس شوہر کی بیوی نے لکھا ہے۔"

قابل دید

ایک چیف کانسٹیبل ماہر حیوانیات بھی تھے۔ ایک دن ان کے گھر فون آیا جو ان کی بیوی نے ریسیو کیا۔ ایک صاحب نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ڈاکٹر صاحب کا گھر یہی ہے؟"

"جی ہاں! آپ کو جانوروں کے ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی مدد درکار ہے یا بطور پولیس آفیسر؟"

"دونوں حیثیتوں سے!" جواب ملا۔

"ہمارا کتا منہ نہیں کھول رہا ہے کیونکہ اس کے منہ میں ایک ڈاکو کی ٹانگ ہے۔"

تصدیق

فائزہ نے اپنی دوست ثمینہ کو بتایا۔ "میرا منگیتر افتخار بہت ہی بھلکڑ ہے۔"

"واقعی...... اس میں کوئی شک نہیں۔" ثمینہ نے تصدیق کی۔ "کل مہندی کی ایک تقریب میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے اس کو بار بار یاد دلانا پڑا کہ اس کی منگنی مجھ سے نہیں تم سے ہوئی ہے۔"

کیفیت

ہمارے ایک دوست نے محبت کی شادی کی تھی، ایک دن ہم نے ان سے پوچھا۔ "اپنی بیوی کو سامنے دیکھ کر تمہارے دل پر کیا اب بھی وہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جو شادی سے پہلے ہوتی تھی یا معاملہ کچھ بدل گیا ہے؟"

دوست نے جواب دیا۔ "پہلے میں گھر کے سامنے دیر تک کھڑا کھڑکی کے پردے پر اس کے سائے کو دیکھا رہتا تھا اور اندر جاتے ہوئے ڈرتا تھا اور اب بھی میری یہی کیفیت ہوتی ہے۔"

مجبوری

پاگل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہداری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کا چہرہ اور تاثرات دیکھ کر کانپ گئیں۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے دبی اور خوف زدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ "خدا کی پناہ! ایسی خوف ناک صورت بھی کیا یہ خطرناک ہے؟"

"کبھی ہو جاتی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"آپ اسے کوٹھری میں بند نہیں رکھتے، کیا یہ آپ کے قابو میں نہیں آتی؟"

"نہیں...... اسے کوٹھری میں بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔"

"لیکن کیوں؟" خاتون نے جاننا چاہا۔

"کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

خودکشی

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "کیا واقعی اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی اکثر مردوں کو خودکشی سے باز رکھتی ہے؟"

دوست نے کہا۔ "جی ہاں! اعداد و شمار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خودکشی مردوں کو شادی سے باز رکھتی ہے۔"

ماں میرا احسان

اپنی بیوی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ "میں نے اس سے اس لیے شادی کی تھی کہ اس نے میری جان بچائی تھی۔"

دوست نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"اس نے اپنے باپ کو مجھ پر گولی چلانے سے روکا تھا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

☆☆

بقیہ — ہمارے نام

سطور کے ذریعے امت العزیز شہزاد کو پہنچا رہے ہیں۔ وہ علیل ہیں۔ ان کے لیے خاص طور پر دعا فرمایئے گا۔ آپ کی عمر کی تجویز پر غور کریں گے۔

عدینہ لغاری ٹھٹھہ سے لکھتی ہیں

میرا پہلا خط ہے۔ میں پڑھی لکھی نہیں ہوں بہت ڈر ڈر کے لکھ رہی ہوں غلطی ہو تو (معذرت) تقریباً پچیس سال ہو گئے ہیں شعاع پڑھتے ہوئے، مجھے یاد نہیں ہے میں نے کب پڑھنا شروع کیا تھا۔ مجھے بچپن میں اردو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں سندھی ہوں اور سرائیکی میری زبان ہے۔ جب شعاع ہاتھ لگا تو بس اسی کے ساتھ جڑ گئے اور آج تک جڑے ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ آگے بھی جڑے رہیں گے۔ خط لکھنے کی وجہ حسنہ حسین کی "عمر بیسرا" بہترین کہانی، بہت خوب اقتباس مجھے تو اس کہانی نے بہت رلایا تھا مگر شکر ہے اینڈ اچھی ہوا۔ شکریہ حسنہ حسین جی اس کی کہانی پر لکھنے کی خاص وجہ جنت کمال کا نام یعنی "جنت" اس نام سے میرے کان بچپن سے ہی بہت مانوس تھے کیوں کہ یہ میری بڑی اماں کا تھا، میری بڑی اماں کا نام جنت تھا، میرے والد انہیں "جنت" کہہ کے پکارتے تھے۔

میری بڑی اماں بانجھ تھیں۔ اس لیے میرے والد نے میری امی سے دوسری شادی کی، میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ یہ نام "جنت" بوڑھیوں والا ہے مگر رائٹر نے میرے خیال کو جھٹلا دیا کہ نہیں جی یہ ہیروئن کا بھی ہو سکتا ہے۔

پیاری عدینہ! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ آپ پڑھی لکھی نہیں اس کے باوجود آپ کو مطالعہ کا اتنا شوق ہے کہ پچیس سال سے آپ شعاع کی قاری ہیں آپ نے بہت اچھا خط لکھا اور بالکل درست تبصرہ کیا۔ بس آپ سے ایک شکایت ہے کہ خط لکھنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھیے گا۔

حورین فاطمہ پاک پتن سے لکھتی ہیں

ہم خط لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں جو کہ پہلے ناممکنات میں سے لگتا تھا۔ شعاع کی حیثیت جسم میں موجود ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے اور خواتین اور کرن کی دماغ میں موجود حرام مغز کی طرح جس طرح وہ انسانی جسم کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ بالکل ہمارا تعلق بھی شعاع، خواتین اور کرن سے ویسا ہی ہے۔ باقاعدہ خواتین اور شعاع شروع کیا 2000 یا 2001 میں جس کے سرورق پر ثمینہ پیرزادہ اور زیبا بختیار پھولوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ بڑے عرصے سے یہ خواہش رہی ہے کہ قارئین میں اپنا نام دیکھیں۔ سب سے پہلے تو اپنی پسندیدہ رائٹرز کے بارے میں بتاتی چلوں جن سے ہم بہت متاثر ہوئے ہم نے عمیرہ احمد کے فلسفے سے بہت کچھ سیکھا۔ نمرہ احمد کی روحانیت سے، فرحت اشتیاق کی محبت بھری وارفتگیوں سے تنزیلہ ریاض کے مذہبی موضوعات سے، ابھی یہ لوگ تو سر فہرست ہیں۔ نئی لیکن کچھ کچھ پرانی حسنہ حسین کی تعریف کے لیے تو الفاظ ہی نہیں مل رہے۔ دل کے تاروں کو چھیڑنے والا یہ ناول "عمر بیسرا" شاید نہیں یقیناً 2022 یا 2023 کی بیسٹ تخلیقات میں سے ایک ہے۔ آج کل کے دور میں جب میڈیا خاص کر سوشل میڈیا اتنی ترقی کر گیا ہے تو جناب پرنٹ میڈیا خاص طور پر آپ کے پرچوں نے جو مذہبی، معاشرتی اور خاص طور پر اخلاقی تربیت کی ہے۔ وہ ناقابل بیان ہے۔ نئی رائٹرز میں سمیعہ عمیر، مریم عزیز اور افسانوں کی دنیا میں قانتہ رابعہ، اور عمیرا شفیع خاص طور پر قابل ذکر ہیں آخر میں اپنا تعارف ضلع پاکپتن کے قصبہ (ہمارے لیے شہر) ملکہ ہانس سے تعلق رکھتی ہوں جو کہ تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے خصوصاً مسجد وارث شاہ کی وجہ سے جہاں انہوں نے اپنے تخیلاتی کردار "ہیر" کو تخلیق کیا۔

پیاری حورین! شعاع، خواتین اور کرن سے تعلق کے لیے آپ نے بڑی انوکھی تشبیہات استعمال کی ہیں۔ آج تک کسی قاری بہن نے پرچوں سے محبت کا اظہار ایسے الفاظ میں نہیں کیا۔ ہم آپ کی محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ شعاع کی محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب ہمیں خط لکھ کر شعاع کی کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے دیجیے گا۔

رضوانہ وقاص ...... کراں ہری پور سے شریک محفل ہیں

شعاع 7 تاریخ کو ملا۔ ایئرپورٹ سے واپسی پر میرے شوہر نے لے کر دیا۔ شکریہ جی۔ میرا بیٹا موذن کراچی سے واپس آیا۔ پھپھو بھی آئی ہیں ہماری بھی ان کو لینے گئی تھیں۔ "پہلی شعاع" پڑھی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں وہ تو ساری ہی پیاری ہوتی ہیں (سبحان اللہ) "خط آپ کے" ضرور پڑھتی ہوں۔ سب بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مہوش خولہ میری دادی بہت ہی اچھی تھیں۔ میرا بہت ہی خیال رکھتی تھیں۔ سونیا ربانی، یہ جو کلا بٹ کی طرف گاڑی مڑتی ہے۔ کے ساتھ تاخیاں لکھا ہوا میں نے پڑھا۔ آپ ادھر کی ہیں۔ آپ بتاتی ہی نہیں۔ پتا نہیں کیوں جی "نیا سال نئی کہانی" مزہ آ گیا جی۔ "عمر بیسرا" بہت ہی زبردست اینڈ ہوا جی۔ ریان اور زین کا ایک دوسرے کے ساتھ پیار کرنا خیال کرنا پسند آیا اور اچھا لگا۔ "ٹھنڈی چھاؤں" پڑھا۔ جتنا پڑھا تبصرہ کر دیا۔ کیونکہ میری امی، خالہ نانو کی بیماری پر گئی تھیں واپس آئی ہیں۔ تو سب لوگ ملنے اور پوچھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ امی میرا بیٹا بھی ساتھ لے گئی تھیں۔ موذن ایک سال 2 ماہ کا تھا۔ امی نے کہا: "میں جا رہی ہوں کہ پھر تم اسے کیسے سنبھالو گی۔" پیا میں نے کہا ہے لیکن امی بہت خیال رکھتی ہیں۔ یہ کراچی میں بیمار ہو گیا۔ بہت زیادہ۔ مجھے پہلے نہیں بتایا۔ اب آئی ہیں تب مجھے پتا چلا ہے۔ تب ہی موذن کو جہاز پر بھیجا اپنی پھپھو نائلہ کے ساتھ جو امی بھی گئی ہیں۔ سب دوستوں بہنوں سے دعا کی اپیل ہے۔ اللہ میرے بیٹے موذن کو صحت و تندرستی والی زندگی دے۔ میری اتنی عمر نہیں لیکن پتا نہیں مجھے کیسی بیماری لگی جو جان ہی نہیں چھوڑ رہی۔

پیاری رضوانہ! آپ کو اور آپ کے بیٹے کو اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے۔ چھوٹے بچے کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن آپ کی امی نے آپ کی پریشانی اور صحت کی وجہ سے بچے کو سنبھالا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ اور آپ کے بیٹے موذن کو سلامت رکھے۔ آمین
شعاع آپ کو پسند آیا۔ تہ دل سے شکریہ۔

نائلہ پیر ورسیالکوٹ سے لکھتی ہیں

میں بات کرنا چاہوں گی 2020 کی بہترین اسٹوری پر جو کہ "ہم اور بلبلیں" فرزانہ کھرل نے لکھی تھی۔ انتہائی خوب صورت الفاظ کا چناؤ تھا۔ کیا کوئی کسی کو اپنے دل میں اس طرح رکھ سکتا ہے؟ فرزانہ کھرل کی سب اسٹوریز ہی مزے کی ہوتی ہیں۔ وہ میرے کیسری پھول ہوں۔ یا وہ درختوں تک یا چھپا کے بھی کسی پہ کہانی لاجواب ہے۔ "ہم اور بلبلیں" کا کاسٹ ان کہانیوں سے منفرد تھا یہ ایک یاد رہ جانے والی کہانی ہے۔ میں پرچے منگواتی ریگولر ہوں۔ پیار ان سے اتنا ہی ہے لیکن ٹائم نہیں ملتا میں نے بتایا تھا ان میں بیمار تھی اور ڈیڑھ سال رہی تو ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی معروفیت ڈھونڈو تو میں نے کہا کہ پارلر کا کورس کرتی ہوں تو ابو نے وہ ہنگامہ کیا کہ اللہ دے اور بندہ لے پھر ہم نے خیال دل سے نکال دیا۔ سلائی کڑھائی سب آتی تھی لیکن اسے کرنے کے لیے ہمت چاہیے ہوتی ہے جو کہ میرے پاس نہیں تھی پھر میں ٹھیک نہیں ہوئی تو بھائی نے آن لائن کورس کروا دیا۔ یہ ایک رنگ کا کام تھا بڑے بھائی اور ابو نے خوب ڈانٹا لیکن اس نے نوٹس نہیں لیا مجھے کہا تھا بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ اللہ میرے بھائی کو ڈھیروں خوشیاں دے ہر موڑ پر کامیابیاں، حلال کے رزق سے مالا مال کرے، نیک بیوی اور نیک اولاد دے آمین ثم آمین اور اس نے ہی پیسے لگائے اور سامان لا کر دیا اب میں معروف ہوں جب پیسے آنے لگے تو ابو جی نے منع کرنا بھی چھوڑ دیا۔

تو اب آتے ہیں فروری کے شمارے کی طرف پہلی شعاع پڑھی تو دل دکھ سے بھر گیا۔ ہم ناشکرے اور ناقدرے ہیں۔ ہمیں ملک کی قدر نہیں ہوئی۔

صائمہ نور کا افسانہ اچھا لگا۔ ہم بچپن سے یہی دیکھتے آ رہے ہیں بڑائی مار کر تائی کھانا سیر ہو کر کھا بھی لیا جاتا ہے اور نقص بھی نکال دیے جاتے ہیں۔ ملیا سیون، کا افسانہ حقیقت پہ مبنی تھا۔ میرے خیال میں ایسے افسانے زیادہ شائع ہونے چاہئیں، سوتا شادی پتا نہیں ایسے بھائی کہاں ہوتے ہیں جو بہنوں سے اتنا پیار کرتے ہیں یہاں ایسا کچھ بھی نہیں، بیوی ہی سب کچھ ہے، روٹھ کر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملنے آ جائیں تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں کیوں آ گئیں۔ فائزہ بھٹی جی یہ ہماری قسمت ہے کہ ہمارا کام بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔ عمیرا شفیع آیا اگر آپ اپنی بھاوج پہ باجا رعب جماتیں تو آپ کی نند بھی آپ پہ چھا جاتی، عمر بیسرا، حسنہ حسین، زندہ باد جو سبق آپ ہمیں دے گئیں وہ ہم کبھی نہیں بھولیں گے مشکل سے کبھی نہیں گھبرائیں گے کہ مشکل کے ساتھ تو آسانی آتی ہے۔
شعاع کے ساتھ ناتا خط آپ کے سب بہتر تھا ویسے تو پورا

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

رسالہ ہی جاندار ہوتا ہے۔

پیاری مافیہ! بالکل صحیح لکھا آپ نے ہم نے واقعی آزادی اور اپنے وطن جیسی نعمت کی قدر نہیں کی اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔ ناشکری بہت بڑا گناہ ہے۔

ہما بھگوانے کی جلدی میں آپ پورا پرچہ پڑھ نہیں پائیں۔ لیکن جن کہانیوں پر تبصرہ کیا وہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ آپ کی بیماری کے متعلق جان کر تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آپ کے بھائی نے آپ کے متعلق درست علاج سوچا۔ بلاشبہ مصروفیت سو بیماریوں کا ایک علاج ہے۔

فریحہ اشتیاق..... نظام پور گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

دسمبر کے شمارے میں منال بٹ فرام گوجرانوالہ نے میرا تذکرہ کیا یا یوں کہہ لیں مجھے یاد کیا بڑی عجیب سی خوشی محسوس ہوئی کہ کسی نے مجھے یاد رکھا ہوا ہے۔ آپ نے آخر کار اسے چھاپ ہی دیا اور نہ صرف خط شائع کیا بلکہ ہمیں مصنفہ بھی کہہ ڈالا۔ جی ہاں..... وہ مصنفہ جس کے بہت سے افسانے اور ناولز آپ کی ردی والی باسکٹ میں پڑے ہوں گے۔ بات کرتی ہوں فروری کے شمارے کی۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ سب سے پہلے عمر ریسرا کو پڑھا۔ بالآخر کہانی اپنے اختتام کو پہنچی۔ تحریر خوب صورت تھی مگر بلاوجہ طوالت کا شکار بھی تھی۔ اور سب سے بیسٹ افسانہ ناظرہ بھٹی کا ہی ویلی تھا۔ ملیحہ سمیعون کا افسانہ بس نارمل تھا افسانے کا عنوان پیارا تھا مگر افسانہ نگار کا نام کچھ عجیب سا لگا۔ نہ زبان پر چڑھ رہا تھا نہ دماغ میں بیٹھ رہا تھا۔ صدف عمر کا ناولٹ "آپ اپنے دام میں" زبردست تھا باقی شمارہ ابھی پڑھا نہیں، ہر ماہ انتظار کرتی کہ شاید اس ماہ میری کوئی کاوش آپ کے شمارے میں موجود ہو مگر نہیں۔ ہر ماہ منہ کی کھانی پڑی ہے۔ اب پلیز مجھے بتا دیں کہ میری یہ تحریریں شائع ہوں گی یا نہیں۔

پیاری فریحہ! آپ کی کہانی آشیانے کا دکھ شامل ہو جائے گی۔ باقی کہانیاں قابل غور کی لسٹ میں ہیں شاعری کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسز مجاہد تتے جڑانوالہ سے شریک ہیں

میں آپ کی پرانی قاری ہوں، رکیں کہیں مجھے بوڑھی خاتون نہ سمجھ لیں۔ بوڑھی ہوں تو سہی لیکن شادی کے بعد حالات نے بوڑھا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گھریلو سیاست کا شکار ہوئی اور بہت زیادہ ہوئی ہوں ایسے میں تمام رسالوں نے میری آکسیجن کی طرح مدد کی۔ میرا سسرال رشتوں سے خالی ہے یعنی بہو میں اکلوتی ہوں۔ دو نندیں شادی شدہ ہیں۔ نہ دیور نہ جیٹھ، ساس ہیں تو مرضی ہوئی باتیں خوب کریں نہ مرضی ہوئی تو چپ کی انگلی ماری۔ ایسے میں دل لگانے کو یہی رسالے تو ہیں جو زندہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔

تین بچے ہیں جب وہ بھی اسکول روانہ ہو جاتے ہیں، گھر کے تمام کاموں سے فرصت کے بعد گھر کے اندر اتنا سناٹا ہوتا ہے کہ سوئی گرنے کی آواز بخوبی سنی جا سکتی ہے۔ فرصت کے ان لمحات میں دل بے ساختہ شعاع، خواتین کی طرف ہی ہمکتا ہے لیکن میرے گھر والوں کو میرا رسالے پڑھنا کسی جرم سے کم نہیں لگتا، کتنی دفعہ تو پڑھنے کی وجہ سے ہمارے گھر میں لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ گھر کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر بچوں کو سلا کر بھی پڑھوں تو بھی اعتراض، میں اپنی امی ابا زاد بہنوں اور بھابھی سے ڈائجسٹ منگواتی ہوں۔ دو چار مہینے تک ان کے بھیجے ہوئے ڈائجسٹ پڑھتی ہوں جیسے ہی کوئی میکے سے میرے پاس آتا ہے، کپڑوں وغیرہ میں چھپا کر لے آتا ہے یا جب چھ ماہ بعد میں خود میکے جاؤں تو لے کر آتی ہوں، بیگ کے سب سے نچلے حصے میں پوری ایک تہہ میرے پیارے رسالوں کی پھر اوپر کپڑوں کی ہوتی ہے۔

اور اچھی بات بتاؤں، میں کوثر خالد جڑانوالہ کے ہمسائے محلے میں رہتی ہوں، میری دلی خواہش ہے کہ میری کوثر جی سے بھی ملاقات ہو جائے۔ مجھے ان کے گھر کا پتا نہیں ہے البتہ ان کی گلیوں میں ہی میرے بچوں کا اسکول آفس ہے اگر کبھی جانا ہو تو دل ان گلیوں کو حسرت سے دیکھتا ہے کہ ادھر ہے ہماری کوثر جی کا گھر۔

تمام بہنیں میرے لیے دعا کریں کہ میں بھی اپنے معاملات میں خود مختار ہو جاؤں اور آخری بات یہ میری رسالوں کے لیے والہانہ محبت ہے۔ اپنے میکے یعنی "وار برٹن" جاؤں گی تو خط پوسٹ کرواؤں گی۔ آپ پڑھ لیں۔

پیاری آمنہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ہماری دیرینہ قارئین جب ہمیں یاد کرتی ہیں تو ہمیں بے اندازہ خوشی ہوتی ہے۔ جن حالات کا آپ شکار ہیں، ہماری بہت سی قارئین ان سے گزر رہی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں جب سوشل میڈیا نے تمام اخلاقی حدود پار کر لی ہیں۔ یہ بے ضرر سی کہانیاں جن میں بیشتر سبق آموز ہوتی ہیں۔ کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ روایت بن گئی ہے کہ بنا کسی تحقیق کے کچھ جانے بغیر کچھ بھی کہہ دیا جاتا اور اس کو اتنا پھیلایا جاتا ہے کہ لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کا رجحان تو جیسے ختم ہی ہو گیا ہے۔

کوثر خالد کے بارے میں ہمیں بھی تشویش ہے۔ کافی عرصہ سے انہوں نے رابطہ نہیں کیا۔ ہم نے کئی بار فون کیا مگر ان کا فون بند ہے۔

رمشا روشن اللہ یار سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے سائرہ رضا کے ڈرامہ سیریل "میرے ہمسفر" کی تعریف کروں گی کہ امی اور عائشہ کا سخت ترین آرڈر ہے۔ سائرہ آپی! آپ نے انٹرویو میں کہا تھا کہ "میں نے دادی کے مکالمے بڑی ... سے لکھے ہیں۔" آپ کی محنت ہمیں صاف نظر آئی دادی کے ... کردار میں۔ میں ارادہ کر کے سوئی تھی (ڈرامے کا اینڈ دیکھنے کے بعد) کہ سائرہ آپی کی تعریف کروں گی (مطلب آپ کے ڈرامے کی تعریف کرنا ہوتا) تو خواب میں آپ سے ملاقات ہو گئی۔ (صبح اٹھی تو سارا مزہ کرکرا ہو گیا..... ہاہاہا)

رسالہ 5 فروری کو آیا اور دروازے پر ہی بھائی سے اچک لیا۔ "خدا آپ کے" سلسلے کا انتظار، سلسلہ وار ناولز میں افسانے بھی بہت اچھے ہیں۔ رخسانہ قاسم اللہ آپ کو صحت و تندرستی سے نوازے (آمین)۔ ہماری شادی 18 مارچ کو ہے۔ آپ سب قارئین (جو مجھے بھولی نہیں) اور جو ہمیں بھول چکی ہیں، ان کے علاوہ تمام خاموش قارئین بھی ادارہ کا اسٹاف، رضیہ آپی، امتل آپی، رشدہ آپی سب انوائیٹڈ ہیں۔ وینیو بھی بتا دیتی ہوں "سلیم پیلس بینکوئیٹ ہال نزد کوٹ ہیراں والا کوٹھی" اب آ جانا ہے آپ سب نے۔ صدف ناصر، مہوش، خولہ، ذل ... بہنوں کے تبصرے شاندار تھے۔ ذل آپ کے سوال کا جواب آپ خود ہمیں دیکھ کر پا لیجیے گا۔ (شادی پر تو آئیں گی نا آپ؟) نجمہ ناصر، زینب نور انصاری سسٹرز کہاں لاپتا ہیں؟ پلیز انہیں کوئی ڈھونڈ لائے۔ خدیجہ اکرم، ثمینہ اکرم، کوثر خالد آپ کی طرف سے مبارک باد کا انتظار رہے گا۔

اب آپ کو اپنی الجھنیں بتاؤں (سلجھا دیجیے گا پلیز) سب سے پہلے انا الالم قلم ظلم (زیورات اور بھاری بھرکم لہنگا) پہن کر خاموش کیسے رہتی ہیں دلہنیں؟ میری کزن تو چوتھی میں سے بچپن گھنٹے چلتی ہے اور دانت بھی باہر ہی نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ دوسرا امی لوگ جو اتنا سارا جہیز دے رہی ہیں وہ سیٹ کیسے کروں گی؟ (نرا عذاب) تیسرا مجھے اپنا نام رمشا روشن بہت پسند ہے۔ (روشن کی وجہ سے) اب ضروری ہے کہ شادی کے بعد لڑکی شوہر کا نام ساتھ لگائے (مجھے اپنے ابو کا نام بڑا پسند ہے اس کی جگہ شوہر کا نام نہ لگاؤں تو کوئی قباحت تو نہیں ہے) ضرور بتایئے گا۔ امی اور عائشہ تو مجھے سیریس ہی نہیں لیتیں۔

نج: پیاری رمشا! زندگی کے اس خوش گوار موڑ پر ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں اور نعمتوں سے نوازے۔ شادی میں شرکت تو نہیں کر سکتے لیکن شادی کا احوال آپ نے ضرور لکھنا ہے۔ اگر تصاویر کے ساتھ تا کہ ہم اور ہماری قارئین شادی میں شرکت کر سکیں۔

اگر اپنی تصویر نہ چھپوانا چاہیں تو والد اور دولہا صاحب کی تصویریں بھجوا دیجیے گا۔

اب آپ کی الجھنوں کا حل

انا الالم قلم ظلم پہن کر بولنے کی سکت ہی کہاں رہ جاتی ہے۔ اس لیے دلہنیں خاموش رہتی ہیں، اس لیے آپ اپنی کزن کی بالکل فکر نہ کریں جہاں تک جہیز سیٹ کرنے کی بات ہے جہیز کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک عدد دولہا بھی فراہم کر رہی ہیں، وہ کس دن کام آئے گا۔

نام نہیں بدلنا چاہتی تو آپ کی مرضی ہے۔ بہت سی لڑکیاں شادی کے بعد نام نہیں بدلتیں۔ لیکن شوہر کی خواہش ہو تو اسے انا کا مسئلہ نہ بنایئے گا۔

سائرہ رضا تک آپ کی تعریف پہنچا دی ہے۔

☆☆

PKDAILYINFO.COM
Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

ناہید اسماعیل — کراچی
ذرا سی بات پر جن سے بگڑ لیتے ہو تم
سنو ایسا نہیں کرتے زمانہ چھوڑ جاتا ہے

لبنیٰ بٹ — اسپیشل ٹاؤن
محبت کرنے والوں کی تجارت بھی انوکھی ہے
منافع چھوڑ دیتے ہیں خسارے بانٹ لیتے ہیں

تسنیم کوثر — کراچی
وہ جو ستارۂ جاں ہوا کرتا تھا
دل سے اتر گیا کل شب

فرح مال — نرسری
بہت نزدیک آتے جا رہے ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا؟

ثوبیہ قطب — گکھڑ منڈی
اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
میں نے قدم اس کو نکلنے نہیں دیا

ناجیہ سہیل — کراچی
تجھے تو ملے اسے اللہ کوئی مہلت ہو
ترا اس نظر کا سوال ہے تیرے شہر میں

رضوانہ وقاص — کلاچور
آنکھ پہ ہیں یا سیری پلکوں پہ ہیں
ستارے کہیں جھلملاتے تو ہیں
دل مضطرب ہے بھی کچھ کم نہیں
ترے پاس یادوں کے سائے تو ہیں

زرتاب خان — کراچی
ابھی ہے ان کو نہیں مجھ سے بچھڑنے کی جلدی ہے
کبھی ملنا تمہارے ملنے کا حل نکالیں گے

سحر احمد
جہاں ہو پیار غلط فہمیاں بھی ہوتی ہیں
سو بات بات پہ یوں دل برا نہیں کرتے

حمزہ ثاقب — گرین سٹی
ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

اقرا انس — کراچی
کیوں میں امید کا دامن چھوڑ دوں
معجزے مشکلوں میں ہوتے ہیں

طوبیٰ اظہر — فیصل آباد
مجھے نہ کوئی سرسری سا تذکرہ سمجھے
میں پورا ماجرا ہوں حوالہ نہیں ہوں میں

ام کمال — فیصل آباد
کوئی ساتھی نہ ملا راہِ وفا میں مجھ کو
واسطہ کانٹوں سے میں نے پڑا مشکل تنہا
ہر طرف شور ہے طوفان کی آمد ہے مگر
مجھ کو وہ چھوڑ چلا ہے لبِ ساحل تنہا

قرۃ العین — سرگودھا
طلب عشق مٹا دی ہم نے
اس کو درد کا نہ صلہ دی ہم نے
خواب لوگوں نے جلا ڈالے تھے
راکھ راہوں میں اڑا دی ہم نے

آمنہ ظہیر — لاہور
یہ جدائیوں کے رستے بڑی دور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا میری بات مان جاؤ

خنساء احمد — کراچی
پہلے شکوہ تھا جہاں رونق بازار نہیں
اب جو بازار سجے ہیں تو خریدار نہیں
سب کے ہاتھوں میں ہے سامان برائے گھر
کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار نہیں

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

ماہنامہ شعاع — خواتین ڈائجسٹ
عمران ڈائجسٹ — ماہنامہ کرن

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.
PKDAILYINFO.COM

آپ جانیں

واصفہ سہیل

احساس

عمران خان کی سابقہ اہلیہ جمائما گولڈ اسمتھ کا کہنا ہے کہ فلموں میں ہمیشہ ہی پاکستانیوں کو دہشت گرد خودکش بمبار کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔

ایک برطانوی نشریاتی ادارے سے گفتگو میں پروڈیوسر اور اسکرین رائٹر جمائما نے اپنی فلم "واٹس لوگاٹ ٹو ڈو وداٹ" کے بارے میں بات چیت کی اور بتایا کہ یہ فلم ان کی اپنی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ جمائما کے مطابق آنے والی فلم میں اسلاموفوبیا جیسے مسئلے کو چیلنج کیا گیا ہے، جمائما کے مطابق فلموں میں مسلمانوں کی مثبت تصویر بہت کم دکھائی جاتی ہے۔ پاکستانیوں کو ہمیشہ دہشت گرد یا خودکش بمبار کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جمائما گولڈ اسمتھ نے اپنے بچوں کے ساتھ سفر کے تجربے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "میں جب بیٹوں کے ساتھ کسی دوسرے ملک خاص طور پر امریکہ جاتی ہوں تو انہیں پاکستانی ناموں کی وجہ سے غیر معقول پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے برعکس مجھ سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اسلاموفوبیا، نسل پرستی جتنا بڑا اور ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اپنی بیکی ڈیانا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شہزادہ چارلس اور ڈیانا کی شادی ارینج میرج تھی، انہوں نے کہا کہ فلم بنانے کا ایک سبب ڈیانا بھی تھیں۔

وجہ

پاکستان اپنی تاریخ کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے۔ مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ رکھی ہے تو گیس بجلی کا نہ آنا بھی بہت تکلیف دہ ہے کم بجلی اور زیادہ بل نے عوام کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس سے عام عوام کے ساتھ ساتھ فنکار برادری بھی پریشان ہے لیکن اشنا شاہ کی پریشانی اس سب سے الگ ہے۔

اداکارہ اشنا شاہ نے ایک ٹوئٹ کی ہے جس میں انہوں نے لکھا کہ "میں اپنے ملک سے محبت کرتی ہوں، اپنی شناخت سے پیار کرتی ہوں، اپنے ہم وطن پاکستانیوں سے محبت کرتی ہوں لیکن جب یہاں بیک وقت گیس اور بجلی نہ ہو، پیٹرول کی قلت ہو اور یوپی ایس زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے بیٹھ رہا ہو، گھر میں تو انائی کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور مجھے کافی پینے کی ضرورت ہو ایسے میں گزارہ کافی تھوڑا مشکل ہے۔ (ویسے قوموں پہ اس سے برے وقت بھی آئے ہیں آپ ایک کافی کے کپ پہ ہار گئیں)۔

ان کی اس ٹوئٹ پر کچھ لوگوں نے کہا کہ مشکل وقت میں ہی ملک کو ہماری ضرورت ہوتی ہے (یہ مشکل وقت آیا نہیں لایا گیا ہے) کچھ نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے انہیں اپنے مسائل بتائے اور کہا آپ کا مسئلہ تو صرف کافی پینا ہے۔

موٹاپا

شامین خان کو شوبز میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا

ہے عموماً وہ چھوٹے موٹے کردار کرتی نظر آتی ہیں لیکن کچھ عرصہ قبل ـــــ ایک ٹی وی سیریز میں انہوں نے ایک موٹی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا جو کسی چلائی ہے۔

شامین خان کے مطابق انہیں جب یہ کردار کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے ہامی بھر لی۔ کیونکہ وہ روایتی کرداروں سے مختلف کرنا چاہتی تھیں۔ اس ڈرامے میں شامین کو فربہ نظر آنے کے لیے اندر کے اوپر باڈی سوٹ اور پھر کردار کے مطابق کپڑے پہنتے تھے۔ اس میں انہیں کافی مشکلات پیش آئیں۔

شامین خان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے ڈرامے بنانے سے معاشرے میں پیغام جائے گا لوگوں کی سوچ میں تبدیلی آئے گی (اس لفظ سے تو اب ڈر ہی لگتا ہے) کسی کا مذاق اڑانا تو بہت آسان ہے مگر ایسے افراد روز کسی جدوجہد سے گزرتے ہیں اس کا احساس کسی کو نہیں ہوتا (ویسے شامین موٹاپا ایسے ہی نہیں آجاتا بہت زیادہ آرام طلبی اور خوش خوراکی بہت بڑی وجہ ہے۔)

فرق

سویرا ندیم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں آج کل آپ کو ڈرامہ سیریل وہم میں دیکھ رہے ہیں۔

سویرا ندیم نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ "اداکار کو ہر عمر کے کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے دیکھنے والوں کے دماغ میں اگر کوئی کریکٹر بیٹھ جاتا ہے تو وہ آپ کو اسی طرح سے دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر یہ رکاوٹیں ہٹانی پڑتی ہیں۔ (کون سی رکاوٹیں؟ کچھ واضح نہیں ہوا)

سویرا کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں ماضی کے مقابلے میں آئیڈیاز کی کمی ہے وقت کے ساتھ ساتھ ڈراموں میں فرق آیا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ماضی میں آئیڈیاز کی ورائٹی تھی، چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ بڑے بڑے ایشوز پر بھی بات کر لیتے تھے۔ (باتیں تو اب بھی بڑی بڑی کر لی جاتی ہیں۔)

اب تو ایسا لگتا ہے کہ سب ایک ہی ڈگر پر چلنا چاہتے ہیں۔ کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔ (تبدیلی کے نام سے ڈر جو لگتا ہے۔ کبھی انقلاب ہوتے کا)

اعتراض

خلیل الرحمان قمر جب کوئی بیان دیتے ہیں اس پر "کچھ" لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

جیسا کہ کچھ دنوں پہلے خلیل الرحمان نے بتایا کہ "انہوں نے اپنی بیگم کو طلاق یافتہ خواتین کے ساتھ دوستی رکھنے سے منع کر رکھا تھا۔ (پائیں کیوں بھئی) اس لیے نہیں کہ وہ غلط عورتیں تھیں بلکہ وہ میری بیوی کا بسا ہوا گھر دیکھ کر پریشان ہو سکتی تھیں (آہم!)

میری بیوی اس وقت کم عمر تھی، اس لیے میں نے اسے مشورہ دیا کہ جب وہ باشعور ہو جائے تو پھر وہ دوستی رکھ سکتی ہے (کیا شعور کا تعلق عمر سے ہے؟ معصومانہ سوال ہے بھئی)

"ویسے خلیل الرحمان قمر کا کہنا ہے کہ میرے اس بیان پر لوگ اعتراض کریں گے لیکن میں ان کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔"

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

بار بی کیو رائس

ضروری اشیاء

چاول	آدھا کلو
چکن	آدھا کلو
پپیتا	ایک کھانے کا چمچ
چکن تکہ مسالا	ڈیڑھ کھانے کا چمچ
ادرک	ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
بیسن	ایک کھانے کا چمچ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
چکن یخنی	ایک کلو
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	ایک عدد
ہری مرچ	دس عدد
لیموں	ایک عدد
دہی	آدھا کپ
تیل	ایک کپ

ترکیب:

بغیر ہڈی کا چکن بوٹی میں پپیتا، چکن تکہ مسالا، ادرک لہسن پسا ہوا، لال مرچ، نمک، بیسن، لیموں، زردے کا رنگ، چار کھانے کے چمچ تیل ڈال کر تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ سیخوں میں بوٹی لگا کر کوئلوں پر پکائیں۔ جب بوٹی گل جائے اور خوب بھنی ہوئی ہو جائے تو اتار لیں، اس طرح تمام بوٹی تیار کر لیں۔ اگر سیخوں کی سہولت نہ ہو تو پتیلی میں بنا کر کوئلہ کا دھواں دے لیں۔

چاول آدھے گھنٹے کے لیے دھو کر بھگو دیں۔ تیل گرم کر کے ایک پیاز سنہری کر کے اس میں سفید زیرہ اور ہری مرچ ڈال کر فرائی کریں۔ دہی ڈال کر ہلکا سا بھونیں، نمک اور چکن یخنی ڈال کر ایک ابال لے آئیں۔ اس کے بعد اس میں چاول ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں جب پانی خشک ہو جائے تو آنچ دھیمی کر دیں۔ زردے کا رنگ پانی میں گھول کر ڈال دیں۔ چاول، چکن بوٹی، لیموں اور پیاز کے سلائس، ٹماٹر ڈال کر اور گرم کوئلہ روٹی کے ٹکڑے پر رکھ دیں اور ڈھکن اچھی طرح بند کر دیں۔ دس منٹ کے لیے دم دے دیں بار بی کیو رائس تیار ہیں۔ یخنی چکن کی ہڈیوں کی تیار کریں۔

کشمیری کباب

اجزاء

بیف قیمہ	ایک کلو
نمک	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
زیرہ	ایک چائے کا چمچ
انڈا	ایک عدد
پیاز	دو عدد
دہی	ایک کلو
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
چھوٹی الائچی	ایک عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
لونگ	چار عدد
تیل	چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

ایک پیالے میں بیف کا قیمہ، نمک، لال مرچ، انڈا اور زیرہ ڈال کر ملا لیں۔ اس کے کباب بنا لیں کڑاہی فرائی پین میں تیل ڈال کر دہی، نمک، لال مرچ، ہلدی، چھوٹی الائچی، دار چینی اور لونگ ڈال لیں اور مسالا تیار کر لیں۔ اس میں کباب ڈال کر دم پر رکھ دیں دس منٹ بعد کھانے کے لیے پیش کریں۔

ڈرائی ہاٹ اینڈ ساور چکن

ضروری اشیاء:

چکن	آدھا کلو
چلی ساس	چوتھائی کپ
براؤن شوگر	تین کھانے کے چمچ
انڈا	ایک عدد
سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچ

ایپل ڈپ کے اجزاء:

سیب	دو عدد
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچ
گاجر	چوتھائی کپ
ہری پیاز	چوتھائی کپ
شملہ مرچ	چوتھائی کپ

ترکیب:

پیالے میں چکن، لال مرچ، نمک، پسی سیاہ مرچ، براؤن شوگر، انڈا اور چلی ساس ڈال کر مکس کر لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے چکن ڈال کر فرائی کریں۔ پانچ منٹ درمیانی آنچ پر پکائیں، وقفے وقفے سے چمچ چلاتے رہیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کے ایپل ڈپ کے ساتھ سرو کریں۔ گرائنڈر میں سیب، سفید مرچ، ہری پیاز، گاجر اور شملہ مرچ کو آدھا کپ پانی کے ساتھ پیس لیں۔ سرونگ باؤل میں نکال کر گاجر، ہری پیاز اور شملہ مرچ سے گارنش کر کے سرو کریں۔

ہری مرچ قیمہ

ضروری اشیاء:

قیمہ	آدھا کلو
ہری مرچیں	دس عدد
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچ
دہی	آدھا کپ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچ
ادرک	ایک چائے کا چمچ
لہسن	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

تیل گرم کر کے قیمہ ڈال کر بھونیں کریں، پانی خشک ہو جائے تو ادرک لہسن، نمک، گرم مسالا، پسی سفید مرچ اور دہی ڈال دیں، اچھی طرح مکس کر کے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو قیمہ بھون لیں۔ تیل الگ ہونے لگے تو ہری مرچیں شامل کر کے پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ہرے دھنیے سے گارنش کر کے پیش کریں۔

رس ملائی

اجزاء:

دودھ	ایک کلو
خشک دودھ	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
انڈا	ایک عدد
چینی	ایک کپ
الائچی	پانچ عدد
بادام پستے	حسب ضرورت
گھی	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: دودھ میں چینی الائچی، اور بادام ڈال کر ابال لیں، خشک دودھ میں بیکنگ پاؤڈر، انڈا اور گھی (گھی اگر جما ہوا ہے تو بہت اچھا ہے) ملا کر گوندھ لیں ہاتھ چکنے کر کے چھوٹی چھوٹی ٹکیہ بنا لیں۔ دودھ میں جوش آ جائے تو درمیانی آنچ کر کے ساری ٹکیاں ڈال دیں چمچ چلاتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ پھول جائیں اور دودھ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

☆☆

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

سمل کو آپ کی انچارج آرٹسٹ سے ملنے کا شوق ہے کیونکہ اسے اسکیچنگ کا شوق ہے۔ تو میں نے کہا تھا کہ جب بھی کراچی گئے، ہم ضرور جائیں گے۔ تو جناب میرے بھتیجے کی شادی پہ ہم 18 جنوری سے کراچی میں موجود ہیں۔ بس آج کا دن اور 25 جنوری کو ہم نے واپس گوجرانوالہ جانا ہے۔

کہاں تھی میں؟ ہاں آنے کی بات کر رہی تھی کہ ہم آئے ہیں تو آپ سے مل کے ہی جانا ہے۔ یہ بات جب میں نے اپنے شوہر کو بتائی تو کہتے لے چلوں گا۔ خط ان کے پہنچانے پر جتے تھے کہ یہ کیا بات ہوئی۔

2013ء سے ڈائجسٹ برابر گھر لے کے آتے ہیں۔ اور ہر مہینے لا کر کہتے ہیں تمہارے لیے خوش خبری ہے پھر ہاتھ میں ڈائجسٹ پکڑا دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں میں دو دن میں ڈائجسٹ ختم کر کے اُداس ہو جاتی ہوں کہ اب کیا کروں ختم ہو گیا ہے۔ میں ان کی بھی شکر گزار ہوں کہ ساتھ دیتے ہیں۔

جس دن میں نے بچوں کی کچھ اسٹیشنری لینے کے لیے ان کے ساتھ جانا تھا 2012ء کا End تھا اکتوبر کی بات ہے اسٹیشنری لیتے میری نظر ڈائجسٹ کے ڈھیر پہ پڑی جو باہر والی سائیڈ پہ کاؤنٹر پہ لگے تھے۔ میری اتنی زور سے چیخ نکلی کہ وہ دکاندار چونک گیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ لے سکتے ہیں۔ اس نے کہا ہاں جی 50 کے لے جاسکتے ہیں 25 کا واپس۔ بس پھر میری تو عید ہو گئی۔ 95 سے جو جو یاد تھیں کہانیاں دیکھیں لیکن ملیں نہیں۔ پھر جو ہاتھ لگا وہ لے لیے اور اگلے چکر میں واپس کر آئی۔ اب وہ دکان ان کے آفس کے رستے میں ہوتی تھی تو بجھیں ان کی ڈیوٹی لگ گئی کہ میری کہانی ادھوری ہے اگلی قسط کے مہینے والا ڈائجسٹ اس ڈھیر میں سے ڈھونڈ کے لائیں۔ کتنے پانچ ڈائجسٹ دس دن میں ختم کر لیتی ہوں۔ میں ایسا کرتا ہوں مہینے کا لگوا دیتا ہوں تاکہ مجھے اگلی قسط ڈھونڈنے نہ جانا پڑے۔

پھر 2013ء سے اس ماہ جنوری 2023ء تک کے تمام ڈائجسٹ میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس مہینے کا پڑھا نہیں ہے لے کر گھر رکھ آئے ہیں۔

2013ء کے پہلے ڈائجسٹ کے بعد میں نے ایک خط لکھا وہ ساتھ لانا بھول گئی۔ میں نے لکھا لیکن پوسٹ نہیں کیا کہ ملے گا نہیں۔ میرا پڑھنے کے شوق کا میرے بچوں کو بہت چھوٹی عمر میں پتا چل گیا تھا۔ گلی میں اپنے دادا کے ساتھ نکلتے تو واپسی پر کوئی کاغذ ہاتھ میں ہوتا تو لا کر کہتے "یہ پڑھ لو ماما جانی"۔ گلی میں کچرا پھینکنے سے منع کرتی تھی تو گلی سے کاغذ اٹھا لاتے تھے کہ کسی نے پھینکا ہوا تھا۔

میں خود گوجرانوالہ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ میں ڈینگی ڈپارٹمنٹ میں سینٹرل پٹرول ہوں۔ 2014ء سے ہمارا فیلڈ ورک ہے۔ بہت خوشی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ کیونکہ مجھے بے ایمانی پسند نہیں۔

ہر کہانی میرے دل کے قریب ہوتی ہے۔ چاہے وہ مصحف ہو جنت کے پتے، ماہ تمام، نمل، اب کر میری رفوگری، سفال گر، بت شکن، جو بچے ہیں سنگ، اور مالا میں جو ور جہاں پہ جادو کی بات ہوئی تو میری ماں بھی جوان سے بیمار تھیں۔ کہا کیا کوئی دشمن ہے لیکن تین ماہ تک اتنی تکلیف برداشت کر کے وہ مجھے چھوڑ گئیں۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی تھی کہ کوئی خدا کے آگے کچھ کر سکتا ہے۔ اس لیے مجھے جلدی ہوتی ہے کہ یہ سب کہاں ختم ہوگا۔ (لائٹ پھر چلی گئی اور پھر سے موبائل کی ٹارچ میں لکھ رہی ہوں ہاتھ بھی تھک گیا ہے۔) اور فیڈ کا تو پوچھیں مت) ساڑھے سات ہو گئے۔

یہاں کراچی میں ہم شادی میں آئے بیٹی کے ماں باپ نے اپنی ہمت سے بڑھ کے کیا ہے روزانہ کوئی فنکشن ہے۔ کھانا، میرج ہال کا خرچا لیکن پھر بھی ادھر سے بھی لڑکی کے گھر سے بھی رشتے داروں نے بے چارے ماں باپ کو رلا دیا ہے۔ رخصتی پہ جو ہوا میری بیٹی کہتی "ماما یہ تو جو سوال ڈائجسٹ میں ہوتا کہ شادی میں کوئی لڑائی وغیرہ تو یہ تو وہی ہوا۔

☆☆

امت الصبور

ماضی کے جھروکے

اہل سندھ کو محمد بن قاسم سے محبت کیوں ہے؟

تنقید کرنے والوں کو تاریخی حقائق کی روشنی میں علمی جواب

سندھ کی سرزمین اسلام کی آمد کے وقت ہندوراج کے ماتحت تھی۔ یہاں راجہ داہر حکمران تھا۔ راجہ داہر سے پہلے چندر حکمران تھا اور اس سے پہلے چچ کی حکمرانی تھی۔ تاریخ میں انہی تین ہندو حکمرانوں کو سندھ میں حکمرانی کا موقع ملا۔ ان کی حکمرانی محض ساٹھ سال کے عرصے پر محیط ہے۔ ان ساٹھ سالوں سے پہلے اور بعد میں کوئی بھی ہندو حکمران سندھ پر حکمرانی نہیں کر سکا۔

ہندو حکمرانی کے ان ساٹھ سالوں سے پہلے یہاں کون حکمران تھا؟ ان ساٹھ سالوں سے قبل یہاں بدھ مذہب کی حکومت تھی اور بدھ مذہب کا آخری حکمران راجہ رائے سہاسی تھا۔ سندھ کے لوگ اس کی حکمرانی میں خوش تھے۔ ایک دن اس کے دربار میں ایک کشمیری النسل نوجوان نے آ کر اثر و رسوخ پیدا کرنا شروع کیا اس کا نام چچ تھا۔ وہ نہ صرف بہت عیار تھا بلکہ خوبرو بھی تھا۔ ساتھ ہی اس کو زیر زمین سازشیں کرنے کا فن بھی آتا تھا۔

چچ نے جب دیکھا کہ سندھ میں راجہ رائے سہاسی کی حکومت ہے تو اس نے اس حکومت پر قابض ہونے کے لیے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔ اس مقصد کے لیے چچ نے راجہ رائے کی بیوی سوہن دیوی سے تعلقات قائم کر لیے۔ یہ تعلقات اس حد تک بڑھے کہ اندرون خانہ یہ سازش بنائی گئی کہ سوہن دیوی راجہ سہاسی کو زہر دے گی اور راجہ کی موت کے بعد وہ خود تخت پر بیٹھے گی۔ اس طرح یہ حکمرانی عملاً چچ کے پاس آ جائے گی۔ سازش پر عمل ہوا اور راجہ کو زہر دے دیا گیا۔ اس کی موت کے بعد سوہن دیوی حکمران بن گئی۔ بعدازاں اس نے چچ کو حکمرانی منتقل کر دی۔ یہ صرف اقتدار کی منتقلی نہیں تھی بلکہ سندھ میں بڑی تہذیبوں کی ایک تبدیلی تھی۔ بدھ مذہب یعنی گوتم بدھ کا مذہب دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دنیا میں امن کا خواہاں ہے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات میں ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دو۔" گوتم بدھ کی تعلیمات میں مزاحمت کی بات موجود نہیں تھی۔ اس لیے بدھ مت کے پیروکاروں نے ہندو حکمران اور اس کی پالیسیوں خصوصاً سندھ میں ہندو دھرم کے نفاذ کی مزاحمت نہیں کی۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ رائے سہاسی سے چچ کو اقتدار کی منتقلی کے بعد ہندو حکمرانوں کی بدھ مت رعایا کے ساتھ کشمکش شروع ہو گئی۔ جس کے بعد ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے زیر دست چلے گئے۔ کشمیر النسل چچ اصل میں برہمن تھا۔ اور اس نے حکمران بننے کے بعد یہاں ہندو مذہب کی اجارہ داری قائم کر دی۔ بلکہ اس دور میں تو یہ روایت بھی تھی کہ حکمران اپنی رعیت پر اپنا مذہب بزور قوت مسلط کر دیا کرتا تھا۔

ہندو حکمرانی میں سندھ کے لوگوں کے ساتھ مظالم

چچ نے بھی سندھ کے لوگوں پر اپنا مذہب مسلط کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سندھ کے لوگ جو بہت امن و امان اور رواداری کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے ان پر ایک برہمن حکومت قائم ہو گئی اور اس نے انسانوں میں ذاتوں کی تفریق کا منصوبہ پیش کر

PKDAILYINFO.COM

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

دیا۔ برہمن نے یہ کہا کہ ہم سب سے اعلیٰ ذات ہیں، باقی ذاتیں ہم سے نیچے اور پست تر ہیں۔ ذات پات کے طبقاتی نظام میں سب کو پتا ہے کہ برہمن کے بعد کھتری آتا ہے اور سب سے نچلی ذات شودر ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب کے ماننے والوں کو ریاستی زور و جبر کے تحت ہوتے ہی شودر بنا دیا گیا۔ ہندومت میں شودروں کی کیا حیثیت ہوتی ہے وہ ایک عیاں حقیقت ہے۔ تیسری صدی کے نامور عرب مورخ بلاذری کی کتابوں کے علاوہ سندھ کے نامور ادیب سردار علی شاہ صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ ہندو حکمرانی کے زیر اثر رہنے والے سندھ کے باسیوں کے ناگفتہ بہ حالات بیان کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ اس دور میں برہمنوں نے شودروں کے لیے جو احکامات جاری کیے وہ سندھ کی تمام عوام پر مسلط کر دیے گئے۔ وہ احکامات کیا تھے ذرا ان پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

اسلام سے قبل کے زمانے میں سندھ کے اندر ٹوپی یا عمامہ جسے پٹکا (پگڑی) بھی کہا جاتا ہے، کے پہننے کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ پہننے والا خود کو معتبر سمجھتا ہے۔ اس دور میں عوام کو ٹوپی پہن کر چلنے سے منع کر دیا گیا۔ حکم جاری ہو گیا کہ کوئی ٹوپی پہن کر باہر نہیں نکل سکتا۔

ایک اور بات یہ ہوئی کہ شودر، جس کو کم ذات اور کمزنسل جانا جاتا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ جب بھی گھر سے نکلے ایک کتے کو ساتھ لے کر نکلے تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ وہ ایک شودر ہے اور اس کی حیثیت اس کتے کے برابر ہے۔

تیسری بات یہ تھی کہ جو عبادت گاہیں ہندو مذہب نے قائم کی تھیں ان میں شودروں کا جانا ممنوع تھا۔ اگر کوئی شودر اتفاق سے ان مندروں میں چلا جاتا تو ان مندروں کو پاک کیا جاتا تھا۔

ایسے حالات میں جب کہ سندھ کے باسی پرامن اور باعزت زندگی گزار رہے تھے ان کو ایک بالکل مختلف زندگی کی طرف موڑ دیا گیا جہاں ان کو بتایا گیا کہ تمہیں فلاں فلاں احکامات پر عمل کرنا ہے کیوں کہ تم کمتر اور حقیر ہو۔ اس حکمرانی نے بڑے منفی نتائج پیدا کیے۔ سندھ کے لوگ اس برہمن حکومت اور اس ذات پات کے نظام اور ان بادشاہوں کی عیاشیوں کے خلاف بڑی شدید نفرت رکھتے تھے۔

چچ چونکہ ایک عیار اور شاطر حکمران تھا لہٰذا اس نے بڑے منظم انداز سے بدھ مت کے ماننے والوں کو ہندو مذہب میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح اس نے اپنی حکومت کا بڑا دور گزارا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی چندر سندھ کا حکمران بنا۔ چندر اپنے پیشرو چچ سے قدرے نرم خو اور نرم مزاج تھا۔ اس کا دور سندھ کے باسیوں کے لیے کسی حد تک عافیت کا دور تھا۔ لیکن یہ دور زیادہ دیر تک نہیں چلا کیوں کہ کچھ عرصے کے بعد ہی چندر کی موت واقع ہو گئی۔ اور چچ کا بیٹا راجہ داہر سندھ کا حکمران بن گیا۔

راجہ داہر اپنے باپ چچ کے نقش قدم پر چلا اور اس نے اپنے باپ والا طرز حکمرانی ہی اپنایا۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس میں وہ اپنے باپ سے بھی بڑھ کر تھا اور وہ تھی اس کی عیاشی۔ جب محمد بن قاسم کے ساتھ اس کا آخری معرکہ ہوا تو وہ ہاتھی کی پالکی میں سوار تھا اور پالکی میں اس کے ساتھ اس کی کنیزیں بھی موجود تھیں جو حالت جنگ میں بھی پان بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالتی جا رہی تھیں۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جب جنگ کے دوران عیاشی کا یہ عالم تھا تو عام حالات میں کیا ہوگا۔

سندھ میں چچ گھرانے کی ہندو حکمرانی ساٹھ سال تک چلی۔ اس دور کا اختتام اس طرح ہوا کہ سراندیپ سے مسلمانوں کا ایک بحری قافلہ نکلا۔ اس قافلے میں سراندیپ کے حکمران نے مسلمان خلیفہ ولید بن عبدالملک کے لیے تحفے کے طور پر کچھ سامان بھیجا۔ سراندیپ میں کچھ مسلمان عرب خاندان بھی رہا کرتے تھے۔ وہ بھی عورتوں اور بچوں سمیت قافلے کے ساتھ شریک تھے۔ جب یہ قافلہ سندھ کی بندرگاہ سے گزرا تو یہاں کے بحری قزاقوں نے اس قافلے کو لوٹ لیا اور لوگوں کو اپنا قیدی بنا لیا۔ اس واردات سے سندھ کی ہندو حکومت کی اسلامی حکومت کے ساتھ

براہ راست ایک ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اس دور میں حجاج بن یوسف خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک کے بہت قریب تھا۔ حجاج بن یوسف کا جبر اور ظلم ایک تاریخی حقیقت ہے مگر ایک طرف اس دور کے حکمران اپنی حکومت کے دوام کے لیے ہر ظلم اور جبر کو عوام پر روا رکھتے تھے اور قتل و غارت کرتے تھے اور ساتھ ہی ان میں اپنے زیر تسلط علاقوں کو توسیع دینے کی خواہش بھی ہوتی تھی۔ تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بنو امیہ نے عوام پر بہت ظلم کیا جس میں کربلا کے واقعات، مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات کی بے حرمتی شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ولید بن عبدالملک کے دور میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی فتوحات بھی جاری تھیں۔ اسی دور میں حجاج بن یوسف نے قافلے کے قیدیوں کے خطوط کے نتیجے میں سندھ کو فتح کرنے کا ارادہ بھی کیا اور ولید بن عبدالملک سے اس کی اجازت مانگی۔ ولید نے یہ اجازت دے دی۔ جس کے بعد پہلا لشکر سندھ پر حملہ آور ہوا۔ لیکن یہ لشکر سندھ کی فوج سے شکست کھا گیا۔ اس کے بعد دوسرا لشکر بھیجا گیا اور وہ بھی ناکامی کا شکار ہوا۔

ان حالات میں حجاج بن یوسف نے سندھ کے لیے محمد بن قاسم کا نام چنا۔ وہ ایک سترہ سال کا نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ صرف ساڑھے سات ہزار کا لشکر تھا۔

سندھ کے لوگ محمد بن قاسم کے گرویدہ ہو گئے

محمد بن قاسم نے اس اہم کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی اور محض ساڑھے سات ہزار کا لشکر لے کر ایک پوری ریاست کے ساتھ ٹکرانے کے لیے سندھ کی بندرگاہ دیبل پر آ گیا۔ لشکر انداز ہونے کے بعد اس نے دیبل پر موجود قلعے کا محاصرہ کیا۔

اور یہ بیان کیا گیا کہ سندھ کے لوگ راجہ داہر کے طرز حکمرانی سے تنگ تھے۔ لہٰذا انہی لوگوں نے آگے بڑھ کر محمد بن قاسم سے بات کی اور بتایا کہ قلعے میں موجود سپاہ کا عقیدہ ہے کہ جب تک قلعے پر لہراتا ہوا جھنڈا سلامت ہے کوئی بھی قلعے کو فتح نہیں کر سکتا۔ محمد بن قاسم نے منجنیقوں کے ذریعے اس جھنڈے کو گرا دیا۔ گرتے جھنڈے کو دیکھ کر سپاہ نے خود ہی قلعے کے دروازے کھول دیے۔

(نواب زین العابدین الغفاری)

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

بالوں کی خشکی کو عام زبان میں سکری یا ڈینڈرف بھی کہتے ہیں۔ ڈینڈرف کا کوئی موسم نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک جلدی بیماری کی طرح حملہ کرتی ہے۔ بالوں میں خشکی کی سب سے عام علامت خارش اور بالوں میں سفید فلیکس کا پایا جانا ہے۔ خشکی بننے کی سب سے بڑی وجہ شیمپو کا بے جا استعمال، شیمپو میں پائے جانے والے کیمیکلز اور ذہنی دباؤ وغیرہ شامل ہیں۔ بالوں کو صاف نہ رکھنے سے بھی سر میں خشکی کی افزائش ہوتی ہے۔

انڈے کی زردی میں اینٹی ڈینڈرف خصوصیت موجود ہوتی ہے۔ انڈے کی زردی سر کی جلد پر لگانے سے خشکی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ انڈے کی زردی سر پر لگانے سے سر کی جلد کو پروٹین بھی فراہم ہوگی۔

لیموں میں قدرتی طور پر سٹرک ایسڈ پایا جاتا ہے جو سر سے خشکی کے ذرات کو نکالنے میں مدد کرتا ہے۔ خشکی سے نجات پانے کے لیے روئی کو لیموں کے رس میں بھگوئیں اور سر کی جلد پر جہاں جہاں خشکی ہے وہاں لگائیں۔ اس نسخے کو آزمانے سے سر کی خشکی ختم ہونے میں مدد ملے گی۔

ماہرین کے مطابق پیاز میں اینٹی فنگل خصوصیات پائی جاتی ہیں جو سر کی خشکی کو ختم کرتی ہیں۔ پیاز کے استعمال کے لیے سب سے پہلے پیاز کا رس نکالیں اور پھر اس رس کو سر کے اس حصے پر لگائیں جہاں خشکی اور فنگس کے ذرات موجود ہیں۔ اس نسخے سے جلد ہی خشکی سے نجات مل جائے گی۔

ایلو ویرا وٹامنز، پروٹین اور معدنیات کی خصوصیات سے مالا مال ہے اور اس میں اینٹی فنگل اور اینٹی بیکٹیریل کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ ایلو ویرا کی مدد سے سر کی خشکی کو ختم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خشکی والے حصوں پر ایلو ویرا جیل لگائیں اور کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں، پھر سر کو دھو لیں۔ اس ٹوٹکے کو آزمانے سے سر کی خشکی ختم ہو جائے گی۔

ناریل کا تیل سر کی خشکی ختم کرنے کا ایک موثر علاج ہے۔ ناریل کے تیل سے خشکی ختم کرنے کے لیے پہلے اپنے حساب سے ناریل کے تیل کی مقدار لے کر اس کو ہلکا سا گرم کر لیں اور پھر اس میں لیموں کا رس ملائیں۔ اس کے بعد اس تیل کو اپنے سر کی جلد پر لگائیں اور تھوڑی دیر تک مساج کریں۔ یہ عمل سر کی خشکی ختم کرنے میں مفید ہے۔

اسپرین ایسے کیمیکلز سے بھرپور دوا ہے جو بیشتر خشکی سے نجات دلانے والے شیمپو کا حصہ ہوتا ہے۔ اسپرین کی دو گولیوں کو پیس کر ان کا سفوف اس سفوف کو شیمپو میں ملا کر استعمال کریں۔ جلد کے لیے درکار ہو۔ اس کے بعد پھر دوبارہ سادہ شیمپو سے دو منٹ تک لگا رہنے دیں اور پھر دھو لیں۔ اس کے بعد پھر دوبارہ سادہ جلد کو دھو لیں۔ خشکی کے خاتمے کے لیے استعمال کے نتائج حیران کن ثابت ہوتے ہیں۔

آملہ بالوں کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ خشکی کی وجہ سے سر میں بہت زیادہ خارش ہوتی ہے۔ اس خارش سے نجات پانے کے لیے آملہ اپنے سر پر لگائیں اور اس سے بھی زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ بالوں کو شیمپو کے بجائے آملہ کا پاؤڈر بنالیں اور اس پاؤڈر سے سر کی جلد کو دھو لیں۔ اس نسخے کو آزمانے سے نہ صرف سر کی خشکی دور ہوگی بلکہ خشکی کی وجہ سے بال جھڑنے کا عمل بھی رک جائے گا۔

☆☆

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.